انداز بیاں اور

اُردو کے منفرد نثر نگار اطہر رضوی کی تخلیقات پر ناقدین اور اساتذہ کے تاثرات

ڈاکٹر ظلِ ہما

ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

انداز بیاں اور۔۔۔

ڈاکٹر ظلِ ہما　　ڈاکٹر ظلِ ہما

اندازِ بیان اور۔۔۔

اُردو ادب کے منفرد نثر نگار اطہر رضوی کی تخلیقات پر
اساتذہ و قارئین کے تاثرات

مرتب:
ڈاکٹر ظلِّ ہما

کتاب کا نام: اندازِ بیاں اور............

مرتبہ/ناشر : ڈاکٹر ظلِ ہما

اشاعت اول: 2009ء

مطبع : ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرس نئی دہلی۔2

کمپوزنگ : افراح کمپیوٹر سینٹر نئی دہلی۔25

تعداد : 500

قیمت : -/400 روپیہ

زیرِ اہتمام : ڈاکٹر شاہد حسین، نئی دہلی

Ph: 23272724 Mob: 9868572724

ISBN-13 978-93-80279-00-8

ملنے کے پتے:

Dr. Shahid Husain

SHAHID PUBLICATIONS

2253, RESHAM STREET, KUCHA CHELAN

DARYA GANJ, NEW DELHI-11002, INDIA

Ph:- 011-23272724 (M) 9868572724

E-mail: drshahidhusain_786@yahoo.co.in

ATHAR RAZVI

5164, HIDDEN VALLEY COURT

MISSISSAUGA, L5M 3P1-ONTARIO, CANADA

TEL: (905) 8267677 FAX (905) 826330

E-mail: razo1@rogers.com

انتسابُ

محترم ومکرم جناب شریفُ الحسن نقوی

کے

نام

جنہوں نے اُردو زبان و ادب کی ترقی

و توسیع میں تاریخ ساز خدمات انجام

دی ہیں۔

ظِلّ ہما

فہرست

عرض مرتب

ڈاکٹر ظلِ ہما

اطہر رضوی آج کی جانی پہچانی اور معروف ومتعارف ادبی شخصیات میں سے ہیں۔ ایک ادیب شاعر، نقاد اور محقق کی حیثیت سے اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ وہ مسی ساگا کینیڈا میں مقیم ہیں۔ اطہر رضوی اردو زبان وادب سے غیر معمولی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کی علمی وادبی زندگی کئی ابعاد اور جہتوں سے آراستہ ہے اس وسیلے سے وہ متعدد طرح نشستیں، کئی عالمی مشاعرے، مختلف شعراء کے ناموں سے وابستہ، ادبی شامیں اور سیمناروں کا انعقاد کر کے اردو زبان وادب کی سلسلہ ارتقاء سے وابستہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔

راقمہ کی اطہر رضوی سے پہلی ملاقات 1997ء کے دوران انڈیا انٹرنیشنل نئی دہلی میں منعقد ایک ادبی تقریب میں ہوئی۔ اس تقریب میں ہندوستانی اصحاب قلم اور زبان دانوں کے ماسوا پاکستان، برطانیہ، کینیڈا اور امریکہ کے اسکالرس بھی شریک ہوئے تھے اس تقریب میں، میں نے پہلی مرتبہ کینیڈا سے آئے ہوئے مہمان مصنف اطہر رضوی کو دیکھا، سنا اور تقریب کے اختتام پر ان سے ایک گونا تفصیلی گفتگو بھی کی۔

دوسرے دن وہ ہمارے گھر تشریف لائے۔ اس یادگار ملاقات کے موقعہ پر ڈاکٹر تنویر احمد علوی بھی موجود تھے۔ یہ ملاقات اپنے نتائج کے اعتبار سے بہت خوشگوار اور دیر اثر ثابت ہوئی کیونکہ کینیڈا واپسی کے بعد بھی انھوں نے غائبانہ ربط وضبط کا سلسلہ جاری رکھا اطہر رضوی نے 1999ء میں میر تقی میر عالمی سیمینار کا ٹورانٹو میں انعقاد کیا، جس میں انھوں نے ڈاکٹر تنویر احمد علوی،

ڈاکٹر شاہد حسین اور مجھے شمولیت کی دعوت دی۔ بعد ازاں وہ کئی مرتبہ ہندوستان آئے۔ شاہد صاحب نے ان کی تین تخلیقات شائع کیں۔ مجھے ان کی بہت اہم اور تاریخی تصانیف ''خدا کے منتخب بندے''، ''ہر ملک ملک ماست''، ''تاریخ کا سفر بلکینیا سے بازنیا تک'' اور ''کون عبث بدنام ہوا'' کے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ ان کی تصنیفات کی تقاریب اجرا، دہلی، لاہور، اسلام آباد، کراچی، ٹورانٹو اور برمنگھم میں منعقد ہوئیں۔ ''کون عبث بدنام ہوا'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے معروف شاعر اور ادیب افتخار عارف نے کہا:

''گذشتہ پچاس سال میں اردو میں اس سطح کی کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔''

مستند نقاد اور عظیم ادبی شخصیت شمس الرحمٰن فاروقی نے ''تاریخ کا سفر بلکلدیا سے بازنیا تک'' پڑھ کر اظہار خیال کرتے ہوئے تحریر کیا:

''آپ نے یہ کتاب لکھ کر اسلام اور امن عالم کے مقصود کو آگے بڑھانے کے سلسلے میں اہم خدمت انجام دی ہے۔''

۲۰۰۵ء میں دہلی میں ''اردو کی نئی بستیاں'' عالمی سیمینار منعقد ہوا، جس میں اطہر رضوی نے ایک معلومات افزاء مقالہ پڑھا، جس میں کینیڈا میں اردو زبان کی ترقی وترویج کی ایک مختصر تاریخ پیش کی گئی۔ اس مقالہ کو ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ''نگار'' میں فتح محمد ملک نے اسلام آباد کے ''قومی زبان'' میں اور ممبئی کے رسالے ''شاعر'' نے اپنی خاص اشاعتوں کے طور پر شائع کیا۔

اس طرح انفرادی سطح پر اطہر رضوی کی منفرد نگارشات کی پذیرائی یقیناً ہوئی، لیکن ادبی حلقوں میں جن قارئین نے ان کی تصنیفات پڑھی ہیں ان کا ایک متفقہ اور مشترکہ خیال ہے کہ ان کی تصنیفات اور خدمات کا کماحقہٗ اعتراف نہیں کیا گیا ہے جس کے وہ یقیناً مستحق ہیں۔ انھیں خصوصیات کے پیش نظر راقمہ کو اطہر رضوی کی زیر نظر کتاب مرتب کرنے کا خیال آیا، حضرت علی کا قول ہے کہ ''جو شخص توصیف کا مستحق ہے اس کی پذیرائی نہ کرنا، اس کے ساتھ زیادتی کے مترادف ہے۔''

اردو ادب کے ممتاز ادیب و محقق پروفیسر وہاب اشرفی نے اطہر رضوی سے متعلق تحریر کیا:

''افسوس ہے کہ اطہر رضوی پر ابھی بھی بہت کم لکھا گیا ہے۔ حالانکہ ان کی علمی، ادبی ثقافتی اور تہذیبی کارکردگی ایسی ہے کہ ذہین دماغوں کو ان کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔''

ہمارے دور کے مستند محقق اور ادیب ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے بھی اس ادبی احساس کو میری توجہ کا مرکز بنایا۔ وہ ایک موقع پر لکھتے ہیں:

''اطہر رضوی پر نتیجتاً کم لکھا گیا ہے ورنہ وہ مستحق تو اس بات کے بھی ہیں کہ ان کی شخصیت کے ذریعہ ہم مغربی اور مشرقی شعور کی خوش آمیزی اور ہم آہنگی کا مطالعہ کریں۔ اقبالؔ نے کہا تھا:

مشرق سے نہ انکار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

مشرق و مغرب کے اقرار میں ایسی شخصیات کا ایک اہم کردار ہوتا ہے جن کے شعور اور شخصیت میں ہم ان اقدار کو ہم رنگ و آہنگ محسوس کرتے ہیں۔ اطہر رضوی صاحب کی شخصیت ایک ایسی ہی شخصیت ہے۔''

اس پس منظر میں میں نے اطہر رضوی کی شخصیت، تصانیف اور خدمات پر برصغیر اور اردو دنیا کے صاحب علم و دانش افراد سے تاثرات حاصل کرنے اور انھیں ایک کتابی صورت میں پیش کرنے کا تہیہ کیا۔ بعض نگارشات اطہر رضوی صاحب نے فراہم کیں جو ان کی تصنیفات کے تقاریب اجراء پر اساتذہ نے پیش کی تھیں۔ باقی مضامین میری درخواست پر اساتذہ اور مشاہیر نے از راہ کرم مجھے بھجوادیے۔

مجھے امید ہے کہ ان گراں قدر تاثرات کی روشنی میں اطہر رضوی کی بہ حیثیت مصنف محقق، مؤرخ اور شاعر کے ایک منصفانہ تقدیم ہوگی!

اس کتاب کا نام ''انداز بیاں اور'' غالبؔ کے شعر سے اس لیے لیا ہے کہ اطہر رضوی کو غالبؔ سے بے انتہا شوق وشغف اور ادبی طور پر تعلق خاطر رہا ہے انھوں نے غالب اکاڈمی کا قیام ٹورانٹو میں کیا۔ ان کی رہائش گاہ کو ''غالب کدہ'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جہاں وہ گذشتہ چوبیس سال سے غالبؔ کی مصرعہ طرح میں مشاعرہ کراتے ہیں ان کے گھر کا ایک حصہ غالب کی تصاویر اور ان کی تالیفات نیز دوسرے اہم شعراء کی نگارشات وتصاویر سے مزین ہے اس طرح اردو تہذیب وتاریخ کی جھلک در و دیوار سے نمایاں ہوتی ہے۔ جب اطہر رضوی اردو بولتے ہیں تو انگریزی زبان کا ایک لفظ بھی استعمال نہیں کرتے۔ ان کی رہائش ٹورانٹو کے جس محلے میں ہے اس کا نام Hidden Valley ہے۔ لیکن وہ اسے ''پوشیدہ وادی'' لکھتے ہیں۔

اطہر رضوی اس پوشیدہ وادی میں اپنی جرمن نژاد شریک حیات ریٹا اور تین بچوں علی گوہر، انور اور نیلوفر کے ساتھ ایک خوش حال زندگی گزار رہے ہیں۔ اطہر رضوی کا تعلق ہندوستان کے تاریخی ومردم خیز شہر اورنگ آباد سے ہے اورنگ آباد ہماری ادبی لسانی اور تہذیبی تاریخ کا ایک اہم اور پرکشش حصہ رہا ہے۔ اطہر رضوی کو اورنگ آباد سے ایک خاص محبت ہے انھوں نے اسے اپنی یادوں کا تاج محل بتایا ہے۔ لکھتے ہیں:

''اورنگ آباد میری یادوں کا تاج محل ہے۔ میری طرح وحیدہ نسیم بھی اورنگ آباد کی شہرزاد تھیں۔ انھوں نے اپنی عقیدت سے لبریز تاریخی تصنیف ''اورنگ آباد'' کا آغاز ان اشعار سے کیا تھا:

یہی ہے ابتدا میری کتاب زندگانی کی
یہی ہے انتہا میرے قلم کی کامرانی کی
نسیم اس سرزمیں نے زلف ہستی کو سنوارا ہے
مجھے بھی ناز ہے میں نے یہاں بچپن گزارا ہے

"میرے قلم کی کامرانی کی انتہا" کے ماسوا باقی کے تینوں مصرعے میری اپنی زندگی کی صورت گری کرتے ہیں۔ اردو کے شعروادب، تہذیب وثقافت، فلسفے اور تصوف کی عظیم ترین شخصیات کی آبائی زمینوں کے تعلق سے جب بھی لکھا، کہا اور سوچا جاتا ہے تو دہلی، لکھنو، آگرہ، لاہور، بھوپال، ملیح آباد جیسے نام حافظے کے پردے پر اجاگر ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کی ابتداء دکن سے ہوئی۔ اردو زبان کے پہلے عظیم اور مستند شاعر ولی محمد (ولی دکنی) ۱۶۶۸ء میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ مہ لقابائی چندا نے اسی سرزمین پر جنم لیا۔ ولی اورنگ آبادی کے بعد دوسرا بڑا نام سراج اورنگ آبادی کا ہے جو ۱۷۱۶ء میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ اورنگ آباد کی سرزمین اولیا اور صوفیائے کرام کی دانش اور فضیلت کی بارش انوار سے صدیوں فیض یاب رہی۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اسلامی تاریخ کے عظیم محقق اور بانی جماعت اسلامی اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ مولوی عبدالحق نے اپنی اردو تحریک اورنگ آباد سے شروع کی۔

اورنگ آباد کی سطوت شیراز اور فردوسی کی آرام گاہ طوس جیسی نہیں ہے لیکن میری عقیدت اور پسند کی اچھی کتاب میں اس کا نام ہمیشہ سرفہرست ہے۔" (چہرے باتیں یادیں لوگ)

اطہر رضوی نے "یاد کے موتی"، نظم میں اورنگ آباد کے تاریخی پس منظر، عمارتوں اور ادبی اہمیت کی صورت گری اس طرح کی ہے:

جس کو اورنگ آباد کہیں سب
چار فصیلوں کے اندر ہے
کیسا عالی شان نگر ہے
نزد ہے عالمگیر کا مرقد
خلد آباد کی پاک زمیں پر
بھڑکل اور دہلی دروازہ

پن چکی ُشاہ گنج کی مسجد
رابعہ دورانی کا مرقد
تاج محل موجود ہے گویا
گل منڈی اور چوک کا منظر
شہر کا مرکز اور گھنٹہ گھر
تغلق کے شاہکار یہیں ہیں
ایلورہ کے غار یہیں ہیں
اور اجنتا کے بت جن کو
ساری دنیا دیکھنے آئے
اس بستی سے دور نہیں ہے
پوشیدہ تاریخ یہیں ہے
یہ وہ زمیں ہے جس کے اوپر
جنم لیا تھا استادوں نے
علم و ہنر کے شہزادوں نے
اردو زبان کا پہلا شاعر ولی تھا جس کا نام
اور پھر عبدالحق تھے یہاں کے
جو "بابائے اردو" بھی تھے
علامہ مودودی جیسی ہستی کا یہ شہر رہا
ایک صفی اورنگ آبادی اور سکندر وجد
شاعر ُاختر عروج، وحیدہ اور رحمان صدیقی
اور جنرل ایوب نے کاٹے

اس بستی میں کافی دن
ایسے لوگ اس شہر سے ابھرے
شہرت جن کے پیچھے بھاگے!!''

اس تاریخی شہر سے اطہر رضوی کی عقیدت و محبت کا اندازہ نظم کے مختلف کوائف و اشارات سے لگایا جاسکتا ہے۔

آباو اجداد: سلسلہ نسب کے اعتبار سے اطہر رضوی کا تعلق حضرت علی رضا امام سے ہے۔ حضرت علی رضا امام کی ذریعت سے ایک مجربنی نامی قبیلہ مشہد، سے نیشاپور اور پھر سندھ کے راستے سے ہندستان داخل ہونے سے پہلے فیض آباد پھر لکھنؤ جاکر آباد ہوا یہ مغل بادشاہ شاہجہاں کا دور تھا۔

خاندان: اطہر رضوی کے دادا کے ماموں خواجہ نواب حسین ۱۸۰۰ء کے اواخر میں لکھنؤ سے اورنگ آباد دکن آئے۔ انہوں نے بعد ازاں اطہر رضوی کے بڑے چچا سید علی حیدر اور ان کے بھائیوں سید علی مہدی، سید حسین (اطہر رضوی کے والد) سید سجاد حسین، سید علی بہادر، سید علی قدر کو یکے بعد دیگرے اورنگ آباد بلوایا۔ سید علی حیدر اورنگ آباد کے مشہور وکیل تھے۔ انہوں نے ککولال نامی ایک راجہ کی حویلی خریدی، جس میں سترہ کمرے تھے، انہوں نے اس کا نام ''حیدر منزل'' رکھا۔ اطہر رضوی نے ایک انٹرویو میں حیدر منزل اور وہاں کے ماحول کی تفصیلات بتاتے ہوئے بتایا:

''حیدر منزل قدیم شہر کی معروف بستی تھی۔ حیدر منزل کا بڑا دروازہ اتنا لحیم شحیم تھا کہ اس کو کھولنے اور بند کرنے میں توانائی درکار ہوتی تھی۔ ککولال راجہ کی بڑی حویلی میں ہمارے خاندان کے درجنوں افراد ایک ساتھ رہا کرتے تھے۔

ایک عشرہ قبل میں اورنگ آباد گیا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے روحانی تکلیف پہنچی کہ حیدر منزل مکمل طور پر نیست و نابود ہو چکی تھی۔

حیدر منزل کے سامنے سڑک کی دوسری جانب ایک برگد کا درخت تھا۔ جو حیدر منزل کی عظمت وجاہت اور اصابت کا ہم پلہ تھا۔ پیڑ کا تنا اتنا وسیع وبسیط تھا کہ گرمیوں اور بارش کے دوران ہر کس وناکس اس کی پناہ سے فیض یاب ہوتے تھے۔

میں نے اپنی نظم ''یاد کے موتی'' میں اورنگ آباد اور حیدر منزل کا ذکر کئی جگہ کیا تھا۔ وہ شب وروز وہ گھڑیاں، وہ لمحات جو میں نے اورنگ آباد اور حیدر منزل کے زیرِ سایہ گزارے وہ میری ساری زندگی کے خوبصورت ترین لمحات تھے۔

حیدر منزل، ایک حویلی سترہ کمرہ باون لوگ!
برگد کے سائے کے نیچے ساری خلقت آ بیٹھی ہے
''حیدر منزل'' خوب جگہ ہے
شہر کے اندر شہر بسا ہے
دکن کی انمول زمیں پر
لکھنؤی تہذیب کا گھر ہے،
حیدر منزل کا دروازہ
اونچا، بھاری اور تاریخی اس کو کھولو سامنے دیکھو
برگد کی چھاؤں کے نیچے
پل کی چھوٹی دیواروں پر
چھوٹا سا بازار لگا ہے
آم 'شریفے' جام کے ٹھیلے
کھٹے میٹھے ہیں گکروندے
جامن، کیلے، کمرخ، چیکو، موسمبی، شہتوت
مونگ کے پاپڑ، پٹی، چوڑا، ٹوکریاں بھرپور
حیدر منزل کے سب بچے اس کے ہیں اطراف''

اطہر رضوی کے والد کا نام سید حسین تھا۔ جب اطہر رضوی آٹھ سال کے تھے تو ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ پروفیسر آغا سروش لکھنوی جو ان کے داماد تھے۔ انھوں نے ایک شعر میں ان کی تاریخ رحلت نکالی۔ شعر ملاحظہ ہو۔

سروشؔ ان کی تاریخ رحلت جو پوچھے
تو حسرت سے کہہ دو قضا آ چکی تھی

اطہر رضوی کی والدہ فرخ بیگم تھیں۔ اطہر رضوی کی والدہ کی تربیت نے ان کے شعور وشخصیت کے خدوخال ابھارنے میں کلیدی رہنمائی کی۔ بقول اطہر رضوی ''میری زندگی کی محبوب ترین شخصیت میری والدہ تھیں یہ میری زندگی کا المیہ ہے کہ میری والدہ میری خوشیوں میں شریک نہیں ہو سکیں۔''

اطہر رضوی چار بھائی اور چار بہنیں تھیں اب صرف دو بڑی بہنیں اور اطہر رضوی حیات ہیں ان کے خاندان میں ماں بھائی اور بہنیں سب ایک دوسرے کے بہت قریب رہے۔ کیوں کہ والد کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا اس لیے اطہر رضوی کی تعلیم کا انتظام بھی ان کے بڑے بھائیوں ہی نے کیا۔

اطہر رضوی کی ولادت اور بچپن:

اورنگ آباد سے چالیس میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا شہر جالنہ ہے۔ اطہر رضوی کی پیدائش 16/اکتوبر 1934ء کو جالنہ اورنگ آباد میں ہوئی۔ وہیں انھوں نے مدرسہ کی ابتدائی تعلیم تحتانیہ حاصل کی۔ پھر ان کا خاندان اورنگ آباد منتقل ہو گیا۔ وہاں وہ ایک ''وسطانیہ'' اسکول کے طالب علم رہے۔ انٹر عثمانیہ کالج سے کیا۔ بھڑکل دروازے پر واقع عثمانیہ انٹر میڈیٹ کالج میں صدق جائسی، یعقوب علی اور محمد نعمان جیسے بہترین اساتذہ اور کالج کے پرنسپل میجر آفتاب تھے جن سے انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ اطہر رضوی نے اپنے ابتدائی زمانے کے بارے میں بتاتے ہوئے

ان امور کی طرف اشارے کیے ہیں کہ" اس زمانے میں اساتذہ کی حیثیت صد فی صد والدین جیسی ہوتی تھی۔ اساتذہ میں آدھے ہندو اور آدھے مسلمان ہوتے تھے۔ لیکن ان کی توقیر اور مرتبہ ایک ہوتا تھا۔ میں اور فرہاد زیدی ساتویں جماعت سے انٹر تک ہم جماعت رہے۔ ہم دونوں انتہائی "پڑھاکو" تھے۔ تقریباً نصف صدی قبل یو پی کے چند معزز خاندانوں نے اورنگ آباد میں اپنے گھر بسائے تھے۔ ان کی ذریت نے اپنے آباواجداد کی اقدار اور طرزِ معاشرت کو کماحقہٗ برقرار رکھا تھا۔ اس طرح وہاں ایک منفرد ذیلی تہذیب نے جنم لیا تھا جو دکن اور لکھنؤ کے مشترکہ وصائف و خصائل کا نمونہ تھا۔ نہ ہم ٹھیٹ حیدر آبادی یا دکنی تھے اور نہ لکھنوی۔ نہ ہم نے کبھی "ق" کو "خ" کہا اور نہ کبھی لکھنؤ والے چھوٹی موری کے پاجامے پہنے۔ شہر میں ہمارا ایک چھوٹا سا ادبی گروہ تھا جس کے سربراہ اختر الزماں ناصر تھے۔ حلقے کے باقی افراد میں عبدالرؤف عروج، عباس اخگر، فرہاد زیدی، وحید اختر اور میرے علاوہ کئی اور ادب دوست شامل تھے۔

پھر ہمارے چھوٹے سے گروہ نے اختر صاحب کی نظامت میں اورنگ آباد میں "یوم اقبال" کی تقریب کا انعقاد کیا اور اس میں بمبئی سے علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی شریک ہونے کے لیے آئے تھے۔ ان کے علاوہ حیدر آباد سے میکش جلیس اور سکندر علی وجد شرکت کے لیے پہنچے تھے۔

اورنگ آباد دراصل ایک انمول بستی تھا۔ آدھا شہر اور آدھا قصبہ، وہاں ریڈیو اسٹیشن اور دو کالج تھے، شعر و ادب کے شیدائی موجود تھے۔ تاریخی عمارات تھیں، شہری نفاست اور امارت کی سوغاتیں تھیں۔ اور پھر شہر کے اطراف فصیلیں تھیں، بارش کے زمانے میں پہاڑیوں سے آبشار گرتے تھے۔ شہر سے باہر قصبوں جیسی کیفیت تھی۔ اس کی اپنی ایک تاریخی، تہذیبی شناخت تھی، شہر میں چند نوجوانوں کی ایک چھوٹی سی ادبی انجمن تھی۔ آئے دن مشاعرے اور بیت بازی کے مقابلے ہوتے تھے۔"

اطہر رضوی نے اورنگ آباد کے جس گھرانے میں ہوش سنبھالا وہاں ان کے خاندان میں ان کے بڑے چچا سید علی حیدر کے علاوہ سارے مردوں نے گتہ داری اور ٹھیکہ داری کی۔

اس زمانے میں پہلے نام اور خاندانی، شناختی نام رکھنے کا دستور یا رواج نہیں تھا۔ ان کے بڑے بھائی اظہر حسین نے جب وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ گئے تو اپنا نام سید محمد اظہر حسین کو چھوٹا کر کے اظہر رضوی کر دیا۔ بعد ازاں اطہر رضوی نے ان کی پیروی کی۔ ان کے خاندان میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بہت کم تھے۔ ان کے بڑے بھائی اظہر رضوی خاندان کے پہلے فرد تھے جنھوں نے علی گڑھ سے بی اے اور ایم اے کیا۔

اطہر رضوی کے خالو مفتی سید احمد علی قبلہ، مجتہد اور شیعہ فقہ کے عظیم عالم، خاندان کے واحد عالمی شہرت یافتہ شخصیت تھے۔ وہ لکھنؤ کے مدرسہ ناظمیہ کے پرنسپل تھے ان سے مذہبی اور دینی مسائل میں علمی رہنمائی اور فیصلہ دہی کی درخواست کی جاتی تھی۔ ان کے خاندان کی دوسری تعلیم یافتہ شخصیت پروفیسر آغا سروش لکھنوی (جو ان کے بہنوئی تھے) کی تھی۔ وہ بی اے بی ٹی تھے وہ تاریخ اور موسمیات کے ماہر تصور کیے جاتے تھے۔ اپنے وقت کے نامور شاعر تھے۔

اطہر رضوی کی بڑی بہن صاحبزادی بیگم اورنگ آباد ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھتی تھیں، ان کی اپنی چھوٹی سی لائبریری تھی۔ اطہر رضوی نے چھپ چھپا کر کرشن چندر، عزیز احمد، راجندر سنگھ بیدی، پریم چند، منٹو اور عصمت کے افسانے اسی لائبریری سے پڑھتے تھے۔ اطہر رضوی کی ادبی دلچسپیوں کا آغاز ان کی ابتدائی عمر میں ہو چکا تھا۔

ادبی ماحول:

اطہر رضوی نجیب الطرفین ہیں۔ خاندانی شرافت اخلاقیات اور پندار کی شدت انھیں ورثے میں ملی ہے۔ باقی جو کچھ ہے بقول ان کے قطعاً اکتسابی ہے۔ ان کے گھر کا ماحول ثقافتی اور مذہبی محرکات سے وابستہ تھا تاہم اکثر افراد خصوصاً ان کی دو بڑی بہنوں اور بڑے بھائی کو شعر و ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ ان کے بڑے بھائی خاندان کے پہلے فرد تھے جنھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے تقسیم سے پہلے محمد علی جناح سے اجازت لے کر حیدر آباد (دکن) سے روزنامہ "جناح"

کی اشاعت کا آغاز کیا۔ جناح اخبار کا کئی سالوں تک دکن کے اہم اور نامور اخباروں میں شمار ہوتا رہا۔ بعدازاں وہ حیدرآباد سے کراچی چلے گئے اور آدم جی کالج میں اردو کی پروفیسر ہو گئے۔

اطہر رضوی کی دوسری بہن ایک غیر معمولی شخصیت کی حامل ہیں۔ انہیں بچپن سے اردو پڑھنے اور لکھنے کا شوق تھا۔ اگرچہ ان کی تعلیم تحتانیہ مدرسے تک محدود تھی اور انہوں نے مضامین اور کہانیاں اس زمانے کے بنات، خاتون مشرق اور پھول، وغیرہ پڑھ پڑھ کر لکھنا سیکھیں۔ تاہم ان کے افسانوی مضامین اور کہانیوں میں حیدر منزل کی تاریخی داستان، لکھنو اور دکن کی مشترکہ سوغاتیں، اگلے وقتوں کی شرافتوں کا لٹا لہجہ پاکستان کے خاندانی شرفاء کے اقدار، ماں، باپ، لڑکی، بیوی، بہو اور مشترکہ گھرانوں کے مسائل اور مصائب کا جائزہ اتنی مہارت اور باریک بینی سے کیا ہے کہ ان کی بعض کہانیوں اور ناولوں (ایک لڑکی، ہزار غم یہ قربتیں یہ فاصلے) کا شمار اردو کے منفرد نثری ادب میں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن انھیں شاذ ہی کچھ لوگ جانتے اور پہچانتے ہیں۔ اگر چہ ان کی کہانیاں کراچی کے ''جنگ'' اور ''اخبار خواتین'' میں دو تین عشروں سے شائع ہو رہی ہیں۔ لیکن پاکستان میں نہ ان کا کوئی سرپرست تھا نہ وہ کسی لابی سے ملحق رہیں اور نہ ہی انھیں خودنمائی کا فن آتا ہے دوسرے یہ کہ شاذ ہی کبھی ادبی مجلس میں شرکت کرتی ہیں۔

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ اطہر رضوی کے گھر کا کسی حد تک ادبی ماحول اور شہر کی ادبی انجمن اور ان کی کارروائیوں نے اُن کی فکر اور سوچنے کی صلاحیتوں پر یقیناً ایک محرکہ پیدا کیا۔ لیکن علم و دانش، تجسس اور تفکر تحقیق و تاریخ یا شعر و ادب کی اقلیم میں داخل ہونے کی راہیں کسی نے نہیں دکھائیں۔ وہ ان کی اکتسابی کوشش کا نتیجہ ہیں۔

اطہر رضوی نے اپنے خاندان کے تہذیب و دستور کے بارے میں لکھا ہے:

''ہمارا سارا خاندان انتہائی پابند نظم وضبط (Regimental) تھا۔ آداب کی پابندی اصول دین کی پاسداری جیسی تھی۔ بڑوں کی تکریم، چھوٹوں کا لحاظ، ایک دوسرے کی مدد، روزہ نماز کی پابندی، گھر سے باہر نکلنے کی ممانعت، مناسب لباس پہننے کی ہدایت، گھر پر دوستوں سے ملاقات

کرنے کی اجازت — ہر شخص کو اپنے اقدام کی فصیلوں اور اعمال کے حدود کا علم تھا۔

اب میں جب سوچتا ہوں تو مجھے اپنے حافظے پر یقین نہیں آتا ہے کہ میرے ماحول کی پروردہ ذہنی تربیت نے مجھ پر کیا اثر چھوڑا ہے۔ ہمارے ماحول میں بزرگوں اور چھوٹوں کے درمیان ایک غیر مرئی دیوار سی حائل تھی۔ بڑوں کی گفتگو میں چھوٹے مداخلت نہیں کر سکتے تھے۔ بڑوں کی موجودگی میں چھوٹے قہقہے نہیں لگا سکتے تھے۔ عید کے دن کے ماسوا کوئی کم عمر پان نہیں کھا سکتا تھا۔ بغیر اجازت کے کوئی چوک یا صدر نہیں جا سکتا تھا۔ بغیر شیروانی پہنے کوئی اسکول نہیں جاتا تھا۔ سارے طلبا ترکی ٹوپی پہن کر اسکول آتے تھے۔

حیدر منزل میں سب ملا کر چھوٹے بڑے پندرہ لڑکے اور آٹھ لڑکیاں تھیں۔

ایک چھت تلے کئی گھرانے تھے، سب کے دستر خوان الگ الگ ہوتے تھے۔ لیکن عید اور محرم میں خاندان کی یک جہتی اور بڑائی کا مظاہرہ ہوتا تھا۔

خوشیوں اور آرام میں ہم نے
عید پہ اور رمضان میں ہم نے
عاشورے کی شام میں ہم نے
یادوں کی میزان میں ہم نے
جب بھی اس بستی کو تولا
اس کو سب سے بھاری پایا"

ان سطور سے ہم اطہر رضوی کے خاندان، ماحول، تہذیبی روایت اور تمدنی طریقہ رسائی کا پتہ چلا سکتے ہیں اور اس دور کے خاندانی ماحول اور اس سے وابستہ شرافتوں کا کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں۔

پاکستان ہجرت:

اطہر رضوی کا خاندان 1951ء میں پاکستان چلا گیا۔ کراچی پہنچ کر، وہاں جو زندگی انھوں نے گزاری اس کی یادوں کے نقوش ان کی تحریروں اور سلسلۂ فکر و خیال میں جھلکتے ہیں اور ان کے پڑھنے والے کی توجہ کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے۔ ''کنکولال کی حویلی سے آرام باغ کے دو کمروں کے فلیٹ میں منتقل ہونا ایک آزمائش کا دور تھا۔

دو کمروں کی ایک کللکیا رہتے ہیں دس لوگ
اماں، بہن، بھائی، بھابھی، بچے اور صندوق
ہم کو پکارے
کوئی مٹروا، کوئی مہاجر
ملیر اور ہندوستانی
ہم تو یہ سمجھے تھے سارے باشی ہوں گے پاکستانی
سوچیں ہم اندھیر ہے کیسی
دیس میں ہم کہلائیں بدیسی
سنی، شیعہ، آغا خانی، مرزا اور پٹھان
کلکتہ، دلی اور شملہ، بمبئی اور موہان
سری نگر سے راس کماری کی حد تک وہ جہاں جہاں تھے
دین محمد کے متوالے، بوڑھے بچے اور جواں تھے
سب نے مل کر ملک پاکستان بنایا؟
قائد اعظم نہ پنجابی، نہ بنگالی نہ پٹھان

نہ محمود آباد کے راجہ، شاہ دکن اور آغا خان
کس سے پوچھیں، کون بتائے
ہم اب ہندوستانی کیسے؟
پاک دیس کے شودر مسلم؟
سوچوں میں اندھیر ہے کیسی'' (یاد کے موتی)

اطہر رضوی نے اعلیٰ تعلیم کراچی میں حاصل کی۔ ایس ایم کالج سے بی اے اور سندھ یونیورسٹی سے سیاسیات میں ایم اے کیا۔ انھوں نے ایک موقعہ پر مجھے بتایا کہ

''کراچی کے ایس ایم کالج میں گزارے ہوئے تین سال دراصل بڑے خوشگوار تھے۔ کالج میں بہ حیثیت اردو سوسائٹی کے سیکریٹری میں نے مباحثے کروائے، بابائے اردو سے تقریر کروائی۔ سنجیدگی سے شاعری اور نثر نگاری کرنے کا ارادہ کیا، ترقی پسند ادب کے مصنفین کے جلسوں میں شرکت کی۔''

کالج کے زمانے کے ان کے ساتھی عطاء اللہ، علیم فاروقی تھے۔ اتوار کی شام کو حلقہ ارباب ذوق کی ادبی نشست ہوتی تھی۔ ان مجلسوں میں الطاف گوہر، ممتاز حسن، رفیق خاور، شوکت صدیقی، حبیب حالب اور جمیل الدین عالی سے ملاقات ہوئی۔ لیکن کراچی میں خوشحالی کی ذہنی طمانیت سے محروم رہے اور ایم اے کرنے کے بعد انھوں نے لندن کا رخ کیا اور ستمبر 1957 میں لندن چلے گئے۔ لندن میں گزارے گئے بارہ سال اطہر رضوی کی شخصیت کی اپج کا ایک اہم ترین حصہ ہیں۔ یہاں انھوں نے مطالعہ بھی کیا تبادلۂ خیال بھی اور شہری زندگی کی بدلتی ہوئی جہتوں کا مشاہدہ بھی ان کی شخصیت اور شعور کا ایک روشن نقطہ بنی اور ان کے لیے ایک رہنما روشنی ثابت ہوئی۔ انھوں نے اپنی ایک مشاہداتی اور فکری مطالعہ پر مشتمل نظم میں لندن جیسے شہر کے بارے میں اپنے تصورات اور تاثرات کا اظہار کیا ہے۔

لندن اک گمبھیر نگر ہے

ساری دنیا کے انسانوں کا یہ اک چڑیا گھر ہے
دانشور، سیاح، مصور، شاعر اور فن کار
حکمت اور منطق کے ماہر تاجر موسیقار
اور سیاست دان جہاں کے سچے اور عیار
بستی بستی کے باشندے آئے یہاں اک بار
دنیا بھر کے شہروں کی یہ کہلائے ناک
جس نے لندن نہ دیکھا وہ ٹھیرا بے ادراک
مارکس کا مرقد، لینن کا گھر، اینگلز کے دن رات
بعض جلاوطنی میں آئے، بعض گزیدہ حالات
ہو چی من اور موہن گاندھی جناح اور چارلس ڈیگال
سب نے محرومی میں کاٹے لندن میں کچھ سال
تاریخی اور فرسودہ لندن
کہنہ اور موجودہ لندن
افرنگی اقوام کا رہبر
انگریزی تہذیب کا محور
ماضی کی تکریم بڑی ہے
ہر گوشہ تاریخ کھڑی ہے
رسموں سے بھرپور جگہ ہے
مخلوط اضداد فضا ہے
صبح ہے موسم، شام ہے موسم
شہر کا دوسرا نام ہے موسم

آزادیٔ فکر یہاں ہے
خوشحالی جسم عیاں ہے
سر پر بولر ہاتھ میں چھتری بغل میں ٹیلی گراف
چلتے ہیں یوں اکڑائے جیسے ہوں ژراف
طبقہ بندی، بڑھیا، گھٹیا لندن کی مشہور
مسکن، مکتب، صحبت، لہجے، پیشے اور دستور
ایک طرف ہے شاہی کنبہ اور ہیں منصب دار
ان کے ہیں محلات، زمینیں، دولت کا انبار
لارڈ و لیڈی، ڈیم اور سر ہوں جیسے سب اوتار
لقب چہیتوں کو ملنا ہے
چاہے وہ ہوں یا نہ ہوں اس عزت کے حقدار
اکثریت کے باقی شہری مجہول و مجبور
ماضی کی عظمت کے نشے میں اب تک ہیں مخمور
بورژوا تہذیب کا اک شہکار ہے لندن
مغرب کی اقدار کا اک معیار ہے لندن" (یاد کے موتی)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لندن جانے والے ان مختلف مسافرانِ لندن نے اس بڑے شہر کو کس طرح دیکھا اور اس کے تاثرات اور نئی زندگی سے متعلق اہلِ شہر کے تصورات کا کس طرح مشاہدہ کیا۔

لندن ہی میں اطہر رضوی کی ملاقات ریٹا سے ہوئی جو ایک جرمن نژاد خاتون ہیں۔ اور 1961ء میں انھوں نے ان سے شادی کرلی۔ لندن میں اطہر رضوی برٹش ریلویز میں کام کرتے تھے۔ ساتھ ہی انھوں نے اکاؤنٹنگ اور جرنلزم کا کورس بھی کیا۔ اس نوکری سے انھیں

یہ فائدہ ہوا کہ دنیا جہاں میں پھرنے کے لئے مفت پاس ملتے تھے۔ اسی وسیلے سے انھوں نے جیسے پوری دنیا دیکھ لی اور نئے افکار و نظریات کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا۔ لکھتے ہیں۔

لندن رہ کر جیسے عالم دیکھ لیا ہے
عشق سیاحت سے جیسے اب ہم نے کیا ہے
کیوں آئے تھے لندن، اب ہم بھول چکے ہیں
عمر کی زریں دور کے سال کچھ ایسے کٹے ہیں
پیرس، برلن، روم جنیوا، وینس اور میلان
بارسیلونا، لزبن، کوپن ہیگن اور تہران
استنبول، شیراز، بخارا، ماسکو اور بینک کاک
آکاپلکو، ریو، ہوائی، واشنگٹن، نیویارک
قاہرہ اور کوساڈاشی، ہلسنکی، نیویارک
بیروت و دمشق سمرقند، قم اور نیشاپور
مشہد اور تبریز و جدہ، مکہ اور مدینہ
ٹوکیو، اتھینز، بخاریسٹ، پشکن اور غرناطہ
(کتنے شہر تھے دیکھے ہم نے کوئی نہیں اندازہ)
ویاوینٹو روم کے حسن کی ایک جھلک ہے
شانزے لیزا دنیا کی انمول سڑک ہے
استنبول میں یورپ ایشیا بنتے دیکھا
مغرب میں ہے جگ مگ جگ مگ کرتا برلن
اور پھر اک دیوار کے پیچھے مرتا برلن
مغرب کے اور روس کے دعووں

اور حقیقت کا یہ سنگم

ریشاغ، کے کھنڈر ہیں باقی

جرمن قوم کے عزم بقا کی شہرت اب بھی ہے آفاقی! (یاد کے موتی)

اس نظم میں انھوں نے اپنا مشاہداتی تصویر کدہ بھی پیش کیا ہے اور اپنے تاثرات کو بھی جیتے جاگتے انداز میں صفحۂ قرطاس کی زینت بنایا ہے۔

اطہر رضوی کے لندن سے متعلق یہ فقرے ان کے ذاتی تاثرات کی گہرائیوں کو معنی آفریں انداز پیش کرتے ہیں جو انھوں نے ایک موقع پر بتائے تھے۔

''ذہنی پرورش'' فکری بالیدگی اور شخصیت کی بلندی حاصل کرنے کے لیے دنیا جہاں میں لندن سے بہتر کوئی اور درس گاہ نہیں ہے۔ میں نے اب تک جو کچھ سیکھا ہے، جو صلاحیتیں پیدا کی ہیں، جو نظریات قائم کیے ہیں وہ میرے لندن کے بارہ سال کے قیام کی دین ہے۔ ایک قابل ذکر بات، میں نے لندن سے جرنلزم کی ڈگری حاصل کی۔ اگر میں لندن نہ جاتا تو شاید مجھے اسپین جا کر اندلس کی تہذیب کی سوغاتیں دیکھنے کا موقع نہ ملتا۔ قرطبہ کی عظیم مسجد میں نماز پڑھنے کا شرف حاصل نہیں ہوتا۔ غرناطہ کے حسن اور الحمرا کے جادو کا مظاہرہ نہ دیکھ پاتا اور نتیجتاً اسلام کی گم شدہ عظمت کو تلاش کرنے کی جستجو نہ پیدا ہوتی۔ اور پھر ''ہر ملک ملک ماست'' اور ''تاریخ کا سفر'' جیسی تصنیفات قلم بند نہ کر پاتا۔

لندن کے ''دور تربیت'' میں میں نے فلسطین کا سانحہ اور صیہونیت کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا۔ ان محرکات کی بدولت میں نے ''خدا کے منتخب بندے'' تصنیف کی۔

اسے میں اپنی بدقسمتی سمجھتا ہوں کہ لندن کے قیام کے دوران میں اپنی مادری، چہیتی زبان سے تقریباً بے تعلق سا رہا، اس طرح میں مابعد تقسیم، لندن پہنچنے کے بعد تقریباً دو عشرے اردو کی نثری اور شعری تخلیقات سے ایک طرح سے بے بہرہ رہا۔''

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اطہر رضوی نے مغرب کے اس شہر کی فضا اس کے ماحول

اور آبادی کے افکار و نظریات سے کیا کچھ تاثر لیا۔ اور کن تصورات کے مشاہدے اور ذہنی مطالعے سے ان کو گزرنے کا اتفاق ہوتا رہا۔ اس کے بعد اطہر رضوی اپنی بیوی ریٹا اور دو سالہ بیٹے علی گوہر کے ساتھ 1968 میں کناڈا چلے گئے۔ جس کا ذکر انھوں نے اپنی نظم میں اس طرح کیا ہے۔

''تیسری ہجرت ہم کرتے ہیں
شہر ٹورانٹو کے دامن میں جابستے ہیں
ہم نے سوچا
شاید کہ نروان کے اور بھی رستے ہیں؟
چھوڑے ہیں آفاق یہاں کے برفیلے ہیں موسم
ساری دنیا کے باشندوں کا ہے یہ اب سنگم
رنگ برنگی تہذیبیں ہیں اور نسلیں لاتعداد
گورے، کالے، بھورے، پیلے، سب ہیں یکساں آدم زاد
کوئی پرانا اور کوئی نیا ہے سب ہی تو آباد
جنت جان کے جو آیا ہو وہ ہی شاید ہو ناشاد
کون ہے اصلی باشی یہاں اور کون بدیسی شہری ہے
ایسی طبقہ بندی کی حجت یہاں لگے بیکار
سب ہیں ہجرت کر کے آئے سب ہیں عزت دار'' (یاد کے موتی)

یہ نظم اگرچہ ایک آزاد نظم کا انداز رکھتی ہے لیکن اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے اصحابِ قلم اور اہلِ نظر مغرب کے اس عظیم شہر سے اس کی تہذیبی فضا اور شہری ماحول سے کس طرح متاثر ہوتے رہے ہیں۔ یعنی فکری فنی تہذیبی اور تاریخی تاثرات اخذ کرتے رہے ہیں۔

اطہر رضوی کنیڈا میں پہلے ایک فرم میں منیجر رہے۔ بعد میں انھوں نے انشورینس کا کام شروع کیا۔ جس میں 25 سال نہایت کامیابی سے گزارے ان کے دوسرے بیٹے انور اور

بٹی نیلوفر کی پیدائش کنیڈا میں ہوئی۔ گوہر کی بیوی پاکستانی ہیں۔ ان کے بچے جعفر اور علیشا ہیں انور اور نیلوفر کی شادی کنیڈا میں ہوئی ہے نیلوفر کے بیٹے کا نام ہارون (Aaron) ہے۔

اطہر رضوی کا لندن میں رہتے ہوئے ایک عشرے سے زیادہ تک اردو سے رشتہ نہیں رہا اس کو کناڈا آ کر پورا کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''جب میں ٹورانٹو پہنچا تو وہاں اردو کے منفرد افسانہ نگار اور عظیم شخصیت عزیز احمد سے ملاقات ہوئی۔ بد قسمتی سے عزیز احمد کینسر کے مہلک موذی مرض کا شکار ہو چکے تھے۔ ان سے میری ملاقاتوں کا سلسلہ محدود رہا۔ کچھ ہی عرصے بعد وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد ٹورانٹو میں اردو تحریک کے یکے از پیشوا کبیر قریشی نے پہلا بین الاقوامی مشاعرہ کروایا۔ جس میں ہندوستان کے بڑے اور مقبول شعراء کو بلوایا گیا تھا۔ اس مشاعرے نے میرے شعور میں چھپے ہوئے جمالیاتی سوتوں میں پہلے ایک ارتعاش اور پھر احتراک کی کیفیت پیدا کر دی۔ مشاعرہ ہماری ثقافتی جمالیات اور لسانی سوغاتوں کا تاج محل ہے! اور یہ تاج محل دنیا کی کسی زبان کی عجائبات میں نہیں ہے۔ اس مشاعرے میں ہندوستان سے سردار جعفری، کیفی اعظمی، بیکل اُتساہی، واجدہ تبسم، مینا قاضی، عزیز قیسی شرکت کے لیے آئے تھے۔ لیکن مشاعرے میں پاکستان کا کوئی شاعر نہیں تھا۔

اس خلش نے میرے ذہن میں ایک تحریک پیدا کی۔ پاکستان کے عظیم المرتبت شعرا کا پہلی مرتبہ شمالی امریکا کا دورہ کروایا جائے۔ یہ خیال پہلے ایک منصوبے پھر ایک دیوانگی کی طرح میرے اعصاب پہ چھا گیا۔ میں کراچی پہنچا اور وہاں حمایت علی شاعر سے مل کر جو اس وقت تک انتہائی متحرک شاعر بن چکے تھے، شعرا کی ایک فہرست مرتب کی جنھیں اس بین الاقوامی مشاعرے میں شمولیت کی دعوت دی جاتی، سرفہرست جمیل الدین عالی تھے۔ یہ پاکستانی شعرو ادب کا ایک تاریخ ساز واقعہ تھا۔

اطہر رضوی نے یاد کے موتی نظم میں اس کا ذکر بڑے خوبصورت پیرائے میں کیا ہے۔

''جب سے اس پر امن زمیں پر ہم آئے ہیں
شعروسخن اور ذوق ادب کی ایک لگن جو بچپن سے تھی

اس میں پھر سے جولانی سی اب آئی ہے
اپنی زباں اور شعروادب سے
ہم نے اب تجدید عقیدت اور اس کے اظہار کا پھر سے
عزم کیا ہے
عالی، شاعر، صہبا اختر اور قتیل شفائی
شاہ ظرافت جو کہلائیں وہ ہی ایک ضمیر
پنڈی کی پروین فنا کو جو ہیں خوش آواز
پاکستان کے اعلیٰ شاعر
پہلی بار ہوں ملک سے باہر
کینیڈا اور امریکہ کا دورہ کرنے
شعر سنانے
روحوں کو گرمی پہنچانے
چھوڑے وطن کی یاد کو تازہ
اور عقیدت کے دیپک کو روشن کرنے
شہر ٹورانٹو آئے ہیں
سترہ شہروں میں محفل کی
ہم نے ان کو دعوت دی ہے
یاد کے موتی چن لیتا ہوں
ٹورانٹو کے سارے مصنف' شاعر' ناقد اور ادیب
سب نے مل کر بنوائی ہے ''فورم'' نام کی اک تنظیم
(فورم نے ہے مجھ کو نوازا صدر کے عہدے سے دوبار......)''

اطہر رضوی نے گذشتہ ۲۵، ۳۰ سالوں میں بین الاقوامی مشاعرے، سیمینار، ادبی مذاکرے، غالب اکیڈمی کا استقرار، سالانہ بیادِ غالب مشاعروں کا رواج اور پانچ چھ اہم تحقیقی، تاریخی تصانیف، چار تالیفات اور ایک شعری مجموعہ قارئین کو پیش کیا۔ انھوں نے مغربی ادب کے شاہکار حتی الامکان انگریزی میں پڑھے۔ روسی مصنفوں اور شعرا پر تحقیقی مضامین لکھے۔ اطہر رضوی کے پسندیدہ شاعروں میں غالب، میر، ناصر کاظمی، جون ایلیا، پروین شاکر اور عشرت آفریں کے نمایاں نام ہیں۔ نثر میں قرۃ العین حیدر، عزیز احمد، منٹو کے تقریباً ساری نگارشات انھوں نے پڑھی ہیں۔ گذشتہ نصف صدی کے تقریباً تمام اساتذہ مشاہیر، مصنفین اور شعراسے (جوش صاحب کو چھوڑ کر) اطہر رضوی کا رابطہ رہا ہے۔

ان کی پسندیدہ شخصیات علی سردار جعفری، حقی صاحب اور محسن احسان ہیں، اطہر رضوی کی نظر میں گوپی چند نارنگ اور فرمان فتح پوری اردو زبان کے عظیم ترین مقررین ہیں۔ ستیہ پال آنند ان کے قریبی دوست ہیں۔

اطہر رضوی کا ذہن مطالعے، مشاہدے، نظریے اور سیر وسفر کی بدولت ایک خاص انداز سے تشکیل پا چکا ہے جس میں بے باکی، حوصلہ بندی اور حقائق تک رسائی کا غیر معمولی شغف پایا جاتا ہے۔ اسی لیے وہ محفلوں میں نیز اپنی تحریروں میں سوالات اٹھاتے ہیں۔ خود بھی سوچتے ہیں اور دوسروں کو بھی سوچنے پر مائل کرتے ہیں۔

شخصیت:

انسانی شخصیت بیشتر پر اسرار اور پیچیدہ پہلو داریوں کا مجموعہ ہے۔ اس کی تفہیم آسان نہیں۔ شخصیت کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ خارجی اور باطنی، خارجی پہلو کے ذیل میں خدوخال، قدوقامت، نقش ونگار، جسامت ورنگ وغیرہ آتے ہیں۔

شخصیت ایک ایسا عقدہ ہے جس کو حل کرنا آسان نہیں پھر مختلف انسانوں کی شخصیت بھی مختلف ومنفرد ہوتی ہے۔ بے جان مادی اشیاء کی طرح یکساں ومماثل خصوصیات کی حامل نہیں

ہوتی، اس میں انفرادیت، تنوع اور رنگارنگی پائی جاتی ہے۔

اطہر رضوی ایک حق گو اور بے باک انسان ہیں وہ مصلحتوں سے کام نہیں لیتے۔ ان کی شرافت، خلوص، مہمان نوازی، انسانی ہمدردی، کشادہ قلبی و وسعت فکری، پورے بنی نوع انسان کے لیے جذبۂ اخلاص و ہمدردی رکھنے والی شخصیت ہے۔

حلیہ:

اطہر رضوی کی رنگت گوری، دراز قد، متناسب جسم، کشادہ پیشانی چمکتی ہوئی کرنجی آنکھیں، مناسب ہونٹ دہانہ کشادہ، مونچھیں اور داڑھی منڈی ہوئی (Clean shave) کتابی چہرہ، کھنکتی ہوئی مردانہ آواز، لہجہ دھیمہ ہمہ وقت چہرے پر مسکراتی ہوئی مسکراہٹ غرض ان کی شخصیت میں بڑی دلکشی و رعنائی ہے۔

لباس:

اطہر رضوی شائستہ و نفاست پسند ہیں۔ مزاج کی نفاست ان کے لباس سے بھی جھلکتی ہے وہ مشرقی و مغربی دونوں طرح کے لباس نہایت نفاست و شائستگی سے زیب تن کرتے ہیں۔ وہ سوٹ، سفاری، شرٹ، پتلون اور کرتا پاجامہ پہنتے ہیں۔ ادبی جلسوں میں موقع و محل کا خاص خیال رکھتے ہیں اور اسی مناسبت سے لباس زیب تن کرتے ہیں مشاعرے میں پاجامہ کرتا اور جیکٹ پہنتے ہیں۔

نرم گفتار:

اطہر رضوی کھلی ہوئی آواز مگر دھیمہ لہجے میں بات کرتے ہیں خوش گفتار اور سنجیدہ مزاج کے مالک ہیں۔ ان کی باتوں میں طنز کا ہلکا سا عنصر بھی شامل نظر آتا ہے۔ ان کے دوستوں میں ہندو مسلم سکھ عیسائی ہر مذہب کے ماننے والے شامل ہیں۔ وہ سبھی سے محبت کرتے ہیں۔ ان کے مزاج میں انتہائی متانت نرمی اور سنجیدگی ہے۔

وہ ایک نڈر انسان ہیں لگی لپٹی بات کرنا نہیں جانتے۔ صاف گوئی ان کی عادت میں شامل ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان پہلو داریوں کے ساتھ ان کے ادبی مزاج اور انسانی فطرت

میں مصلحت پسندی شریک نہیں۔

اطہر رضوی نے ایک موقع پر اپنے مزاج کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"میں اپنے مزاج کے کھرے پن" کی وجہ سے بیک وقت مقبول اور بدنام ہوں۔ سحر انصاری نے مجھے کھرا کھرا کہا ہے۔ تاہم میں اسلوب، مزاج، نہج اور فکر کی راہوں کو بدلنے یا مصلحتاً خوشگوار بنانا نہیں جانتا۔"

لیکن اس کے باوجود اطہر رضوی میں معاف کر دینے کا جوہر بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کو سمندر کی لہروں کی طرح جس شدت اور تیزی سے غصہ آتا ہے پھر اسی طرح نرمی اور نیک طبیعتی کے ساتھ اتر بھی جاتا ہے۔ اطہر رضوی کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ہر شناسا اور ہم مزاج شخص کے یہاں جاتے اور اس کے دکھ سکھ میں شریک رہتے ہیں۔

ایک خوبی اطہر رضوی صاحب کی یہ بھی ہے کہ ہر جاننے والے مسلمان اور غیر مسلمان کی موت پر نماز جنازہ میں شرکت کرتے ہیں۔ یا پُرسے کے لیے اس کے گھر جاتے ہیں۔ یہ باتیں ان کی عالی ظرفی وملنساری اور بلند اخلاقی اقدار کے ذیل میں آتی ہیں۔

اطہر رضوی کی طبیعت میں محنت کا عنصر شامل ہے۔ سلطان جمیل نسیم نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"میں نے اطہر رضوی کو ایک محنتی مصنف کہا ہے۔ اس کا ایک پہلو جہاں یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تحقیقی اور تاریخی نوعیت کی کتابوں کی تصنیف سے قبل متعلقہ ممالک کا سفر کر کے حالات کا جائزہ لیا۔ وہاں لوگوں سے جو بھی معلومات حاصل ہو سکتی تھیں وہ اکٹھا کیں۔ اور پھر مغربی مصنفین کی کتابوں کے سفر پر نکل گئے۔ اپنے موضوع اور مطلب کا جو مواد نظر آیا اس کو اپنے طور پر قبول کر کے معرضِ تحریر میں لے آئے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ خوبی بھی ان کی تحریر میں نظر آئی کہ وہ نظریہ سازی سے دور ہی دور رہے۔ اپنے مسلک کے خلاف بھی اگر اُن کے ذہن نے کسی حقیقت کو قبول کیا تو وہ بھی انھوں نے اپنی تحریر میں سمو دیا۔

دوسرا پہلو ان کی محنت کا یہ ہے کہ اپنے ادبی ورثے کی حفاظت کرنے کے ساتھ ساتھ

کنیڈا میں مقیم عام لوگوں سے روشناس کرانے کے لیے انھوں نے جوش ملیح آبادی محمد تقی میر، اسد اللہ خاں غالب اور میر ببر علی انیس کے حوالے سے عظیم الشان اجتماع منعقد کیے۔ عہد حاضر میں ادب کے وہ اکابر، جو میر غالب اور انیس کے کام سے واقف، رتبے سے آگاہ اور مقتدرہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ اُن کو پاکستان و ہندوستان اور انگلستان سے کنیڈا بلا کر مقالے پڑھوانا، اور پھر ان تمام مقالوں کو کتابی صورت میں محفوظ کر دینا، آسان کام نہیں ہے۔ لیکن اس محنت طلب کام کو بھی انھوں نے نہایت خوش اسلوبی اور سلیقے سے انجام دیا ہے۔

مذہبی تعصّبات سے بالاتر شخصیت:

اطہر رضوی مذہبی تعصبات سے بالاتر ایک شخصیت ہیں جس کا اندازہ مذہب سے متعلق اُن کے اپنے فلسفہ کی پیش کش کے ان الفاظ سے بھی لگایا جاسکتا ہے:

"میں ایک آزاد منش مسلمان ہوں۔ اس کے ساتھ شیعی عقیدات کو برحق تصور کرتا ہوں۔ میرے نزدیک انسانیت کے میزان پر جو بھاری اترے وہ ہر لحاظ سے سب سے افضل بندہ ہوتا ہے۔ مجھے انتہا پسندی اور ریاکاری سے نفرت ہے۔ اختلاف رائے کو برداشت کرنے اور اس کا احترام کرنے کی صلاحیت سے جو محروم ہوتا ہے وہ بزرگی اور فضیلت کی منزل تک کبھی نہیں پہنچ سکتا، میری نظر میں اقبال برصغیر کی پانچ ہزار سالہ تاریخ میں یکے از عظیم ترین شخصیت تھے۔ میں پدرم سلطان بود کے کلیشے کا شکار نہیں ہوں۔ تاہم مسلمانوں کی عظمت گم شدہ کا ذکر ہوتے ہوئے مجھے ناقابل بیان سکون محسوس ہوتا ہے۔

یہ میری خوش قسمتی کہ میری عمر کا بیشتر حصہ مغرب کے بازاروں ور درسگاہوں میں گزرا ہے، اس کی بدولت مجھے پہاڑ کے دونوں رخوں کو دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملا ہے۔

یہ میری بہ یک وقت، بدبختی اور خوش نصیبی ہے کہ اگر چہ میری بیوی یوروپی ہے میرے گھر میں انگریزی بولی جاتی ہے۔ میرا دسترخوان یوروپی ہوتا ہے میرے احباب ہر فرقے، مسلک اور نژاد کے ہیں۔ میں گذشتہ تین عشروں سے اردو کے چراغ کو روشن رکھنے کی جہت کررہا ہوں۔ میرا پوتا اردو بولتا ہے اس نے قران ختم کیا ہے اور میرے گھر میں کرسمس کے دوران کرسمس کا جھاڑ بھی کبھی

نہیں لگایا گیا ہے۔ ہمارے گھر میں آزاد خیالی، کشادہ ذہنی اور باہمی خیر سگالی کا راج ہوتا ہے۔ میرے نزدیک دنیا کے سارے مذاہب کے ستون صداقت، محبت، انسان دوستی، باہمی امداد اور امن و شانتی کے ہوتے ہیں۔"

اس آئینہ فکر و خیال میں ہم اطہر رضوی کے اپنے شخصی شعور اور افکار کے پرتو کو بھی ابھرتا نکھرتا اور بکھرتا ہوا دیکھ سکتے ہیں۔

اطہر رضوی نے اپنے خاندان میں بہت سی باتوں میں غیر معمولی پہل کی ہے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ اس کی کیا وجہ ہے تو انھوں نے بتایا کہ "میں اب تک اس کا فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں کہ اگر میں یہ پہلے کام نہ کرتا تو میری زندگی مجموعی طور پر بہتر ہوتی یا بدتر...... یہ کہ میں خاندان کا پہلا شخص تھا جو ملک سے باہر نکل کر ولایت گیا یہی نہیں، ایک یوروپی جرمن نژاد لڑکی سے شادی کی۔ دنیا جہاں کا سفر کیا۔ بے شمار انسانوں سے ملاقات کی، ادبی ثقافتی ہنگامے کیے، اساتذہ دانشوروں سے شرف صحبت حاصل کیا، کتابیں لکھیں۔"

مشاغل:

اطہر رضوی کی مصروفیات و مشاغل میں لکھنا پڑھنا، ریسرچ کرنا، عصر حاضر کے ہر واقعے سے باخبر رہنا، ادبی محفلوں میں حصہ لینا گزری ہوئی زندگی کا تجزیہ کرنا اور پھر مسلسل سوچنا شامل ہیں۔ انھوں نے یاد کے موتی نظم کا اختتام ان اشعار سے کیا ہے:

"اور میں اپنے گھر کے عقب میں
چھوٹے سے اک باغیچے میں
بیٹھے بیٹھے سوچ رہا ہوں
میں نے کتنی دنیا دیکھی
کتنے انسانوں سے ملا ہوں
عہد جوانی کی راتوں میں

کن کن ملکوں اور شہروں میں
کتنی حسیناؤں سے میں نے
الفت کا اظہار کیا ہے!
کتنے دانشور ہیں جن کے
علم و دانش
اور ذہانت کے دیپک کی نرم ضیا سے
میں نے فیض اٹھایا ہے
اور پھر جب بھی وقت ملا ہے
وہ ساری معروف کتابیں
شعر و ادب اور نقد و نظر کی
جو مجھ کو محبوب بہت تھیں
میں نے پڑھنے کی کوشش کی!
میرے خدا نے
مجھ کو بخشی عزت، صحت اور خوشحالی
میرے سفر کی ساتھی ایسی
جو ہے وفا کا ایک مجسم
میرے بچے فضل خدا سے
وہ ہیں میرے فخر کا باعث

O

سنا ہے ہم نے، کہا کسی نے
زمیں کوئی ہو، جسد کہیں ہو

جہاں ہو خوشبو
وہی چمن ہے
جہاں بھی دل ہو
وہی وطن ہے!! (مسی ساگا 20 ستمبر 1990ء)

اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اطہر رضوی ایک بے باک، حق پسند، انصاف پرور، صاف گو، انسان دوست، احباب نواز، بے ریا اور پُر خلوص شخصیت کا نام ہے۔ ان کے یہ چند شعر ان کی شخصیت اور فلسفے کی عکاسی کرتے ہیں۔

پرانی ثقافت کے آثار ہیں ہم
شکستہ سہی ایک دیوار ہیں ہم
تصنع، تکبر، تعصب، تشدد
صفات قبیحہ کے بازار ہیں ہم
ہمارے عوارض سے سب آشنا ہیں
ہمیں بے خبر ہیں کہ بیمار ہیں ہم
کبھی جی حضوری گوارہ نہیں کی
زمانے سے معتوب سرکار ہیں ہم
ہمارے تعارف کی اب کیا ضرورت
یہ سمجھو گئے کل کے اخبار ہیں ہم
اگر لوگ ہم کو قریب آ کے دیکھیں
تو شاید نہ سمجھیں کہ دشوار ہیں ہم!!
نہ افضل نہ اشرف نہ مختار ہیں ہم
مگر خوش خیالی سے سرشار ہیں ہم!

تصانیف کا اِجمالی تعارف

اطہر رضوی کی علمی وادبی زندگی اپنی کئی جہتیں اور امتیازی انداز رکھتی ہے۔ انھوں نے گیارہ (۱۱) کتابیں لکھیں ہیں۔ جن میں چھ (۶) تحقیقی وتنقیدی تصانیف چار (۴) مرتبہ کتابیں اور ایک شعری مجموعہ شامل ہے۔ اطہر رضوی نے جن موضوعات پر اپنی گرانقدر تصانیف پیش کی ہیں وہ منفرد حیثیت کی حامل ہیں جیسے کون عبث بدنام ہوا، خدا کے منتخب بندے، ہر ملک ملک ماست وغیرہ۔ یہ ایسے موضوعات ہیں جو گذشتہ نصف صدی کے پس منظر کے ساتھ اطہر رضوی کی اپنی رسائیوں کی طرف اشارہ سنج ہیں۔

علاوہ برایں اطہر رضوی نے غالب اکاڈمی میں بیادگار غالب مشاعرے کرائے اور سیمینار منعقد کیے۔ ان میں سے بعض سیمیناروں کے موضوعاتِ فکر ونظر حسب ذیل ہیں۔

اردو تہذیب کی قدریں، جوشؔ عالمی سیمینار، میر تقی میرؔ سیمینار، غالبؔ سیمینار، میر انیسؔ سیمینار۔ ان موضوعات سے ان کے مطالعے کی رنگا رنگ فکر ونظر کی وسعت اور علمی وادبی سطح پر ہمہ گیر نقطۂ نظر کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ ذیل میں اطہر رضوی کی کتابوں پر تعارفی روشنی ڈالی گئی ہے۔ جن سے اطہر رضوی کی حوصلہ مندی، بلند ہمتی اور اعلیٰ ادبی ذوق وشوقِ انعقاد وانتخاب کا ثبوت ملتا ہے جو ان کی ادبی شخصیت کی اساس ہے۔

اطہر رضوی کی کتابوں پر ذیل میں گفتگو کی گئی ہے۔

خدا کے منتخب بندے

اطہر رضوی نے اس کتاب میں یہودیوں کی تاریخ، تنظیم اور طریقہ کار کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور یہ بات واضح طور پر بتائی ہے کہ امریکا کی پالیسیوں پر یہودی کس طرح اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب 1998ء میں فکشن ہاؤس مزنگ روڈ لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ یہ 112 صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت 100 روپئے ہے۔ اس کا مقدمہ پاکستان کے نامور نقاد امجد اسلام امجد نے ''ایک نئی دیوار گریہ'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ مقدمہ نگار کتاب کے تعارف میں رقمطراز ہیں:

''اطہر رضوی صاحب نے بہت محنت تحقیق اور عالمانہ غیر جانبداری سے یہودی قوم کے اس فلسفے کی کارفرمائیوں کا احوال لکھا ہے اور تاریخی پس منظر کے ساتھ دورِ حاضر کے تناظر میں بھی بعض ایسے حقائق سے پردہ اٹھایا ہے جن کی طرف اشارہ کرنا بھی ایک طرح سے سانپ کے بل میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے.......... یہ ایک اہم دستاویز ہے جو اہل نظر کے لیے مقامِ فکر اور صاحبانِ بصیرت کے لیے ایک اشارہ ہے''

اطہر رضوی نے اپنا پیش لفظ ''رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف!! کے عنوان سے تحریر کیا ہے اس سے آگے چل کر فلسطین کے بزرگ ترین دانشور اور مورخ سامی ہداوی کا مصنف کے ساتھ رنگین فوٹو کتاب کی زینت ہے۔ جن کا شکریہ مصنف نے اپنے پیش لفظ میں بھی ادا کیا ہے کیوں کہ انھوں نے نہ صرف فلسطین کی آنکھوں دیکھی کہانی اطہر رضوی کو سنائی بلکہ اپنی ساری تالیفات بھی انھیں برائے ریسرچ نذر کیں۔

اس کتاب کی شروعات القرآن کی اس سورۃ کے ترجمے کے ساتھ کی گئی ہے۔

''اور سچ پر پردہ مت ڈالو جب تمھیں اس کا علم ہو'' (القرآن)

بھوپال کے پروفیسر حیدر عباس رضوی نے اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے۔

''آپ نے سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے، جس کیلئے جتنی مدح سرائی کی جائے کم ہوگی''۔

ہر ملک ملک ماست

یہ کتاب بھی فکشن ہاؤس مزنگ روڈ لاہور سے 1998ء میں شائع ہوئی۔ صفحات کی تعداد 207 اور قیمت 150 روپے ہے اس کتاب کا مقدمہ پاکستان کے نامور نقاد وادیب پروفیسر سحر انصاری نے ''چو ذوق نغمہ کمیابی'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے رقمطراز ہیں

''یہ کتاب خیالات، نظریات، اقتباسات کا مجموعہ نہیں، ایک روح مضطرب ایک زندہ انسان کے تجربات کا نچوڑ ہے۔ جس سے افراد اور ادارے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔''

اطہر رضوی کا پیش لفظ ''سودائے جہانگری'' کے عنوان سے کتاب کے ابتدائی اوراق میں موجود اور توجہ طلب ہے جو اپنی جگہ بہت مختصر ہے۔

''ہر ملک ملک ماست'' میں سیروسیاحت کے حوالے سے انسانی معاشروں خصوصاً مسلمانوں کی تاریخ پر نظر ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ موضوعات ہیں جن پر اطہر رضوی نے سوچا ہے اور قارئین کو بھی سوچنے کی دعوت دی ہے۔ یہ بہت اہم موضوعات ہیں۔ ۱۔ اشتراکیت کی موت۔ ۲۔ دہشت گردی، ۳۔ ہم درمیانے، ۴۔ عدم تناسب۔ ۵۔ جہالت اور تعصب۔ اطہر رضوی نے ایران، ترکی، مصر، سمرقند، بخارا اور اسپین کی سیر کے دوران وہاں کی تاریخ، معاشرے، نظام اقدار اور سیاست و معیشت کو بغور دیکھا اور زیر مطالعہ کتاب میں پیش کیا ہے۔

''ہوں میں خوش کہ ان سے مل سکا'' کے عنوان سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری، سید ضمیر جعفری، گوپی چند نارنگ، علی سردار جعفری، حمایت علی شاعر، جمیل الدین عالی اور ڈاکٹر من موہن شرما کے مضامین بھی زیر نظر کتاب میں شامل ہیں۔

تاریخ کا سفر بلکینیا سے بازنیا تک

یہ نظر کتاب فروری 2001ء میں پاکستانی ادب پبلیکیشنز کراچی (کوئٹہ) سے شائع ہوئی ۔جس کی قیمت 300 روپے ہے۔335 صفحات پر مشتمل یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں مصنف نے بیسویں صدی کی آخری دہائی میں بپا ہونے والی ایک قیامت صغریٰ کا نہ صرف تحریری طور پر ذکر کیا ہے بلکہ تاریخ اور واقعات کے حوالے سے حالات کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ اس تجزیے میں ذاتی تجسس فکر فرمائی اور اخذ نتائج کو بطورِ خاص دخل ہے۔ اطہر رضوی نے ''بلکینیا سے بازنیا تک'' میں تاریخ کی روشنی میں تنقید وتبصرہ کیا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے صورت حال کے مشاہدے اور مطالعے کے لیے مشرقی یورپ کا سفر بھی اختیار کیا اور اپنے مطالعے کو عینی مشاہدے سے وسعت اور توازن سے آراستگی بخشی ۔موصوف نے وہاں کے ممتاز افراد اور اداروں کے سربراہوں سے تبادلۂ خیال کیا۔ تاریخ کے اثرات کو اپنی تحریر میں جذب کرنے کی کوشش بھی کی اور اس طرح اپنے بیانات اور اظہار و ابلاغ کو زیادہ پرکشش اور قابل توجہ بنایا۔ یہاں کیا کچھ ہوا کس کس طرح ہوا اس تاریخ کی ایک زندہ حقیقت کے طور پر دیکھنے کے سلسلے میں ان تصاویر پر ایک نظر ڈالنا کافی ہوگا جو مصنف نے کتاب کے آغاز میں پیش کی ہیں۔ ان میں تباہ کاریوں کا وہ منظر نامہ بھی ہے۔ جس میں ایک طرح سے بستیوں کی بستیاں اجاڑ دیں۔ شہر ویران کر دیئے۔ انسانی آبادی تہس نہس ہوگئی بے حرمتی اور عصمت دری کے واقعات صد ہا نہیں ہزاروں کی تعداد میں ہوئے۔ یہ موجودہ عہد میں مظالم ومصائب کی وہ اندوہناک روئداد ہے جس کے بارے میں تمام ضروری تفصیلات مدبرین کے تبصروں، مورخین کے تذکروں اور اخبار نویسوں کی تحریروں کے ساتھ اس کتاب کے صفحات میں موجود ہیں۔

''تاریخ کا سفر۔ بلکینیا سے بازنیا تک'' کے حوالے سے اطہر رضوی کا یہ بیان ہمیں مطالعہ کی بطور خاص دعوت دیتا ہے:

''اس کتاب پر میں نے وقتاً فوقتاً تین برس لگائے ہیں۔ اس تحقیق کی جستجو، مجھے ترکی،

ایران اور بازنیا لے گئی۔ ٹورانٹو میں بازنیا مسجد (جو جامعہ حسر یو بیگ کہلاتی ہے) کے امام طیب پاسن بیگوچ (Tayib Pasanbegovice)، بازنیا میں پاکستان کے سفیر ڈاکٹر محمد طارق، بازنیا کے عظیم عالم محقق اور دانشور ڈاکٹر انیس کارچ اور بازنیا کے صدر علیا علی عزت بیگوچ سے تبادلہ خیال کا شرف حاصل ہوا اور بلکنیا، عثمانیہ دور، بازنیا اور کوسوو پر جتنی کتابیں دستیاب تھیں ان کا مطالعہ کیا۔

اس تصنیف سے قبل میں نے خدا کے منتخب بندے'' لکھی تھی جو عشروں کی تحقیق اور ذاتی مطالعہ کا ماحصل تھا۔ یہ کتاب یہودیوں، اسرائیل اور فلسطینیوں پر اردو میں لکھی ہوئی (جہاں تک مجھے علم ہے) پہلی کتاب تھی۔ یہ میری بد قسمتی ہے کہ پاکستان میں اسے وہ پذیرائی نصیب نہ ہوئی جس کی وہ مستحق تھی۔

زیر بحث کتاب کو میں انگریزی زبان میں زیادہ آسانی سے لکھ سکتا تھا لیکن یہ سوچ کر کہ انگریزی اور مغربی زبانوں میں اس موضوع اور سانحے پر بیسیوں کتابیں تحریر کی جا چکی ہیں، اردو میں ''تحقیقات اور تاثرات'' کے عنوان سے ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی کا ایک مضمون نظر سے گذرا، اس کے علاوہ بد قسمتی سے کوئی معتبر تحریر مجھے نہیں مل سکی۔ اس لیے اس خیال کے مدنظر کہ برصغیر میں بیسویں صدی کے اس انتہائی اہم موضوع پر ایک تحقیقی تحریر سیاسی شعور کے حامل اور سلطنت عثمانیہ سے دلچسپی رکھنے والے قارئین اور سنجیدہ سوچنے اور سمجھنے والے اذہان کے لیے اردو زبان میں فراہم کر رہا ہوں۔ میں نے اپنی تمام تحریروں میں حتی الامکان کوشش یہی کی ہے کہ میرے اپنے خیالات، جذبات اور نجی تعصبات حق گوئی اور تاریخ کی روح کو مسخ نہ کریں بلکینیا کی تاریخ اور یورپ میں سلطنت عثمانیہ کی داستان نسلی نفرت، مخاصمت اور نزاع کی داستان ہے۔''

ہندوستان کے مشہور ادیب و محقق ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اس کتاب پر اپنی مسرت و طمانیت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''یہ صرف ایک علمی گفتگو نہیں بلکہ تاریخ نامہ ہے۔ جس پر مصنف تمام اردو دنیا کی طرف سے تحسین اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔''

کون عبث بدنام ہوا

کون عبث بدنام ہوا اطہر رضوی کی علمی و تحقیقی کتاب ہے۔ یہ کتاب الحمد پبلی کیشنز پرانی انارکلی لاہور سے 2003ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب 350 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی قیمت 300 روپے ہے۔ اس کتاب میں اطہر رضوی نے ان سوالوں کا جواب دینے کے لیے کہ اسلام کی دمک کس نے ماند کی؟ کیا کس نے اور بھرا کس نے؟ اور دنیا میں فقط مسلمان ہی کیوں معتوب ہیں؟ اپنے متحرک تصور اور تاریخی مطالعے کی مدد سے امت مسلمہ اور اس کے عروج و زوال کے پس منظر میں ایسے شاندار تجزیے رقم کیے ہیں کہ جن کی علمی اور تحقیقی حیثیت معتبر و مستند ہے۔

''کون عبث بدنام ہوا'' میں اطہر رضوی نے مغرب کی استعماری طاقتوں کے حسن کرشمہ ساز کی نقاب کی کشائی کرتے ہوئے مسلم دنیا کی اخلاقی باختگی، علم دشمنی، رجعت پسندی، ہوس پرستی، ضمیر فروشی اور حکمت ناعملی کو بھی تنقید کا موضوع اور فکری کاوشوں کا زاویہ نگاہ بنایا ہے۔ انہوں نے معاصر دنیا میں اپنوں اور غیروں کے ہاتھوں معصوم، نہتے اور بے بس مسلم عوام کی جو درگت بنتی دیکھی ہے اسے بیان کرتے ہوئے ان سے اپیل کی ہے کہ وہ ایسے جدید علمی سائنسی اور اخلاقی طور طریقے اپنائیں جن کی بدولت وہ کم مائیگی اور بے بسی کی دلدلوں سے باہر نکل سکیں۔

اس کتاب میں جیسا کہ اس کے گرد پوش پر تحریر ہے۔ دہشت گردی کا پس منظر، جواز اور تجزیہ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔ موضوع کے پس منظر کو اجاگر کرنے کیلئے مصنف نے تقریباً اٹھارہ ثانوی عنوانات قائم کیے ہیں۔ گیارہ ذیلی عنوانات کے تحت جواز کے پس منظر میں مصنف نے انسانی تہذیبیں، کے ثانوی عنوان سے بات شروع کی ہے۔

معروف ادبی نقاد ڈاکٹر شمس الرحمن فاروقی اطہر رضوی کی ادبی خدمات اور علمی طریق رسائی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''بات یہ ہے کہ آپ کی کتاب تفصیلی مطالعہ اور غور و فکر کا تقاضا کرتی ہے اور اس میں وسیع تاریخی معلومات اور گہرا تاریخی شعور نظر آتا ہے۔ آپ نے یہ کتاب لکھ کر اسلام اور امن عالم کے مقصود کو آگے بڑھانے کے سلسلے میں اہم خدمت انجام دی ہے۔''

گرہم برا نہ مانیں

اطہر رضوی کی ایسی تحریر ہے جو مختصر سفرنامہ بھی ہے اور انشائیہ بھی۔ اس میں علمی حوالے اور معلومات کی طرف اشارے بھی موقع بہ موقع ملتے ہیں۔ اطہر رضوی نے بہت سے سفر کیے ہیں اور ان سے متعلق ضروری یادداشتیں قلم بند کی ہیں۔ لیکن یہ کتاب ان کے ایسے سفر کی داستان ہے جس میں پورے ایک عہد کی جھلکیاں ملتی ہیں اردو کی نئی بستیوں کی مختصر روئداد پیش کرنے کے بعد بھوپال شہر اقبال کی تہذیب اور ادبی پس منظر کو بیان کرتے ہوئے لکھنو، علی گڑھ، رام پور کی رضا لائبریری اور معمار پاکستان کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ جو ایک طرح کا اس موقع پر اظہار عقیدت کا اسلوب رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک بہت ہی دلچسپ معلوماتی مضمون، ہندوستانی جمہوریت اور مسلمان کے نام سے شامل اوراق کیا گیا ہے۔ جس میں ہندوستانی مسلمانوں میں ترقی کے میدان میں پیچھے رہنے کی بہت سی وجوہات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بیچ بیچ میں کچھ یادگار رنگین تصاویر بھی دی گئی ہیں جن سے کتاب اور بھی پُرکشش اور دلچسپ بن گئی ہے۔

مزید یہ کہ اس کتاب میں بعض اہم شخصیات پر تعارفی مضامین بھی ہیں۔ جو اطہر رضوی کی علمی اور تحقیقی نظر کے غماز ہیں اور ان کے سیاسی تنقیدی شعور کا ثبوت دیتے ہیں۔

زیر نظر صحیفہ شاہد پبلی کیشنز، دریا گنج، نئی دہلی سے 2006ء میں شائع ہوئی۔ صفحات کی تعداد 226 اور قیمت 200 روپے ہے۔

چہرے باتیں یادیں لوگ

اطہر رضوی کی ایک اور کتاب 2008ء میں اکادمی بازیافت کراچی سے اشاعت پذیر ہوئی۔ 214 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت 250 روپے ہے۔ چہرے باتیں یادیں لوگ میں گیارہ عنوان کے تحت بارہ شخصیتوں کے بارے میں مضامین کے علاوہ پروفیسر سحر انصاری کا دیباچہ تحریر ہے۔

''چہرے باتیں یادیں لوگ'' کی تحریروں کے مضامین کے حوالے سے مصنف نے اپنے مضمون ''سر حرف'' میں لکھا ہے کہ ''یہ کتاب میری شخصی یادوں، ذاتی تجربوں اور میرے حافظے کی سانحاتوں، کا مجموعہ ہے، اس میں پیش کی گئی نگارشات خاکے ہیں یا تذکرے۔ مضامین ہیں یا کوائف، میرے نزدیک اس کی تقویم ضروری نہیں۔'' یہ نثری تصنیف مصنف نے بے حد سادہ سلیس اور دل نشیں انداز میں تحریر کی ہے۔ قاری ان مضامین کو پڑھتے ہوئے دلچسپی کے ساتھ اختتام کو پہنچ جاتا ہے۔ اطہر رضوی کے یہ نثر پارے کرداروں کے حوالے سے بہت سے راز منکشف کرتے ہیں اور بعض ایسے امور کو سامنے لاتے ہیں جنھیں محض باتوں ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

اس کتاب میں انہوں نے ۱۲ شخصیات پر بڑی مہارت سے نثر پارے تخلیق کیے ہیں۔ ان مضامین میں ان کا لب ولہجہ کہیں عقیدت مندانہ، کہیں ناقدانہ، کہیں عاشقانہ، کہیں مشفقانہ ہے اور کچھ مقامات پر معاندانہ طریقۂ اظہار بھی ملتا ہے۔ مگر ان کا اسلوب بیان بلاشبہ تکلف، تصنع، تخیلاتی تضاد اور تصادم سے بہت حد تک پاک ہے

بیادِ غالبؔ

اطہر رضوی کی بیادِ غالبؔ مطبوعہ جاوداں رضویہ سوسائٹی کراچی 1995ء کی تالیف ہے۔ اس میں غالب کی زمینوں میں طرحی غزلیں جو ان کے گھر ''پوشیدہ وادی'' مسی ساگا کینیڈا میں

(گذشتہ دس برسوں کے درمیان) منعقد ہونے والے مشاعروں کے لیے بطور خاص کہی گئیں تھیں شامل ہیں۔اس کتاب کے صفحات کی تعداد 300 اور اس کی قیمت 300 روپے ہے۔

یہاں اس ادبی حقیقت کی طرف اشارہ کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے مقدمے سے کتاب کی اہمیت میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری رقمطراز ہیں ''اطہر رضوی صاحب کی ایجاز خیال کا مرقع ''بیاد غالب'' جس میں برصغیر سے بہت دور یعنی کنیڈا میں مقیم بیس سے زائد شعراء کی طرحی غزلیں شامل ہیں، اردو شعر وسخن کی تاریخ میں ایک تازہ سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، مجھے یقین ہے کہ یہ ایک طرف راہ سفر میں قدم آگے بڑھانے والوں کی رہنمائی کرے گا دوسری طرف اطہر رضوی کے ہاتھوں غالب اور کلام غالب کی مقبولیت کے پرچم کو بلند سے بلندتر کرنے کا وسیلہ بنے گا۔''

عالمی غالب سیمینار

اطہر رضوی نے اگست 1996ء میں عالمی غالب سیمینار ٹورانٹو کنیڈا میں منعقد کیا۔اس سیمینار میں پڑھے گئے مقالات کوانھوں نے کتابی صورت میں مرتب کر کے مکتبۂ جاوداں کراچی سے 1998ء میں شائع کرایا۔اس کتاب کی قیمت 300 روپے اور صفحات کی تعداد 136 ہے۔

اس کتاب کا سرورق شبیہہ غالب بذریعہ اشعار غالب ہے، جس میں بھوپال کے مشہور آرٹسٹ اور ادبی شخصیت ایم۔ عرفان نے غالب سے اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار غالب ہی کے تقریباً تین سو اشعار کی ترتیب وتشکیل سے بنائے ہوئے خاکے یا اسکیچ کے ذریعے کیا ہے۔ اس تصویر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ خاکے میں نمودار سارے اعضا کی تصویر گری ہر عضو پر غالب کے مناسب شعر سے کی گئی ہے جو بلاشبہ ایک معرکۃ الآرا کام ہے۔ مثلاً:

ابرو:

ابرو سے ہے کیا، اس نگہِ ناز کو پیوند
ہے تیر مقرر، مگر اس کی ہے کماں اور   سے بنائے گئے ہیں۔

آنکھ:

گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے   سے بنی ہے

لب:

پھر دیکھیے انداز گل افشانی گفتار
رکھ دے کوئی پیمانہ و صہبا مرے آگے   سے بنے ہیں

دل:

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا   دل کے مقام پر لکھا گیا ہے

اس کتاب کے مشتملات میں کل دس مقالے شامل ہیں۔ جس میں آٹھ مقالات غالب کا سومنات خیال علی سردار جعفری، غالب کا نظریہ فکر وفن ڈاکٹر فرمان فتح پوری غالب کی خاطر آگاہ اور ہنگامہ سنہ ستاون پروفیسر گوپی چند نارنگ، تفہیم غالب ڈاکٹر شان الحق حقی، شبیہ جلوۂ فردا اور تازہ آئینہ اکرام بریلوی، غالب، ایک سراپا خیال ڈاکٹر خالد سہیل، بیاد غالب اور اطہر رضوی اکرام بریلوی اور اردو ادب میں غالب کی انفرادیت خاطر غزنوی کے مقالات شامل ہیں جو اس سیمینار میں پڑھے گئے تھے۔ اس کے ساتھ دو مہمان مصنفین کالی داس گپتا رضا کا غالب از "مہر" اور قدرت نقوی کا غالب کا صلۂ جے پور بھی شامل اوراق کتاب ہیں۔ علاوہ برایں محسن احسان کی منظوم خراج غالب اور بیاد شاعرِ امروز وفردا کے عنوان سے کتاب کی زینت ہے۔ اس نگارش نامے میں بھی ہم اطہر رضوی کا ایک مقدمہ شامل دیکھتے ہیں۔

عالمی میر تقی میرؔ سیمینار

اطہر رضوی نے ستمبر 1999ء میں ٹورانٹو یونیورسٹی کے آڈیٹوریم میں ایک سیمینار میر تقی میرؔ پر منعقد کیا۔ اس میں شرکت کے لیے راقمہ نے بھی ٹورانٹو کا سفر کیا۔ اس سیمینار سے متعلق پیغامات اور مقالات کو کتابی صورت میں مارچ 2000ء میں شاہد پبلی کیشنز نئی دہلی سے شائع کرایا۔ اس کتاب کے صفحات کی تعداد 270 اور قیمت 300 روپے ہے۔

''معتقد کون نہیں'' کے عنوان سے اطہر رضوی کے مقدمہ سے کتاب شروع ہوتی ہے۔ جان کرِیچین (وزیر اعظم کینیڈا) نواز شریف (سابق وزیر اعظم پاکستان)، ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر معین الرحمٰن، ڈاکٹر وزیر آغا اور پروفیسر سید عباس حیدر رضوی کے مبارکباد کے پیغامات شائع کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد سیمینار میں پڑھے گئے سات مقالے میر کا فن اور پاگل پن ڈاکٹر خالد سہیل میر کا لب ولہجہ ڈاکٹر شاہد حسین، میر اپنے زمانے کی معتبر ترین آواز پروفیسر آفاق احمد، میر کی مثنویات کا تہذیبی مطالعہ ڈاکٹر ظل ہما، میر کا دورِ جنون ڈاکٹر نعیم چودھری غزلیات میر میں موضوعات کی تلاش پروفیسر منظر ایوبی اور میرؔ کی تاریخی حیثیت ڈاکٹر تنویر احمد علوی شامل کتاب ہیں۔

مہمان مصنفین کے چار مقالات میر تقی میر آئینہ ایام میں اکرام بریلوی، میر کی شاعری ڈاکٹر فرمان فتح پوری، میر کی شخصیت ان کے کلام میں پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی اور میر ہمارے عہد میں ناصر کاظمی (مرحوم) بھی کتاب کی زینت ہیں۔ اور آخر میں تسلیم الٰہی زلفی کی نظم نذر میر اور سوغاتِ میر کے عنوان سے میر کی منتخب غزلیں دی گئی ہیں۔ مقالات علمی اور ادبی سطح پر معیاری ہیں۔ زبان میں خاص طور سے ایک سنجیدہ اور سنبھلا ہوا معیار شروع سے آخر تک ملتا ہے۔ یہ کتاب مطالعہ میر کرنے والوں کے لیے ایک اہم حوالے کا درجہ رکھتی ہے۔

عالمی میر انیسؔ سیمینار

دو سو سالہ تقریبات میر انیس (۱۸۰۲۔۲۰۰۲) کے سلسلے میں اطہر رضوی نے میر انیس سیمینار جولائی 2002 میں منعقد کیا۔ جس میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے انیس کی معجز بیانی تہذیبی جہات ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز نے اردو ادب میں میر انیس کا مقام، پروفیسر اکبر حیدری کشمیری نے انیس کے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ ڈاکٹر ہلال نقوی نے انیس اکیسویں صدی کے مذہبی تناظر میں پروفیسر مشکور حسین یاد نے میر انیس کے ذوق شعر کی منفرد حیثیت، پروفیسر انیس اشفاق نے کلام انیس میں عناصر چہارگانہ اور ڈاکٹر سید تقی عابدی نے سبک انیس، میر انیس کے مرثیوں میں مضمر طرز سخن پر مقالات پیش کیے، ان مقالات کو 2004ء میں شاہد پبلی کیشنز نئی دہلی نے شائع کیا۔ اس کتاب کے صفحات کی تعداد 208 اور قیمت 300 روپے ہے۔ مہمان، مصنفین کے عنوان سے تین بے حد اہم مقالات پروفیسر نیر مسعود نے میر کا زندگی نامہ پروفیسر شارب ردولوی نے میر انیس کے مرثیوں میں تصویر کشی کا فن اور میر انیس حیدر آباد میں رشید موسوی کے شامل صفحات ہیں۔ جس سے اس کتاب کی اہمیت وافادیت میں مزید اضافہ ہوتا ہے کتاب کے صفحات آغاز میں میر انیس اور آرام گاہ انیسؔ (عقب مسجد تحسین چوک لکھنؤ) کی تصاویر بھی شائع کی گئی ہیں۔ میر انیس کی عزائی تحریر بھی غالبؔ کے انتقال پر شروع کے صفحات میں شامل ہے۔ میر انیس کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے یہ کتاب ایک اہم مآخذ کا درجہ رکھتی ہے۔

یاد کے موتی

اطہر رضوی کا شعری مجموعہ ہے جو 1999ء میں فکشن ہاؤس مزنگ روڈ لاہور سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ 172 صفحات کو محیط ہے اور قیمت 100 روپے ہے۔ اس مجموعے میں غزلیات کے علاوہ 35 صفحات پر مشتمل یاد کے موتی عنوان سے ایک طویل نظم شامل ہے جو اطہر رضوی کی پوری زندگی کا سوانحی خاکہ پیش کرتی ہے۔

اطہر رضوی اسی نام سے شاعری کرتے ہیں انھوں نے بتایا کہ جب وہ ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے اوران کی عمر تیرہ سال تھی تو شاعری پڑھنے سننے اور" کرنے" کا شوق پیدا ہوگیا تھا۔ اور اپنا تخلص باغی منتخب کیا تھا۔ ایک مرتبہ اورنگ آباد سے جالنہ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ مشاعرے میں شرکت کی۔ وہاں جب ناظم مشاعرہ نے 'اطہر باغی' کو دعوت کلام دی تو حاضرین نے ان کا استقبال تحیر اور تمسخر کے ملے جلے اظہار سے کیا۔ کسی صاحب نے بلند آواز سے ناظم سے پوچھا، "یہ باغی باغ سے ہے یا بغاوت سے......" قہقہوں کے درمیان اور خجالت کی بارش سے شرابور ہوکر انھوں نے اپنی تک بندی سے مرصع ایک غزل سنائی۔ اس کے ایک دو شعر انھیں ابھی تک یاد ہیں۔

پھر کوئی بات ہونے والی
دم بدم ٹوٹا ستارا ہے
کچھ تبسم ہے اور کچھ انکار
کس قدر امتزاج پیارا ہے

اس مشاعرے کی رات اطہر رضوی نے آخری مرتبہ لفظ باغی کو اپنے نام کے ساتھ بطور تخلص استعمال کیا تھا۔ بعد ازاں انھوں نے بے شمار اشعار (غزلیں، نظمیں قصیدے) کہے ہیں لیکن بغیر مقطع اور بغیر کسی تخلص کے درج ہوئے ہیں۔

اطہر رضوی کی تصانیف کا مجموعی مطالعہ فکروفن کی کئی جہتوں سے آشنا کرتا ہے۔ اور یہ بات واضح طور پر جس میں مختلف اور متنوع اشارات ملتے ہیں اور فکرونظر کی دعوت دیتے ہیں اور اپنی مختص نمایانی کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ ان کی تحریریں ان کی شخصیت نظریات اور اضطراب باطنی کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔

اطہر رضوی کی کتابوں کے انتسابات:

ایک مصنف اپنی مختلف ترجیحات اور فکری توجیہات کے تحت اپنی کتابوں کو مختلف اہل علم، ارباب فن اور اصحاب فکر سے منسوب کرتا اور ان کے نام کو کتاب کی ادبی اہمیت اور فنی اعزاز کے طور پر کسی کے اسم گرامی سے منسوب کرتا ہے اس اعتبار سے انتساب بیشتر صورتوں میں مصنف کے ذہن کا ایک اہم واردہ اور مشخص اشاریہ ہوتا ہے۔

اطہر رضوی نے اپنی پہلی تصنیف ہر ملک ملک ماست کو اپنی اہلیہ ریٹا کے نام ان الفاظ کے ساتھ معنون کیا ہے۔

''میری جہانگردی کی ہمسفر اور انمول شریک حیات ریٹا'' کے نام اس کے اگلے صفحہ پر فارسی کے یہ اشعار درج ہیں۔

طارق چوں برکنارۂ اندلس سفینہ سوخت
گفتند کار تو بہ نگاہ خرد خطاست
دوریم از سواد وطن باز چوں رسیم
ترک سبب ز روئے شریعت کجا رواست
خندید و دست خویش بہ شمشیر بردگفت
ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدا ے ماست

(اقبال، پیام مشرق)

دوسری کتاب خدا کے منتخب بندے کا انتساب اس طرح ہے

''سوچنے اور سمجھنے والے اذہان کے نام''

اس کے صفحہ کی پشت پر یہ شعر ہے۔

تری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں
فرنگ کی رگ جاں پنجہ یہود میں ہے

(اقبال۔ بانگ درا)

بلکینیا سے بازنیا تک کا انتساب ایک امریکی صحافی Roy Gutnan کے نام ہے جو یہودی ہے لیکن اطہر رضوی اس کی حق گوئی اور انصاف پسندی سے اتنے متاثر ہوئے کہ کتاب کو اس کے نام معنون کر دیا۔ یہ وہی رائے گٹمن ہے جس نے اپنی انفرادی جدوجہد سے بازنیا کی قتل گاہوں اور مظلوم عورتوں کی عصمت دری کے سانحے کا دنیا میں انکشاف کیا۔ یہ انتساب اس صداقت، بے خوفی، حق گوئی، اور بے باکی کا اعتراف ہے جو کسی بھی جانب سے ہو۔ اطہر رضوی خود ان ہی صفات کے حامل ہیں۔

کون عبث بدنام ہوا کا انتساب اسماعیل عباس کی تصاویر کے ساتھ ان کے نام ان الفاظ میں معنون کیا ہے۔

معصوم و مظلوم علی اسماعیل عباس کے نام۔

عرض مصنف کی شروعات اس شعر سے ہوئی ہے۔

جو حق کی بات تھی وہ ہم نے برملا کہہ دی
خیالِ خاطر احباب کب تلک کرتے

گر ہم برا نہ مانیں کا انتساب ہندوستان کے چار بڑے شہروں کے نام ان الفاظ کے ساتھ منسوب کیا ہے۔

بلاد، دہلی، بھوپال، لکھنؤ، علی گڑھ اور رام پور کے نام

جن کی زمینوں میں تاریخ کی عظمتیں محفوظ ہیں۔

بڑے خلوص سے اک ہم نے گھر بنایا تھا
کبھی نہ سوچا وہاں ہم ہی اجنبی ہوں گے

چہرے باتیں یادیں لوگ کا انتساب اطہر رضوی نے اپنی پوتی کے نام سے معنون کیا ہے۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی پُرکشش اور جاذب فکر و نظر اُس کی ایک تصویر بھی ہے۔

میری چہیتی پوتی علیشا کے نام

اس تمنا کے ساتھ کہ وہ بڑی ہوکر میری کتابیں پڑھ سکے گی۔

اطہر رضوی نے اپنی سب سے پہلی تالیف بیادِ غالب کا انتساب اپنی بیٹی کے نام ان الفاظ میں کیا ہے۔

نہایت پیاری بیٹی نیلوفر کے نام

وہ خدا تھا شاعری کے دیس کا
دانش غالب سے ہم ٹکرائیں کیا

عالمی غالبؔ سیمینار کا انتساب اس طرح ہے۔

ساری اردو دنیا میں رہنے والے غالبؔ دوستوں اور غالبؔ شناساؤں کے نام۔

اگلے صفحہ پر ماہنامہ طلوع افکار کراچی کے مدیر حسین انجم کا یہ قطعہ "نذر حضرتِ اطہر رضوی" کے عنوان سے درج ہے:

اطہر رضوی یکے از بت گران شاعری
قبلۂ ارباب دل، قبلہ نشانِ شاعری
مرکز پرکار اردوئے سوادِ کینیڈا
عاشق غالب، شہنشاہ جہان شاعری

عالمی میر سیمینار کتاب کا انتساب ناصر کاظمی اور اپنے عہد کے مشہور ناقد اور محقق پروفیسر گوپی چند نارنگ کے نام ان الفاظ میں کیا ہے۔

ناصر کاظمی (مرحوم) کے نام
جو بلاشبہ جانشین میر کہلائے جاسکتے ہیں۔
اور محترم گوپی چند نارنگ کے نام
جن کے مشورے سے میر عالمی سیمینار کا انعقاد ہوا۔

عالمی انیس سیمینار کا انتساب اس طرح ہے۔

ان انیس شناسوں کے نام جنھیں اردو ادب میں انیس کی عظمت اور منزلت کا صحیح اندازہ ہے۔

انتساب سے پہلے جوش کی نظم ہے۔اے دیار لفظ و معنی کے رئیس الارائیں۔

اطہر رضوی نے اپنے شعری مجموعے یاد کے موتی کا انتساب کناڈا کے مشہور ناقد، محقق، ناول نگار اور شاعر کے نام ان الفاظ کے ساتھ معنون کیا ہے۔

میرے بزرگ مشفق اور کرم فرما
اکرام بریلوی کے نام

میرے خدا
مجھ اس دانش سے دور رکھ جو کبھی نہ روئے
اس فلسفے سے بچا جو ہنسنے سے گریز کرے
اس عظمت سے باز رکھ جو بچوں کے سامنے سر نہ جھکائے

(خلیل جبران اور ان کا آئینہ)

اگر ہم اطہر رضوی کے انتسابات کو دیکھیں تو وہ پہلی نگاہ میں اپنے قارئین کو دو تین باتوں کی طرف متوجہ کرتے نظر آتے ہیں۔اطہر رضوی کی نثری کتابوں میں انتسابات کے صفحہ کی پشت پر شعر دیے گئے ہیں۔اور یہ اشعار ان کے اپنے تخلیقی فکر کے دائرے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔یا پھر کتاب کا نام اپنے ماخذ کو آئینہ دکھاتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔اس طرح شعر نثری کتاب کی صحیفہ سازی کے سلسلے میں انتساب کے اگلے صفحہ پر آیا ہے۔اور شعری کتاب میں نثر کو یہ اعزاز بخشا گیا ہے۔

اطہر رضوی کے نام منسوب کی جانے والی کتابیں:

اطہر رضوی کے نام کئی کتابیں معنون ہوئی ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر شاہد حسین نے اپنی کتاب "مشاہیر کے خطوط" ان قلم کاروں کے نام جو ہندوستان سے باہر اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں" سے منسوب کی ہے جس میں اطہر رضوی کا نام خصوصیت کے ساتھ شامل کیا ہے۔

اردو ادب کے ممتاز محقق، صاحب شعروشعور ادیب اور تنقید نگار ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اردو تذکرہ نگاری پر اپنی بہت اہم کتاب "تذکرہ نگاری کی روایت اور عصری رجحانات" اطہر رضوی کے نام ان الفاظ میں معنون کی ہے:

"محب ومکرم اطہر رضوی کنیڈا کی نذر
جو تحقیق وتنقید سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور جنھوں نے دور دیس کنیڈا میں رہ کر اردو زبان وادب کی غیر معمولی خدمات انجام دیں اور ان کی مساعی جمیل برابر آگے بڑھ رہی ہیں"

اطہر رضوی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ کسی بھی حوالے کو اصل کتاب کے حوالے کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ بلکینیا سے بازنیا تک کے آخر میں انھوں نے انگریزی کی ایک کہاوت نقل کی ہے۔

" IF YOU STEAL FROM ONE WRITER IT IS PLAGIRAISM
IF YOU STEAL FROM TWO IT IS RESEARCH "

اس کہاوت کی اس انداز میں پیشکش سے ان کی علمی دیانت داری اور ادبی وفاداریوں کا اندازہ ان کے قارئین کو ورق بہ ورق اور صفحہ بہ صفحہ برابر ہوتا رہتا ہے۔ ان کے گھر میں ایک چھوٹا سا کتب خانہ بھی ہے اس میں تقریباً دو ہزار کتابیں ہیں۔

بہرحال اطہر رضوی ایک صاحب مطالعہ شخص ہیں۔ انھوں نے بہت سے بیرونی ممالک کی سیر کی ہے۔ صدہا کتابیں ان کی نظر میں ہیں جو ان کے حافظے کی مختلف جہتوں کو روشن

کرتی رہی ہیں ان کی ناقدانہ تحریریں غیر جانبدارانہ اور ح' سانہ ہوتی ہیں۔ آج کل وہ دونہایت اہم موضوعات پر فکر فرمائی اور تحریر و نگارش میں مشغول ہیں یہ ایک نوع کا تحقیقی اور علمی کام ہے۔ ان کے اختیار فرمودہ عنوان نگارش ''شام کے درویش'' اور ''خاموش اکثریت'' ہیں۔

اطہر رضوی صاحب سے میں نے ایک سوالنامے کے ذریعہ دریافت کیا کہ وہ کیا محرکات ہیں جو آپ کو سوچنے اور لکھنے کے لیے ذوق وشوق پیدا کرتے ہیں۔ انھوں نے اس کے جواب میں مجھے تحریر کیا ''پہلی بات تو یہ ہے کہ میں بچپن سے سوچ کا مریض ہوں۔ بچپن میں میں یہ سوچا کرتا تھا کہ وہ لوگ کیسے پیدا ہوتے ہیں۔ جو اتنی موٹی موٹی کتابیں لکھتے ہیں۔ صحیح اور غلط کی تمیز اور حق و باطل کی شناخت والدین کی تربیت اور منفرد گھریلو ماحول نے سکھائی تھی۔ عدم تناسب اور نارسائی اور محرومیت کی علامتیں مجھے سوچنے اور اس کے اظہار کی ترغیب دیتی تھیں۔ میرا کراچی کا دور طالب علمی (جو پانچ سالہ مختصر عرصہ تھا) ایک ذہنی کشاکش کا زمانہ تھا۔ وہاں میں کوئی تخلیقی کام نہیں کر سکا۔ ایم اے کر کے جب میں لندن پہنچا تو وہاں یکا یک میرے ذہن وفکر کے آفاق پر نئی نئی تصاویر اجاگر ہونے لگیں۔

فکر کی ارتقاء، ذہن کی بالیدگی، سوچنے کی صلاحیت اور انسانیت کے مطالعے کے لیے دنیا جہاں میں لندن سے بہتر کوئی اور درس گاہ نہیں ہے۔ عمر کے مدارج، مشاہدات، تجربات، گوناگوں مطالعے اور جہاں گردی کے مواقع فکر کی سطح میں استقامت پیدا کرتے ہیں۔ لندن پہنچ کر پہلے ایک عرصے تک میں ایک ذہنی الجھنیں میں مبتلا رہا ہوں۔ میں مسلسل سوچتا تھا کہ یہ مغربی سفید فام لوگ ہم ایشیائی نژاد افراد کی بہ نسبت اتنے مہذب، اعلیٰ، افضل، نفاست پسند اور صاحب فکرو دانش کیوں ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک مدت تک میں ایک احساس کمتری کا شکار رہا۔ (جسے امام خمینی نے مصنوعی ذہنی پس ماندگی کا نام دیا تھا) میں لندن میں برٹش ریلوے میں کام کرتا تھا۔ ساتھ ہی اکاونٹنگ اور جرنلزم کا کورس کر رہا تھا۔ مجھے لندن، انگلستان اور سارا یورپ بذریعہ ٹرین سفر کرنے کے لیے تقریباً مفت پاس ملا کرتے تھے۔ یورپ کے سفروں

کے دوران مجھے اسپین جانے کا موقع ملا۔ اسپین کے سفر نے میری فکر کا کعبہ ہی بدل ڈالا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے اپنے مسلمان ہونے پر ایک ناقابل تشریح فخر محسوس ہوا۔ وہاں جب میں قرطبہ کی عظیم مسجد میں داخل ہوا تو بغیر کسی شعوری کوشش کے میری سوچوں کے دھارے میں ایک ناقابل بیان ارتعاش پیدا ہوا۔ یہ وہی مسجد تھی جہاں بیٹھ کر اقبال نے اردو کی عظیم ترین نظم تخلیق کی تھی۔ ہندوستان واپس آکر انہوں نے ''انقلاب'' کے ایڈیٹر کو ایک خط میں ہدایت کی تھی۔ مرنے سے پہلے قرطبہ ضرور دیکھ لو۔''

قرطبہ، غرناطہ، الحمراء، بشلیہ، تولیدو میں عرب مسلمانوں کی چھوڑی ہوئی سوغاتیں مغرب کی نشاۃ ثانیہ کی محرک ثابت ہوئی تھیں۔ لندن واپس آکر میں اندلس کی تہذیب اور اس کی سوغاتوں کا گہرا مطالعہ کیا اور پھر جب میں نے Gusttav Diercks کی Furope's "Debt to Islam" میں اس کا یہ اعتراف پڑھا کہ اندلس کی تہذیب اور اس کے علم و دانش اور ایجادات و عجائبات یورپ کو نصیب نہیں ہوتیں تو مغرب میں نشاۃ ثانیہ کے ظہور میں ایک صدی اور لگتی تو یہ پہلا محرک تھا جس نے مجھے مزید مطالعہ غور و فکر اور بعد ازاں اپنے احساسات کو قلم و قرطاس تک لیجانے کی دعوت دی۔

اندلس کی تاریخ سے مسحور ہونے کے بعد دنیائے اسلام کی عظیم ترین سلطنت عثمانیہ کا غائر (In Depth) مطالعہ کیا۔ اس طرح اسلام کی گم شدہ عظمتوں کی تلاش میری نگارشات کی محرک بنی۔

سلطنت عثمانیہ کے سات سو سال کا دور انسانی تاریخ کا ایک عظیم باب تھا۔ سلیمان اعظم یورپ کے ''دل'' ویانا تک پہنچ گیا تھا لیکن اسے فتح کیے بغیر واپس آگیا۔ پھر کسی مورخ نے لکھا کہ اگر وہ ویانا فتح کر لیتا تو آج آکسفورڈ اور کیمرج کا ذریعہ تعلیم عربی ہوتا۔ ان کے علاوہ عصر حاضر کے دو اور سانحے میری نگارشات کی محرک ثابت ہوئے۔ میں ایک بے حد حساس ایشیائی نژاد مصنف ہوں۔ انسانی تاریخ کے تین سانحات نے مجھے متاثر کیا ہے۔

☆ سانحہ کربلا

☆ فلسطین کا المیہ

☆ بازنیا کی دل خراش تاریخ

لندن میں میں نے صیہونیت(Zionism) کی تاریخ اور مظلوم فلسطینی عربوں کی داستان کا گہرا مطالعہ کیا میں دکھی انسانوں اور بدنصیب زمینوں کی داستانوں کو اپنے قارئین تک پہنچانے میں ایک طمانیت محسوس کرتا ہوں مظلوم فلسطینیوں کی تاریخ کو میں نے ''خدا کے منتخب بندے'' (اس موضوع پر اردو میں پہلی تصنیف) میں تاریخی حوالوں اور صداقت کے احترام کی روشنی میں قارئین کو پیش کی۔ دوسرا، بیسویں صدی کا عظیم سانحہ بازنیا میں مسلمان ترک زادوں کے نسلی صفایا(Ethnic cleansing) کی خونچکاں داستان ہے جس نے میری فکر کے تاروں کو متحرک، منتشر، بدحواس اور بے چین کردیا، نازیوں کے ہاتھوں یہودیوں کا قتل عام(Halocaust) جنگ عظیم دوم کا ایک باب تھا۔ سرب درندوں نے بازنیا کے مسلمان مرد، عورتوں اور بچوں کے ساتھ جو ظلم کیا وہ یورپ کی مہذب، نفاست، انسان دوست ملکوں اور ان کے حکمرانوں کی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا۔ میں برصغیر کا پہلا اور آخری محقق و مصنف تھا جس نے بازنیا کا سفر کر کے وہاں کی قتل گاہوں کا مشاہدہ کر کے اور بازنیا کی مظلوم عورتوں سے ملاقات کر کے اپنے اردو کے قارئین کو ''تاریخ کا سفر بلکیدیا سے بازنیا تک'' پیش کی۔

عراق کا سانحہ بیسویں صدی میں Colonialism کی غمناک تاریخ کا اعادہ تھا جس کا ذمہ دار امریکی تاریخ کا بدترین صدر بش تھا۔ میں نے ''کون عبث بدنام ہوا'' ۔ پس منظر جواز اور تجزیہ'' میں 9/11 کی روح فرسا تاریخ کو گہری تحقیق اور مستند تاریخ کے استحقاق کے ساتھ پیش کیا۔ میری مندرجہ بالا تحقیقی تصانیف درحقیقت اردو ادب میں تاریخ نویسی میں ایک منفرد کاوش تھی لیکن برصغیر کے پیغمبران ادب نے میری کاوشوں اور جہات کو مصلحتاً نظرانداز کیا اس

لیے کہ خوش فہمی کے اندھے کنوئیں میں بیٹھے ہوئے لابی ازم کے ناتے سے وہاں ان قلم کاروں کو توصیف و تعظیم عطا کی جاتی ہے جو ادارۂ ستائش باہمی کے منظور شدہ ارکان ہوتے ہیں۔

''گرہم برا نہ مانیں'' میں میں نے برصغیر کی مقدس گایوں کے احوال واقعی کو بیان کرتے ہوئے ہماری رائے کی دکھتی ہوئی رگوں کو چھیڑا ہے۔ نتیجتاً مجھے کسی نے سنگ ملامت کا نشانہ بنایا اور نہ کسی نے پذیرائی کے پھول پیش کیے۔

''چہرے باتیں یادیں لوگ'' میری دوسری تصانیف سے قطعی مختلف ہے۔ اور دراصل یہ میری پسندیدہ نگارش ہے۔

میری اگلی تصنیف یا منصوبہ ''انیسویں صدی کا ادبی لندن'' ہے۔ جو مجھ ناچیز کی دانست میں اردو نثر میں ایک نادر اضافہ ہوگا۔ لسانیات کے ماہر ڈاکٹر ڈیوڈ میتھوز اس پروجیکٹ میں میرے صلاح کار ہوں گے۔ ساتھ ہی خاکوں کا دوسرا حصہ زیر تصنیف ہے۔

میری نگارشات کو اردو ادب کی نثری اصناف میں کس خانے میں ڈالا جائے، اساتذہ اور ناقدین کی آرا اس ضمن میں مختلف ہیں۔ یہ تاریخ نویسی ہے یا سفرنامے۔ خاکے ہیں یا انشائیے، تحقیقی مضامین ہیں یا نثری ادب کی ایک نئی صنف مجھ ناچیز کی رائے میں کیا ضروری ہے کہ انھیں Categorize کیا جائے؟ انھیں تاریخ، تحقیق، مشاہدات، اور معروضات سے مرصع ایک منفرد اسلوب کہنے میں کیا قباحت ہے!!

(میں اپنی نگارشات میں حتی الامکان حقیقت پیش کرنے کی سعی کرتا ہوں۔ تعصب جہالت کے بطن سے پیدا ہوتا ہے۔ جو بھی تعریف کا مستحق ہو اس کا اظہار اپنا فرض سمجھتا ہوں ساتھ ہی تحریر میں توازن کا برقرار رکھنا میں فرض سمجھتا ہوں۔ ایذا رسانی اور قصیدہ گوئی، میں دونوں باتوں سے احتراز کرتا ہوں لیکن حقیقت نگاری میں ہر شخص کو خوش رکھنا بھی ایک غیر ممکن عمل ہوتا ہے!''

اس تحریر کے ذریعہ ہم اطہر رضوی کی نگارشات اور فکر فرمائیوں سے فی الجملہ اور مشاہدے

سے نسبتاً آگاہ ہو سکتے ہیں، اور ان کے تعارف و تعریف میں اچھائیوں اور سچائیوں کو ایک خاص انداز سے سمٹتا ہوا دیکھ سکتے ہیں۔ کیوں کہ وہ ایک حساس انسان ہیں انھیں ہر شخص کی ذات اور شخصیت میں اچھائیاں اور برائیاں محسوس ہوتی ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں ہمیشہ سچ لکھتے ہیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ سچ کڑوا ہوتا ہے ان کے تجزیے بعض اوقات انتہائی بے باک بلکہ سفاک نظر آتے ہیں وہ ادب کو اپنے مطالعے اور مشاہدے کے نسبتاً وسیع تر تناظر میں دیکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں اعتدال اور توازن کا پرتو جگہ جگہ نظر آتا ہے جو ان کی شخصیت کا بھی یہ کہیے کہ لازمی جزو ہے۔

اطہر رضوی ایک منفرد اسلوب رکھتے ہیں۔ انھوں نے تخلیقی اور غیر تخلیقی سطح پر اپنی مشق سخن اور اسلوبِ تحریر کو آگے بڑھایا ہے اور موضوع کے اعتبار سے اسلوب کا انتخاب کیا ہے۔ انھوں نے ایک ایسی دلچسپ نثر کی بنیاد ڈالی ہے۔ جس کو پڑھ کر ان کا قاری اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا بلکہ لطف اندوز ہوتا ہے۔ اپنی معلومات میں اضافہ کرتا ہے اور تجزیاتی نظریہ بھی اس کے پس منظر میں ابھرتا اور سامنے آتا نظر آتا ہے۔

اس طرح ہم ان مقالات کی روشنی میں اطہر رضوی سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ ان کے طرزِ فکر اور اسلوب ادا سے بھی ۔ نیز ان کے معاصرین انھیں کس زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں یہ بھی ہماری نظر میں ابھرتا اور ہمارے فکر و احساس پر اپنے تاثر و تصور کو ایک زندہ حقیقت کی صورت میں ثبت کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

میں ان مقالہ نگاروں کی خاص طور پر ممنون ہوں جنھوں نے میری عرضداشت پر اپنے اپنے مقالے سپردِ قلم کیے۔ جس میں ہمارے دور کے فکر فرما مصنفین کا عکسِ نظر سامنے آتا ہے۔ اس کے علاوہ اُن صاحبانِ قلم اور اہلِ نظر افراد کی بھی ممنون و مشکور ہوں، جن کے مضامین اور مطالعات کو میں نے اس انتخاب کا حصہ بنایا اور اس طرح اپنے قارئین سے ان کا نیا ذہنی رابطہ پیدا کرنے کی ایک کوشش کی۔

اطہر رضوی صاحب جن کے لیے بطور خاص یہ کتاب مرتب کی گئی ہے اس معاملے میں میری ممنونیت کے خاص طور پر مستحق ہیں کہ انھوں نے اس سے متعلق اور اپنی شخصیت و شعور کے بارے میں میرے سوالات کے جوابات تحریر فرمائے۔ اور مجھے اپنی معلومات اور مشوروں سے نوازا۔

اس کتاب کی اشاعت کے ضمن میں ڈاکٹر شاہد حسین کی ممنون اور مداح ہوں اور میرے قارئین بھی اس ممنونیت میں شریک ہیں کہ ان کی اس کرم فرمائی کی بدولت یہ کتاب ان کے مطالعے اور خصوصی توجہ فرمائی کا حصہ بن رہی ہے۔

ظلِ ہما

نئی دہلی۔ انڈیا

۹ر مئی ۲۰۰۹ء

اطہر رضوی
کے
تصویر نامے

اطہر رضوی کے محبوب شہر اورنگ آباد میں رابعہ درّانی کا مقبرہ

اطہر رضوی کے والد سید حسین

والدہ فرخ بیگم

اطہر رضوی کی بہنیں طاہرہ بزمی اور زہرہ رضویہ

اظہر رضوی، زہرہ رضویہ، بادشاہ بیگم، اطہر رضوی (بہنیں اور بھائی)

اجداد کے مزار۔ اورنگ آباد

لندن کے یادگار دن

اطہر رضوی اور ریٹا

اطہر رضوی ریٹا اور نیلو کے ساتھ

اطہر رضوی، ریٹا، انور، نیلو اور گوہر

دو عشرے بعد اظہر رضوی کا خاندان
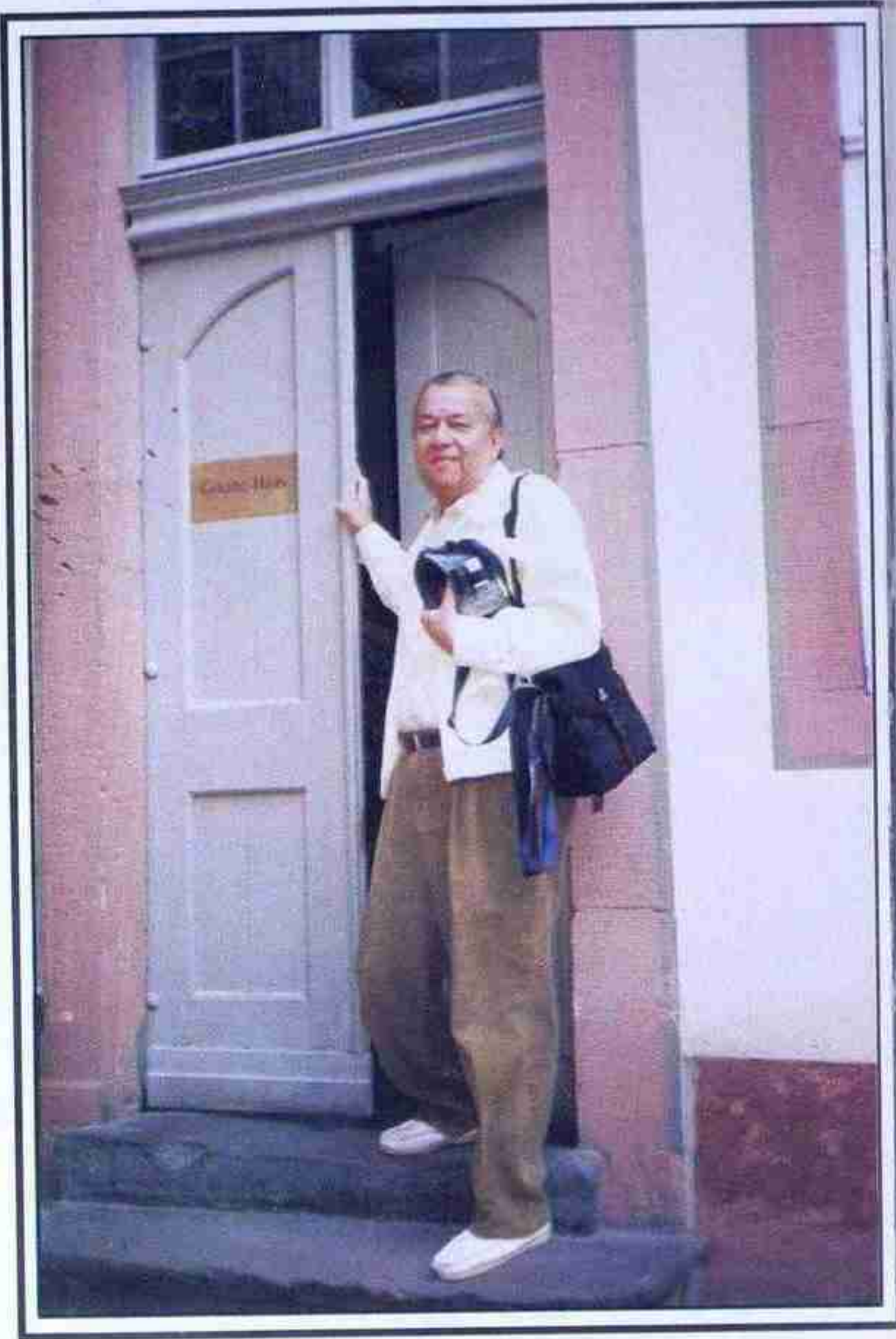
گوئٹے کا گھر۔ فرینک فرٹ
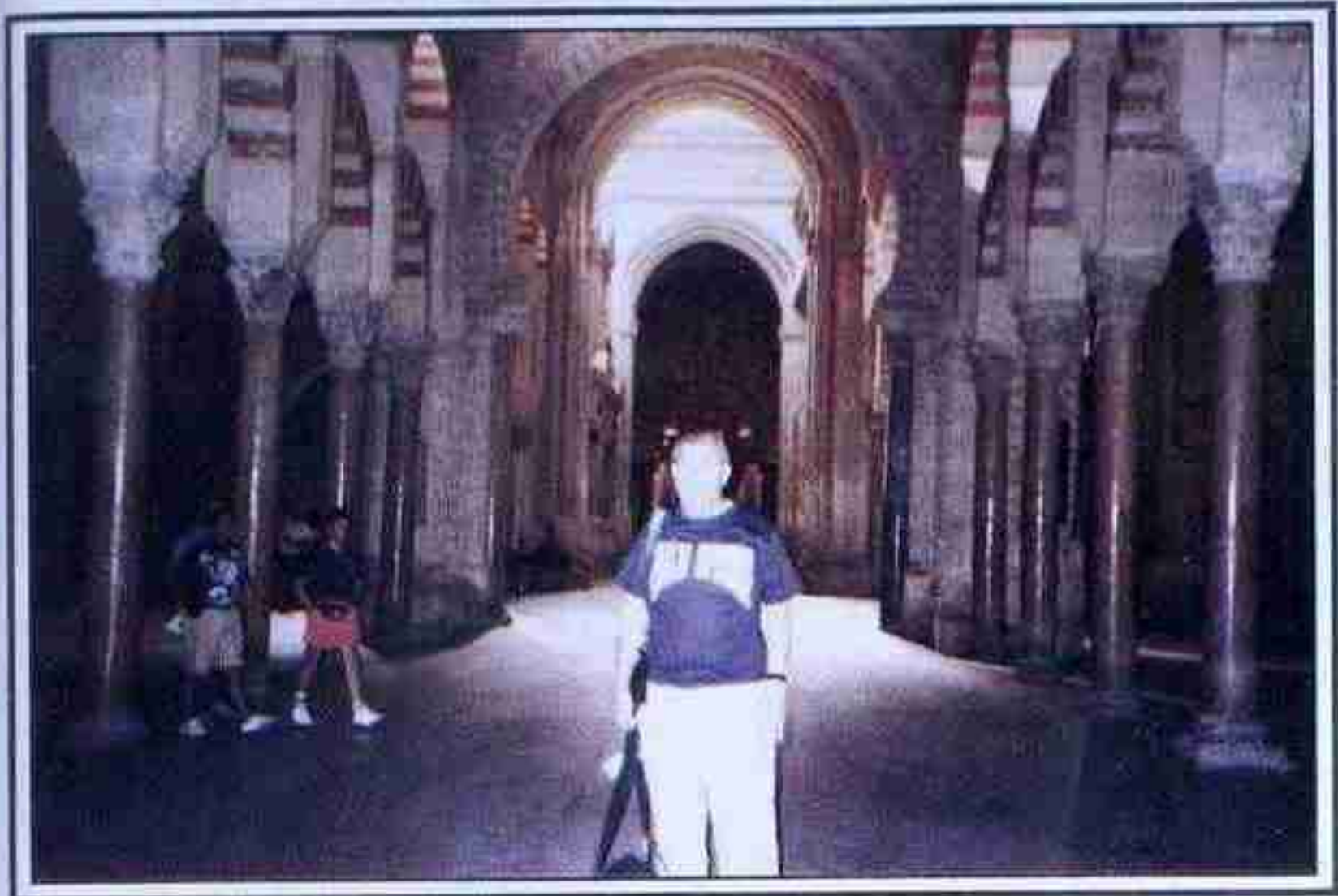
مسجد قرطبہ

شہر پشکن ۔ روس

فردوسی کی آرام گاہ

فردوسی کی آرام گاہ

شیراز میں "تختِ جمشید" کے آثارِ قدیمہ

ایشائی استنبول

سعدی کی آرام گاہ۔ شیراز
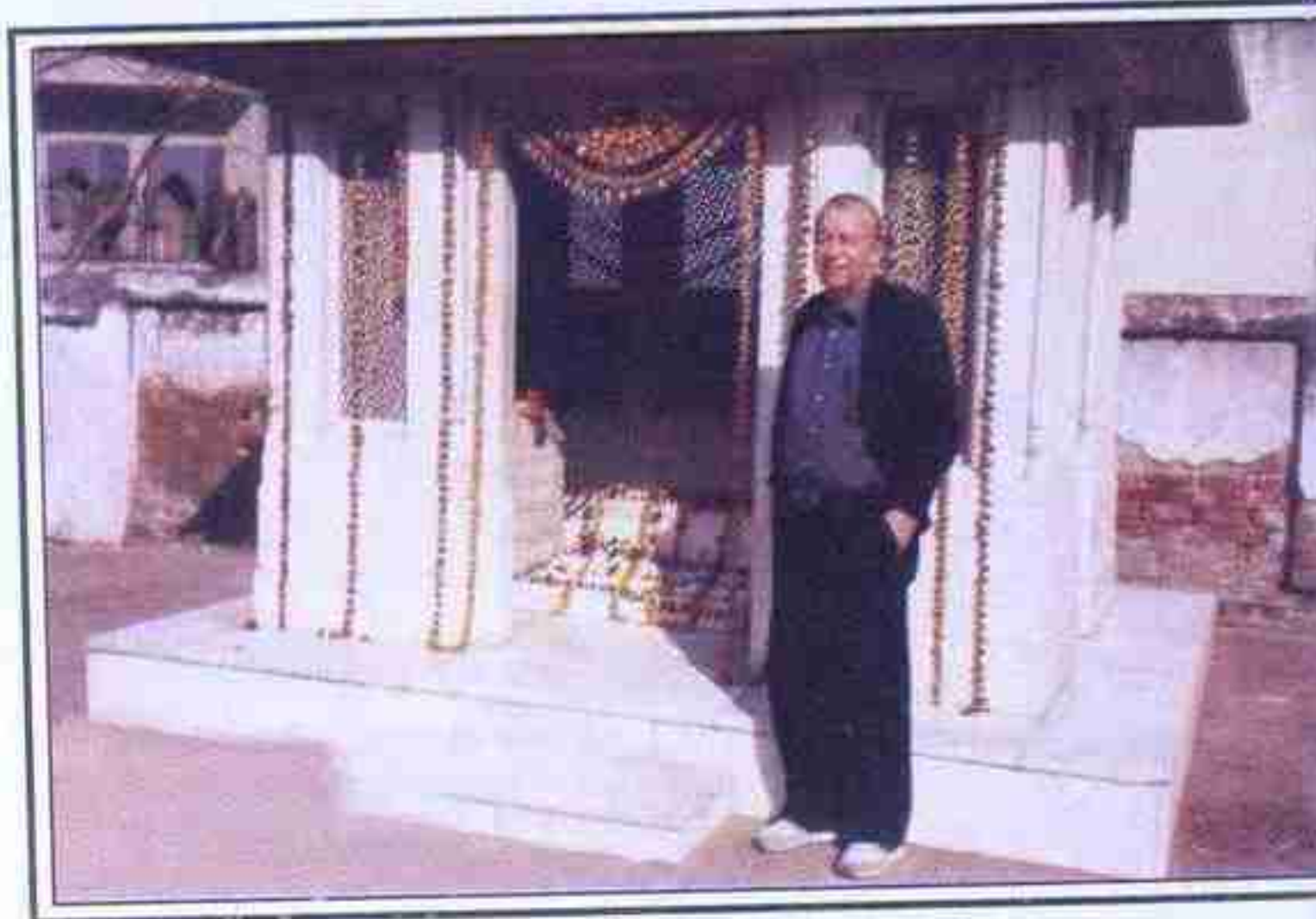
غالب کی آرام گاہ، دہلی
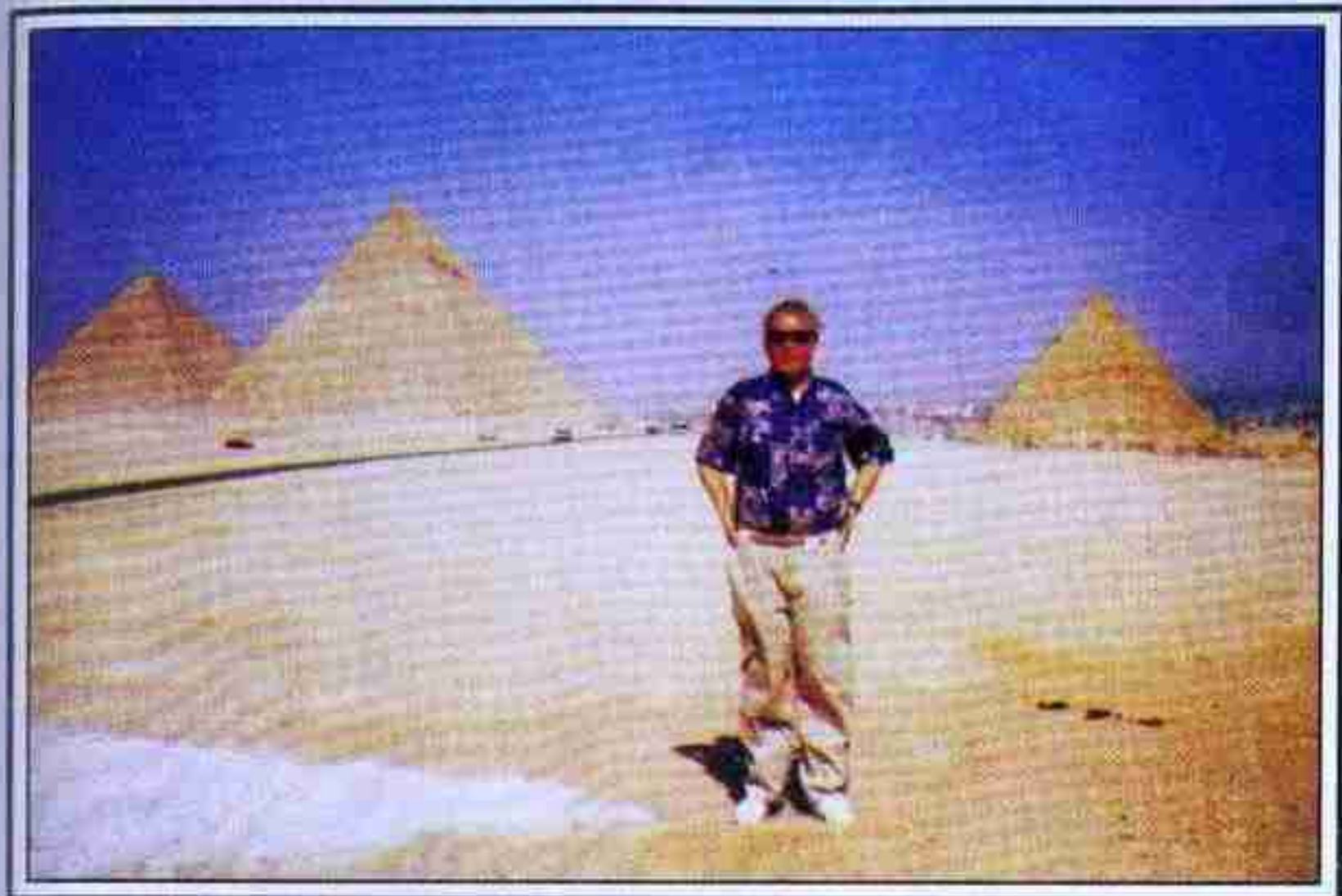
قاہرہ میں گنیزہ کے اہرام

مسجد حسینیہ۔ ٹورانٹو

ڈاکٹر تقی عابدی، پروفیسر انیس اشفاق، اطہر رضوی، بلال نقوی، پروفیسر اکبر حیدری، مشکور حسین یاد، اشفاق حسین، افتخار حیدر
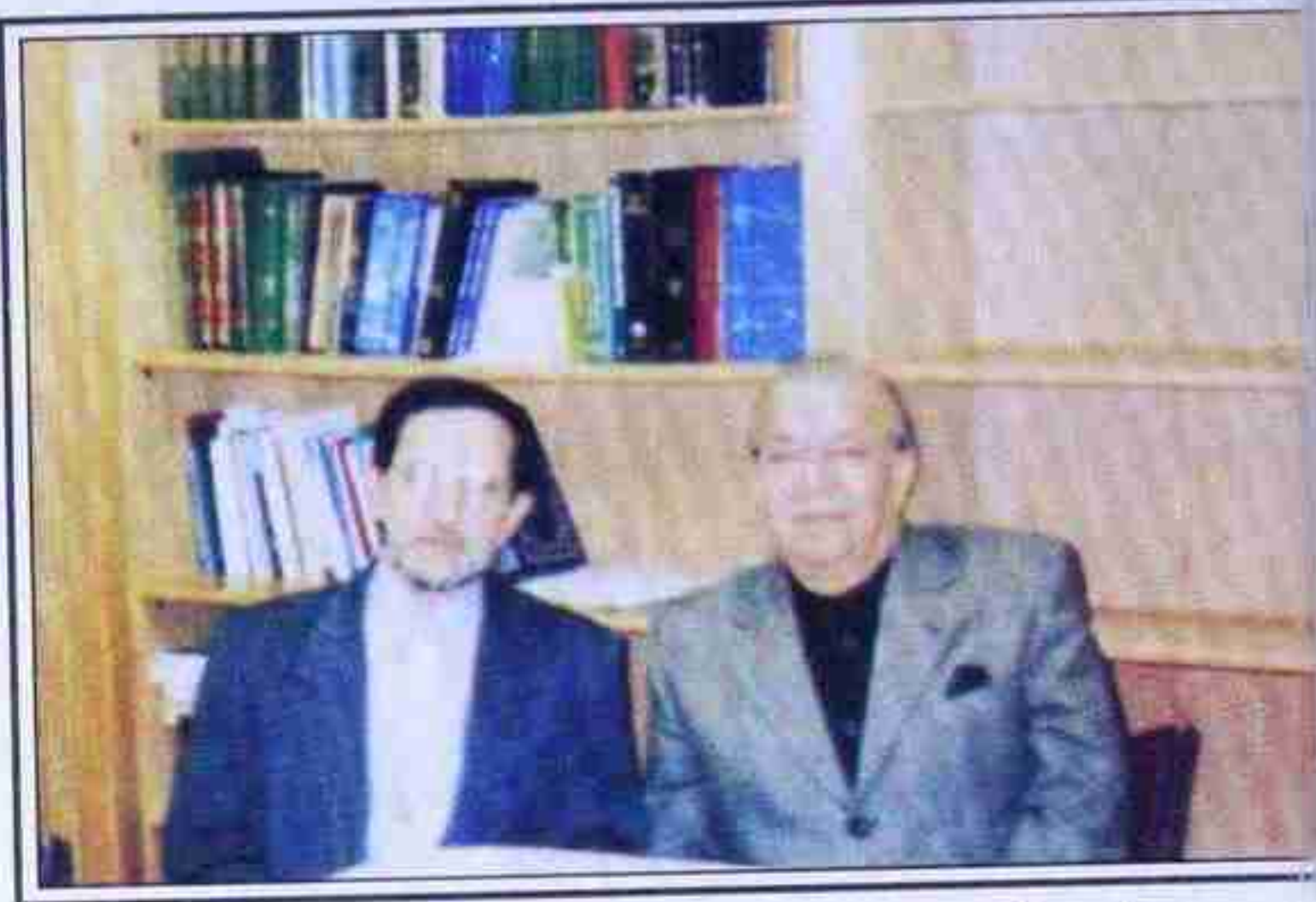
ٹورانٹو کی بازنیا مسجد کے امام طیب پاسن بیگو وچ اور اطہر رضوی

فلسطین کے بزرگ ترین دانشور اور مورخ سامی ہداوی اطہر رضوی کے ساتھ

کیفی اعظمی اور اطہر رضوی

احمد فراز کے ساتھ اطہر رضوی

اکرام بریلوی، اطہر رضوی اور شان الحق حقی

اطہر رضوی اور فرمان فتح پور

ضمیر جعفری اور اطہر رضوی

بیگم احسان، شہزاد احمد اور محسن احسان (اطہر رضوی کی رہائش گاہ پوشیدہ وادی کے دروازے پر)

اطہر رضوی، ڈاکٹر گیان چند جین اور پروفیسر گوپی چند نارنگ

اطہر رضوی ،حمایت علی شاعر کے ساتھ

افتخار حیدر، شان الحق حقی، افتخار عارف اور اطہر رضوی

اطہر رضوی اور جمیل الدین عالی

اطہر رضوی، محسن احسان، احمد ندیم قاسمی، قمر رئیس، فتح محمد ملک اور جون ایلیا

ڈیوڈ میتھوز، ڈاکٹر لڈملا میتھوز اور اطہر رضوی

اطہر رضوی، اشفاق حسین، نقاش کاظمی، معراج محمد خان اور محمود شام

حبیب جالب اپنے شیدائیوں کے ہجوم میں (جالب اطہر رضوی کی دعوت پر ٹورنٹو آئے تھے)

ولی عالم شاہین، فہمیدہ ریاض، اطہر رضوی اور نسیم سید

پروفیسر منظر ایوبی، ڈاکٹر ظلِ ہما، ندا فاضلی، جون ایلیا

نزہت صدیقی، خواجہ نور، افضل امام، اشفاق حسین، جوش مندوزئی، اطہر رضوی، خالد سہیل اور عقیلہ شاہین
عقب میں سحر انصاری، شہزاد احمد، محسن احسان، فریدہ شاہ (ٹورنٹو میں پاکستانی کونسل جنرل)

بیادِ غالب سالانہ طرحی مشاعرہ زیر صدارت پیرزادہ قاسم، شاعر ستیہ پال آنند، ناظم اطہر رضوی

نزہت صدیقی، خولجہ نور، افضل امام، اشفاق حسین، جوش مندوزئی، اظہر رضوی، خالد سہیل اور عقیلہ شاہین
عقب میں سحر انصاری، شہزاد احمد، محسن احسان، فریدہ شاہ (ٹورنٹو میں پاکستانی کونسل جنرل)

بیادِ غالب سالانہ طرحی مشاعرہ زیرِ صدارت پیرزادہ قاسم، شاعر ستیہ پال آنند، ناظم اظہر رضوی

ڈاکٹر شاہد حسین، ڈاکٹر ظلِ ہما، ڈاکٹر تنویر احمد علوی اور اطہر رضوی (ٹورنٹو کینیڈا)

نسرین سید، ذکیہ غزل، ثریا باجی، اطہر رضوی، افتخار حیدر، اکرام بریلوی، فیصل عظیم،
پروفیسر وسیم بریلوی، نظام الدین مقبول اور انیس زبیری

سلطانہ مہر (کیلی فورنیا)، ڈاکٹر ظل ہما (دہلی)، ندا فاضلی (ممبئی)، ڈاکٹر تنویر احمد علوی (دہلی) پروفیسر منظر ایوبی (کراچی)، پروفیسر آفاق احمد (بھوپال)، ڈاکٹر چودھری نعیم (شکاگو)، رشید صدیقی، ڈاکٹر شاہد حسین (دہلی)
عابد جعفری، اطہر رضوی، ڈاکٹر خالد سہیل، منیر پرویز، شمیم عباس، اکرام بریلوی، حسین رضوی

(کھڑے) اکبر حیدری، اشفاق حسین، ولی شاہین، شاہد ہاشمی، سلطانہ مہر، اطہر رضوی، جمال قادری،
نسیم فروغ، عبدالرحمن صدیقی، ثریا خان، باقر زیدی، تقی عابدی
(بیٹھے) بلال نقوی، عطاالحق قاسمی، انعام الحق جاوید، گوپی چند نارنگ، مشکور حسین یاد، انیس اشفاق، دانش بناری (عالمی غالب سیمنار

(بائیں ہاتھ سے) شان الحق حقی، محسن احسان، علی سردار جعفری، ثریا خان، فرمان فتح پوری
گوپی چند نارنگ، ضمیر جعفری، خاطر غزنوی اور اطہر رضوی (عالمی غالب سیمنار)

خالد سہیل، خورشید عالم مرحوم، فرمان فتحپوری، گوپی چند نارنگ، امراؤ طارق اور اطہر رضوی

سیّد مشکور حسین برنی، اطہر رضوی، سعادت سعید، نسیم سیّد، عالیہ امام، ثریا، آفاق احمد، کلب حسن، ڈاکٹر سیّد تقی عابدی، خوشنود حسن

سلطانہ مہر، محسن احسان، اطہر رضوی، نجمہ عثمان (برمنگھم میں تقریب اجراء)
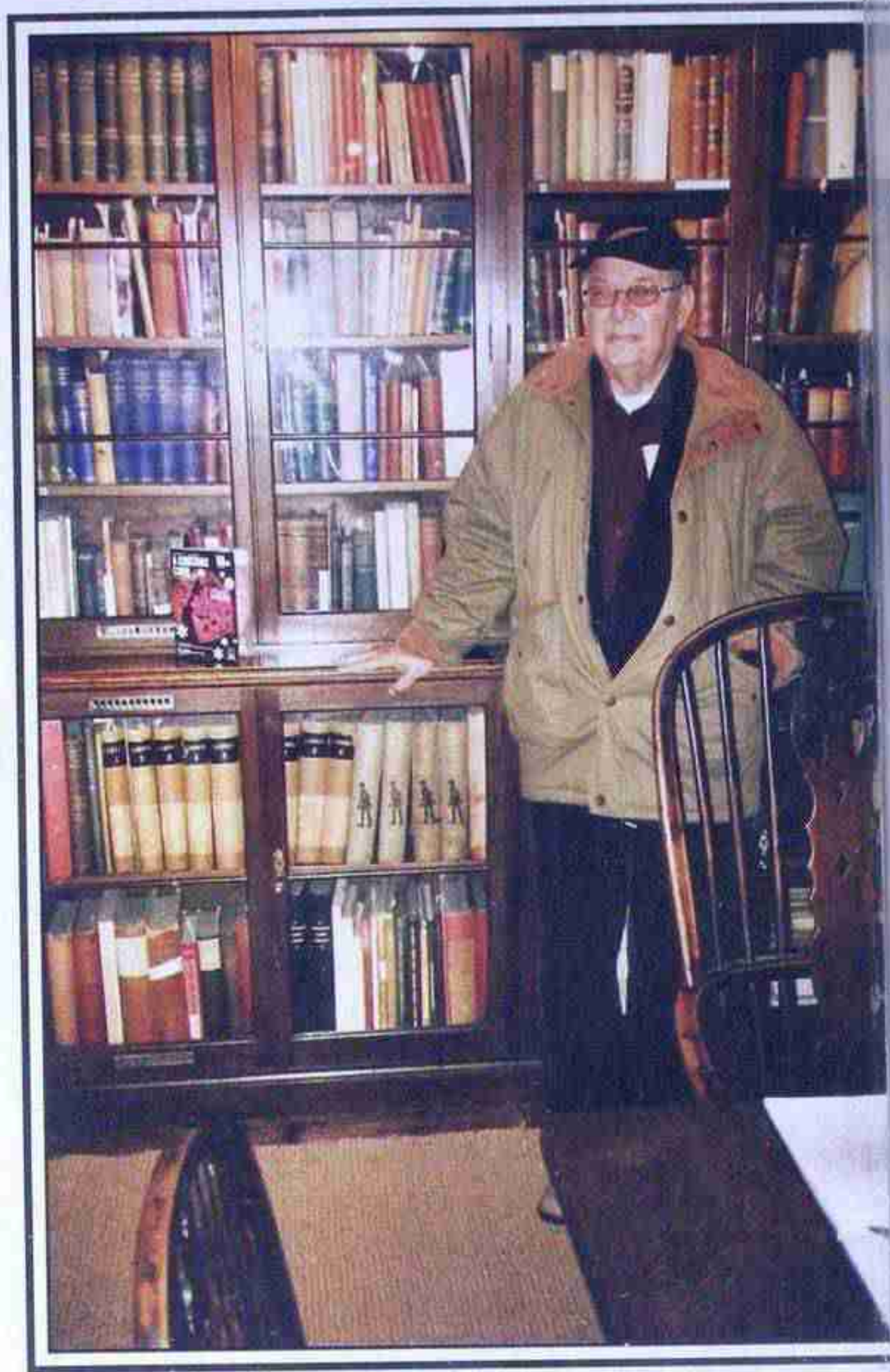
چارلس ڈیکن کا کتب خانہ۔ لندن

اطہر رضوی: شاعر، مصنف اور مورّخ

اکرام بریلوی، کناڈا

اطہر رضوی نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا شاعری سے کی۔'یاد کے موتی' اُن کا شعری مجموعہ اس کی روشن دلیل ہے۔ اس شعری مجموعہ میں اکتالیس غزلیں، اٹھائیس نظمیں اور ایک طویل نظم ''یاد کے موتی'' شامل ہے، لیکن اُن کی نظم 'اروبا' اُن کے فنی کمال کا بہترین ثبوت فراہم کرتی ہے۔ اس نظم کے تین تاثرتی منظر ہیں۔ یہ جنوبی امریکہ کے ایک چھوٹے سے جزیرے کی شام کے فسوں سے شروع ہوتی ہے۔ جو رات کی دہلیز تک پہنچتی ہے جہاں دور تک چراغاں ہے اور دنیا کے سب سے بڑے قمار خانے میں 'کسینو' (Casino) کے پرستار جمع ہیں اور پھر رات، صبح کی پوشاک پہننے کو ہے——

اس سلسلۂ روز و شب کے درمیان دنیا کے ایک بڑے قمار خانے، اس کے باہر کی دلکش و دلربا فضا بندی، اس کے ستم پیشہ حرص و خرافات کی گہما گہمی، ترغیب عمل، زر کی فروانی، نقری سکوں کی جھنکار، بدمستی اور انسانی کمزوری اور آخر میں ہارے ہوئے جواریوں کی نفسیات کی بڑی فنکارانہ مہارت سے عکاسی کی گئی ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں——

''جانِ من

آج جزیزے میں اداسی ہے بہت

شام کا وقت ہے

میں زیرِ فلک بیٹھا ہوں

اک عجب حسن ہے ساحل کی زمیں کا اس دم
بے کراں شام کے اطراف سمندر کا فسوں
چیختی، جھاگ اگلتی ہیں مچلتی لہریں

....

نرم، باریک، سفید اور ملائم ریتی
اس پر لیٹی ہوئی لاطینی حسینائیں ہیں

....

جسم عریاں ہیں کچھ اس طور کہ مداحوں کو
زحمتِ فکر و تصور کی ضرورت ہی نہیں۔"
اور پھر
"شام اب رات کی دہلیز تلک آ پہنچی
اور اب سارے جزیرہ میں چراغاں سا ہوا
ہر کسینو کے پرستار جمع ہونے لگے

....

صف بہ صف زر کی مشینیں ہیں لگی ہر جانب
حسن کی دیویاں، پانسوں کو لیے بیٹھی ہیں
"آزمالیجیے قسمت کو مزہ آئے گا"
اور آخر میں
"رات اب صبح کی پوشاک پہننے کو ہے
چند سودائی، جوابازا بھی بیٹھے ہیں
اک سسکتی ہوئی بجھتی ہوئی موہوم سی آس

خانۂ دل میں چھپائے ہوئے گھبرائے ہوئے
بیٹھے خوابوں کی چتا سینے سے چمٹائے ہوئے
ہار کو جیت بنانے کے لیے بیٹھے ہیں
وہ جو بے جان مشینوں کو نہ دے پائے شکست
مات تقدیر کو دینے کے لیے بیٹھے ہیں۔
کوئی بقراط یہاں ہے نہ مسیحا ہے کوئی
کس سے تسکین ملے کس سے پشیمانی ہو
یہ وہ دوزخ ہے جہاں کوئی گنہ گار نہیں

....

سینۂ ارض پہ چھایا ہوا سناٹا ہے

....

پھر میں اک بار ہوں ساحل کی زمینوں پہ کھڑا
چیختی جھاگ اگلتی ہیں مچلتی لہریں
میرے پیروں کو وہ چھوتے ہی پلٹ جاتی ہیں

....

اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں میرے سوا
جانے کیوں مجھ کو یہ ہوتا ہے اچانک احساس
جانِ من
آج جزیرے میں اُداسی کم ہے!

مقامِ حیرت ہے ایسی عمدہ اور فکر آگیں نظم لکھنے کے بعد بھی وہ شاعری کو ذریعۂ عزت نہیں سمجھتے۔ آگے بڑھئے تو ان کا تہہ خانہ (BASEMENT) ادب کا نگار خانہ بنا ہوا ہے۔

صرف اس پر بس نہیں وہ غالب کے حد درجہ طرفداری اور برصغیر سے باہر پہلی دنیا میں، غالب اکادمی کے بانی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی توجہ کا میدان اور طبیعت کا میلان تاریخ و تحقیق ہے جو ان کی اصل شناخت بلکہ ان کی شخصیت کی بنیاد و احساس ہے۔

اس ضمن میں یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ اطہر رضوی دیانت داری، راست گوئی اور تاریخی حقائق اور شواہد پر سچائی اور پورے خلوص کے ساتھ قائم رہنے کو مورخ کا فریضہ و وظیفہ سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے موضوع کی مناسبت سے اچھے اور برے، خوب و زشت دونوں ہی رخوں کا بڑی جراتمندی اور بے باکی کے ساتھ جائزہ لیتے ہیں توہین و تضحیک کے مقصد سے نہیں بلکہ اپنے نقطہ نگاہ سے اسے تاریخی تناظر کی روشنی میں اتنے توازن و ترتیب سے ضابطہ تحریر میں لاتے ہیں عیوب کو برا نہ بتائے، ارادت و عقیدت کو مخفی نہ رکھے اور اس حسن و خوبی کے ساتھ کہ دیانت دار مورخ کی تاریخ نگاری کا تقدس اور بھرم بھی قائم رہے۔ اس کٹھن اور دشوار مرحلے اور معاملے میں وہ مصلحتاً بھی راست گوئی اور سچائی کا دامن نہیں چھوڑتے اور سب وشتم سے اپنی تحریر کو داغدار بنانے سے حد درجہ گریز کرتے ہیں۔ اس لحاظ و احتیاط و وضع کی وجہ سے ان کی تحقیقی تصانیف عام روش سے الگ تھلگ اور جداگانہ سی نظر آتی ہیں۔ اطہر رضوی کی ایک زندہ خوبی یہ بھی ہے کہ اُن کے اندر ایک ایسی مضطرب اور بے چین روح کارفرما ہے جو اُنھیں ایک موضوع پر ٹھہرنے نہیں دیتی اور وہ اُنھیں خوب سے خوب تر کی طرف لے جاتی ہے اور اس طرح وہ نئے سے نیا مضمون ڈھونڈ لاتے ہیں۔ ہر ملک ملک ماست، تاریخ کا سفر بلکینیا سے بازنیا تک، کون عبث بدنام ہوا، گر ہم برا نہ مانیں، اور چہرے، یادیں، باتیں، لوگ' اسی کے منہ بولتے اور زندہ ثبوت ہیں۔

یاد آیا۔ اطہر رضوی اپنے متفرق مضامین کی کتاب 'ہر ملک ملک ماست' مرتب کر رہے تھے۔ میں ان دنوں کنگسٹن (انٹاریو) میں تھا، جہاں میری بیٹی انجم کوئنس یونیورسٹی میں ڈائریکٹر آف کمیونیکشنز (Director of Communication) اور پبلک افیئر (Public

(Affairs تھی۔ الغرض اطہر رضوی نے کتاب کا مسودہ مجھے ارسال کیا۔ جس میں ایک طویل مقالہ بعنوان 'خدا کے منتخب بندے' بھی شامل تھا۔ میں نے بغور اس مسودے کا مطالعہ کیا اور انھیں لکھا۔

''آپ کیا غضب کر رہے ہیں کہ ایک نہایت عمدہ اور تحقیقی تصنیف کو متفرقات میں ضم کیے دے رہے ہیں۔ خدا کے لیے اسے علیحدہ سے کتاب کی صورت میں شائع کرائیں۔''
انھوں نے میری بات مان لی اور اچھا ہی کیا۔ کتاب آب وتاب کے ساتھ شائع ہوئی۔ دیباچہ امجد اسلام امجد نے اس طرح شروع کیا۔

> ''صیہونیت(ZIONISM) کی بنیاد اس مفروضے پر رکھی گئی ہے کہ یہودی خدا کے منتخب بندے ہیں اور یوں انھیں باقی کی خلق خدا پر ایک ایسی فوقیت حاصل ہے جس کا فیصلہ عرشوں پر ہو چکا ہے اور یہ کہ ان کی اس فضیلت کی گواہی تمام آسمانی کتابوں میں موجود ہے۔ نسلی برتری کا یہ خناس انسانی تاریخ میں نیا نہیں، کبھی یہ آریاؤں کے اس تفاخر کی شکل میں ظاہر ہوا جس کے ہندوستان کے قدیم اور مقامی باشندوں کو ''شودر'' بنا ڈالا اور کبھی BLUE BLOOD کے اس عظیم خبط کی صورت میں جس کی ایک نمایاں مثال انگلستان کے اسٹورٹ بادشاہوں کا DIVINE RIGHT OF THE KINGS تھا۔ ماضی قریب میں جنوبی افریقہ کی نسلی تفریق پر مبنی پالیسی APARTHEID بھی اسی ایلم کی ایک تصویر ہے۔''

''خدا کے منتخب بندے'' میں دراصل انھوں نے، قوم یہود کے عروج وارتقاء کو بڑی غیر جانبداری کے ساتھ اپنا موضوع بنایا ہے جسے آج تک اردو زبان میں کسی نے چھونے کی ہمت نہیں کی تھی۔ یہ اردو میں قوم یہود پر پہلی تصنیف ہے جو اطہر رضوی کی تاریخی بصیرت کی غمازی کرتی ہے اس کتاب میں نہ صرف انھوں نے عالمانہ غیر جانبداری بلکہ انتھک محنت اور تحقیق

مہارت سے یہودی قوم کے فلسفے کا احوال لکھا ہے جو تاریخی پس منظر کے ساتھ ساتھ دورِ حاضر کے تناظر میں بعض ایسے گمبھیر حقائق سے پردہ اٹھاتا ہے جن کی طرف اشارہ کرنا بھی بڑی جرات کے مترادف ہے۔ اسی طرح ''تاریخ کا سفر: بلکیبیا سے بازنیا تک'' نہ صرف دولت عثمانیہ کے عروج وزوال کی خونی داستان ہے بلکہ اس کا آخری سِرا، بازنیا، کی ہولناک، انسانیت سوز غارت گری کا ایسا دلدوز تاریخی سفر ہے جسے پڑھتے ہوئے روح کانپ کانپ جاتی اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ''کون عبث بدنام ہوا'' بقول ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی:

> ''یہ کتاب نہ صرف معلومات کی کان ہے بلکہ عالمی دہشت گردی پر اردو زبان میں پہلی مستند تاریخی تصنیف ہے، یہ آنے والی نسلوں کے لیے انفرادی گروہی اور ریاستی سطح کی دہشت گردی کے آغاز اور ارتقاء پر حوالے کی کتاب ہے۔''

اطہر رضوی صاحب کی تاریخی تحقیق کتابیں پڑھتے ہوئے یہ خیال اکثر و بیشتر میرے لیے حیرانی و پریشانی کا باعث بنتا ہے کہ ایسے صبر آزما، بڑے اور دشوار کام جنھیں ترقی یافتہ بلکہ پسماندہ ممالک میں بھی بڑے بڑے ادارے انجام دیتے ہیں وہ تن تنہا کس طرح کر گزرتے ہیں۔ میں چونکہ ان کے رازِ دروں کا رفیق اور شریک ہی نہیں بلکہ ان کی تاریخی تخلیقات کا سب سے پہلا قاری ہوں اس لیے پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اُنھیں تاریخ و تحقیق سے بے پناہ لگاؤ بلکہ والہانہ عشق ہے جسے اقبال نے دم جبرئیل اور دل مصطفیٰ سے تعبیر کیا ہے۔ اس لیے وہ جنون کی حد سے نکل کر امیر جنود بن جاتے ہیں جو اُن کے دست زرفشاں کو غالب و کار آفریں بنا دیتا ہے۔ اس محیر العقل تاریخی و تحقیقی کام کر گزرنے پر ہمیں کھلے دل سے داد دینی چاہیے۔

اطہر رضوی کی ایک کتاب'' گر ہم برا نہ مانیں'' آغازِ سفر سے لے کر معیارِ نظر تک کے اٹھارہ ابواب ہیں۔ یہ تمام ابواب نیا طور نئی برق تجلی سے معمور و منور ہیں یعنی ان کے

موضوعات مختلف النوع ہیں۔ ان میں 'اردو کی نئی بستیاں' 'بھوپال شہر اقبال' 'لکھنؤ کی ذیلی تہذیب' 'معمار پاکستان' 'سرسید اور علی گڑھ' رامپور کی رضا لائبریری' 'ہندوستانی جمہوریت' اور ڈاکٹر رفیق زکریا' مجھے خاص طور پر پسند ہیں۔ 'اردو کی نئی بستیاں' اس لیے کہ اس میں اُن کا لسانی مقالہ اور یہاں کینیڈا میں مقیم تارکین وطن کی اردو دوستی اور کارگذاریوں کی انتہائی جامع و جاندار داستان سپرد قلم کی گئی ہے جو اپنی جگہ دلچسپ اور حیران کن ہے۔ اس میں اردو ادب کے اکابرین پر بین الاقوامی سیمناروں کا تفصیلی جائزہ، عالمی مشاعروں اور مختلف ادبی شخصیات پر سیر حاصل تبصرہ اور ان کی مساعی جمیلہ وجلیلہ کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ بھوپال شہر اقبال اس لیے اچھا لگا کہ یہ صرف اقبالؔ اور بھوپال کے حوالے سے ایک نادر ونایاب تحقیقی وتنقیدی حیثیت کا حامل ہی نہیں بلکہ بھوپال کے اسلاف واخلاف کی تاریخ پر بھی حاوی ہے۔ لکھنؤ کی ذیلی تہذیب اگر چہ بہت سے شیعہ حضرات کو شائق گزرے مگر اس میں جو تہذیبی حوالوں سے بحث کی گئی ہے وہ خاصے کی چیز ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ شیعہ حضرات ان رواجی او روایتی رسومات میں تبدیلی کرسکیں۔ میں نے عرصہ ہوا ''اثبات عزاداری'' پر موسٰی مار بیں کی کتاب پڑھی تھی، یہ مختصر سا باب اپنی شدت تاثر میں اُس پر فوقیت رکھتا ہے۔۔۔

'معمار پاکستان' میں غیر معمولی جرات مندی کے ساتھ اس امر کا اعادہ کیا گیا ہے کہ پاکستان محض دو ہستیوں کی کوشش وکاوش کے نتیجے میں عمل میں نہیں آیا بلکہ یہ ایک جہد مسلسل کے ذریعہ بنا۔ جو لاکھوں افراد کے خون کی سرخی اور شب وروز کی محنت کا ثمرہ ہے۔ سرسید اور علی گڑھ، مین متنازعہ اور متضاد باتیں ضرور کی گئی ہیں مگر ان سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سرسید کا تعلیمی مشن اور کارکردگی سنہری حروف میں کتاب دل پر رقم رہنا چاہیے۔ وہ یعنی سرسید احساس کمتری کا شکار تھے...... انگریز آقاؤں سے مرعوب تھے...... انھیں انگریزی زبان نہیں آتی تھی...... یہ سب فروعی باتیں ہیں یہ یاد رکھنا بہت ضروری ہے کہ سرسید نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ مخالفت ومخاصمت کے بڑے صدمے سہے ہیں۔ بڑی سختیوں سے گزرے اور حد درجہ

مصیبتوں سے دو چار ہوئے مگر مسلمانوں کی تاریخ کا رخ بدل دیا۔ ان کے شاندار کارنامے ہماری ساری زندگی پر آج بھی حاوی ہیں اور حاوی رہیں گے۔

رامپور کی رضا لائبریری، کا ذکر پڑھ کر یہ احساس ہوا کہ 'خدا بخش لائبریری' کے علاوہ بھی ہندوستان میں اردو کا نادرونایاب کتب خانہ موجود ہے۔ نہ جانے ایسے کتنے ہی کتب خانے پردہ فضا میں ہوں 'ہندوستانی جمہوریت' میں مسلمانوں کی اقتصادی حالت اور کارسرکاری مین شمولیت کا ذکر بہت اچھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت روز بروز بہتر ہو رہی ہے۔ رہا ذہنی عصبیت اور فرقہ وارانہ منافرت کا غبار، تو وہ کہاں نہیں ہے؟ ڈاکٹر رفیق زکریا: مجھے اتفاق ہے۔ وہ بہت بڑے اسکالر تھے۔ اُن کی حسب ذیل کتابیں کلاسیک کا درجہ رکھتی ہیں

۱۔ اقبال اور قرآن (Iqbal & Quran)

۲۔ اسلامہ نرغۂ اعدا میں (Islam under Siega)

۳۔ جناح تقسیم ہند کے ذمہ دار (JInnah who Divided India)

مجموعی طور پر اطہر رضوی کا تجزیہ بہت وقیع اور جاندار ہے۔ کتاب کی زبان بڑی رواں دواں اور دلچسپ ہے۔ سب سے عجیب بات یہ ہے کہ کتاب کے موضوعات یا عنوانات مختلف النوع ہوتے ہوئے بھی ان میں ایک طرح کا ربط خاص ہے۔ غالباً یہ بات اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ سفر کے مکانی و زمانی تسلسل سے مختلف النوع موضوعات کو آپس میں اس طرح جوڑ دیا ہے کہ قاری کو احساس ہی نہیں ہونے دیتا کہ وہ علیحدہ علیحدہ موضوعات کا مطالعہ کر رہا ہے۔ یہ تحریر کی بہت بڑی خوبی اور کامیابی کہی جا سکتی ہے۔

آخر میں اُن کی حالیہ کتاب "چہرے باتیں یادیں لوگ' کا ذکر بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ تصنیف گیارہ لوگوں پر مرکوز ہے۔ جس نے اس خوبصورت کتاب کو زندہ جاوید نگار خانہ ہی نہیں بلکہ ایسا آئینہ خانہ بنا دیا ہے جس میں لوگوں کے چہرے، باتیں یادیں رنگا رنگ ہونے

کے باوجود واضح اور صاف وشفاف دکھائی دیتی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان میں کہیں نہ کہیں تھوڑی سے تلخی ضرور پیدا ہوگئی ہے مگر اس کے باوصف تحریروں کے آئینہ میں شخصیتوں کے خدو خال تجلیوں کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ مجھے اس آئینہ خانے میں 'ثریا اور سونیا' اور من موہن شرما بطور خاص پسند آئے کہ یہ دل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔

سب سے آخر میں یہ بھی کیوں نہ کہہ دیا جائے کہ ڈاکٹر شان الحق حقی نے اس دنیا سے جاتے ہوئے بڑے پتے کی بات کہی ہے:

"جناب اطہر رضوی ٹورنٹو میں ایک قطب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا مسکن جو غالب کدہ کے نام سے جانا جاتا ہے شائقین ادب کی زیارت گاہ ہے مگر ان کا اصلی رجحان اسکالر شپ کی طرف ہے انھوں نے دنیا کے بیشتر ممالک کے دورے کئے ہیں اور یہ سیر وسیاحت محض سیر وتماشہ کے لیے نہیں مطالعہ اور مشاہد کی غایت سے کی گئی ہے۔ نتیجے کے طور پر ایسی پر از معلوم اور خرد آفروز کتابیں ان کے قلم سے نکل چکی ہیں جنھوں نے اردو کے علمی سرمایہ میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔

اطہر رضوی صاحب اس تحسین و توصیف کے اس لیے بھی بجا طور پر حقدار ہیں کہ انھوں نے نہ صرف کتابیں ہی لکھیں بلکہ کنیڈا میں حفظ الکبر قریشی کے بعد دوسرا شاندار عالمی مشاعرہ بھی کرایا جس میں پاک وہند کے ممتاز و متقدر شعراء نے شرکت کی۔ انھوں نے اعتراف عظمت وخدمت کے طور پہ جوش، میر تقی میرؔ، غالبؔ اور انیسؔ عالمی سیمینار کرائے جن میں اکابرین ادب نے شرکت کی۔ غالب اکادمی قائم کر کے غالبؔ کی زمینوں میں طرحی مشاعروں کی بنا ڈالی...... اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ انھوں نے اپنی جیب خاص سے کیا محض اس لیے برصغیر سے باہر بھی اردو کی نئی بستیاں قائم ہوں۔ اللہ تعالیٰ انھیں اردو زبان کی اس سے زیادہ خدمت کرنے کا موقع دے۔ آمین

oooOooo

مصنف۔ مورخ۔ منتظم۔ اطہر رضوی

سلطان جمیل نسیم، کراچی، ٹورانٹو

جب دوسری مرتبہ ۱۷/اکتوبر ۲۰۰۱ء کو میں ٹورنٹو کے وسیع و عریض ائرپورٹ پر اترا تو امیگریشن کی فہرست میں شامل تھا۔ میرے بڑے بیٹے جنید نے مجھے، اپنی والدہ، چھوٹے بھائی دانش حسنات اور سب سے چھوٹی بہن غزل ثنا کو اپنی ضمانت و ذمہ داری پر کینیڈا بلایا تھا۔

کینیڈا کے ہوائی اڈے پر اترنے سے پہلے ذہن میں ہزار وسوسے اور اندیشے بے چین کیے ہوئے تھے کیوں کہ ساری دنیا میں گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کی خوفناک خبر اور پھر اس امریکی صدر کا خصوصی طور سے مسلمانوں کو ہدف بنانا اور افغانستان پر بے دریغ بمباری نے دہشت انگیزی کو ذہنوں پر مسلط کر دیا تھا۔ جو مسلمان خصوصاً مشرقِ وسطیٰ اور پاکستان کے رہنے والے امریکا میں جس کرب اور ذہنی اذیت میں مبتلا تھے اس سے اندازہ یہی ہوتا تھا کہ کینیڈا جو امریکا کے اثر میں ہے خدا جانے وہاں ائرپورٹ پر کیا سلوک ہوگا۔ لیکن جس آسانی اور سہولت کے ساتھ ہم تمام مراحل سے گزرے اس نے تمام اندیشے اور وسوسے ختم کر دیئے اور یہ تاثر پیدا کیا کہ کینیڈا ایک خودمختار جمہوری ملک ہے۔

دو چار دن آرام کرنے کے بعد میں نے اپنے تمام کرم فرماؤں کو سلام کرنے کے لیے فون کیا۔ برادرم عروج اختر زیدی نے مجھ سے کہا بھئی اب ملاقات ہونا چاہیے۔ گزشتہ مرتبہ آپ آئے تھے تو ہم ماضی کی فضا میں سانس لیتے رہے تھے اب یہ دیکھنا ہے کہ صورتاً ایک دوسرے میں اس عہد کی کتنی جھلک باقی ہے۔ میں نے عرض کیا۔ حضرت آپ تین چار گھنٹے کی

ڈرائیو کے فاصلے پر ہیں اور مجھے گاڑی چلانا آتا نہیں۔ یہ سن کر عروج صاحب نے کہا۔ میں ٹورنٹو آرہا ہوں۔ کب۔؟ بھئی بات یہ ہے اطہر رضوی ہمارے ایک دوست ہیں ان کی کتاب کا جلسہ ہے۔ آپ بھی وہاں پہنچ جایئے۔

میں نے پھر عرض کیا۔ جان نہ پہچان میں کیسے بن بلائے پہنچ جاؤں۔

جناب عروج اختر زیدی سے بات ہوئے ابھی آدھا گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ یہ اطہر رضوی صاحب کا فون تھا۔ انھوں نے نہایت شائستہ لہجے میں اپنی کتاب ''بلکینیا سے بازنیا تک'' کی تقریب اجراء میں شرکت کی دعوت دی۔ تقریب کے بعد منعقد ہونے والے ''بیادِ غالب'' مشاعرے کا مصرعہ طرح بتایا اور یہ خوش خبری بھی سنائی کہ مشاعرے کی صدارت کے لیے مانٹریال سے حضرت شان الحق حقی بھی تشریف لارہے ہیں۔

گویا چپڑی اور دو دو۔ والی مثل تھی۔

میں نے حامی بھر لی۔ اطہر رضوی صاحب نے تقریب گاہ کا پتا لکھوانے کے بعد میرا پتا معلوم کیا تاکہ دعوت نامہ بذریعہ ڈاک بھی ارسال فرمادیں۔

جب میں تقریب گاہ پہنچا تو ایک نہایت وجیہہ وشکیل، گورے چٹے، خوش لباس و بردبار شخص نے آگے بڑھ کر بہت خوش اخلاقی اور گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ اطہر رضوی۔۔۔ لیجیے اطہر رضوی سے ملاقات کیا ہوئی اس تقریب میں محترم اکرام بریلوی، جناب حمایت علی شاعر، جناب عروج اختری زیدی، جناب ولی عالم شاہین، جناب تسلیم الٰہی زلفی، جناب عابد جعفری، جناب منیر پرویز، جناب رضا، الجبار، جناب کرامت غوری، جناب افتخار حیدر، جناب کلیم ظفر، محترمہ شکیلہ رفیق جناب خالد سہیل، ڈاکٹر شاہد احمد، جناب رشید صدیقی، کرنل انوار احمد، جناب مشکور حسن برنی، محترمہ ثریا خان، جناب انور جعفری اور جناب شاہد ہاشمی وغیرہ سے بھی ملاقات ہوگئی، کسی کے دور سے دیدار ہی ہوئے۔ ہمارے تسلیم الٰہی زلفی تو اس تقریب کی میزبانی کے فرائض بھی انجام دے رہے تھے۔ ٹورنٹو کی ادبی نمائندگی کرنے

والے ایک وسیع حلقے کے ساتھ ادبی ذوق رکھنے والے خواتین وحضرات سے متعارف ہوگیا۔

کتاب کی تقریب اجراء کے بعد جب عشایئے کے لیے وقفہ ہوا تو میں نے مشاعرے میں شریک نہ ہونے پر معذرت طلب کی۔ اطہر رضوی صاحب نے اپنی تازہ ترین تصنیف "تاریخ کا سفر۔ بلکیپیا سے بازنیا تک" عنایت فرمائی۔

گھر پہنچ کر کتاب کی ورق گردانی کی تو یہ ایک نیا ذائقہ لیے ہوئے محسوس ہوئی۔ اول تا آخر نہایت توجہ سے پڑھنے کے بعد احساس ہوا کہ اطہر رضوی فطرتاً سیاح ہیں۔ قدرت نے سیاحت کے مواقع نصیب میں لکھے تو دوسری طرف ذہن رسا بھی عطا فرمایا چنانچہ انھوں نے سیر وسفر میں بھی تلاش وتحقیق کے پہلو نکال لیے پھر جس ماحول اور خاندان میں آنکھ کھولی، پرورش پائی، جو اثرات ذہن پر مرتب ہوئے انھوں نے عقیدے کو یوں سرشت میں گوندھا کہ اسلام کی عظمت رفتہ سے ایک لگاؤ پیدا ہوگیا۔ پھر کراچی یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد مغربی ممالک کی رہائش نے ذہن کو مزید روشن خیالی سے آشنا کیا اور یوں دانائی کے ساتھ ساتھ ماضی کی کرید اور کھوج لگانے کی لگن پیدا ہوگئی۔ تمام ملتیں اجزائے ایماں ہوجانے کے باوجود ظلم سے نفرت واکراہ دلی بھی جزوِ ایماں بن گئی اور ان کے قلب وذہن میں بار بار یہ سوال اٹھنے لگا کہ عروج کی انتہا پر پہنچ جانے کے بعد امت مسلمہ کے تنزل کے اسباب وعلل کیا تھے؟

انسان کی فکر میں اخلاص اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب خلوص مزاج کا حصہ ہو، طینت میں کوئی شر نہ ہو اور جھوٹ وافترا کی جانب فطرتاً لگاؤ نہ ہو۔ اطہر رضوی ایک سچے اور صاف گو آدمی ہیں۔ وہ مروتاً بھی جھوٹ بولنا پسند نہیں کرتے۔ ایسا آدمی صرف سچ لکھتا اور سچ بولتا ہے، یہ پرواہ کیے بغیر کہ اس کی راست گوئی کا انعام محبت وقبولیت سے ملے گا یا سب وشتم سے۔

اطہر رضوی ادب وشاعری کے راستے سے تاریخ کی طرف محض اس لیے آئے ہیں کہ وہ ایک سچے اور کھرے اہل قلم ہیں۔ ادب وشاعری میں خیال آرائی زیادہ کارفرما ہوتی ہے

جب کہ تاریخ میں صرف حقیقی واقعات کا ہی بیان ہوتا ہے۔ اطہر رضوی کو بعض سوالات، عہد حاضر کے ظلم و دہشت انگیزی کے مناظر پریشان کرتے ہیں وہ اپنے مطالعے اور مشاہدے کے پیش نظر جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں یوں تاریخ کے سفر پر نکل جاتے ہیں تب ان کو معلوم ہوتا ہے کہ اقتدار اپنوں میں ہو یا غیروں میں، فساد کی جڑ ہی ہے۔ یہ اقتدار اگر دل میں خواہش مزید کی ہوس پیدا کردے تو ہر حکم ظلم، جبر، دہشت، بربریت اور ناانصافی پر مبنی ہوتا ہے اور دل میں ایمان و انصاف کی روشنی ہو تو پھر عادل و منصف حکمرانوں کے نام تاریخ کے صفحات پر کرنوں کی طرح منور دکھائی دیتے ہیں۔ ورنہ ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔

انبوہِ خواہشات نے پسپا کیا مجھے
میں نے شکست کھائی ہے اپنی سپاہ سے

(صبا اکبر آبادی)

یہ انبوہِ خواہشات ہی افراد و اقوام کے زوال کا سبب اور رسوائی کی وجہ ہوتا ہے۔ اس انبوہ خواہشات کو جس نام سے چاہیں منسوب کردیں۔ اطہر رضوی نے اپنی کتاب ''بلکینیا سے بازنیا تک'' میں تاریخ بھی رقم کی ہے، صورت حال کا حقیقی بیان تحریر کرنے کے لیے مشرقی یورپ کا سفر بھی کیا ہے۔ افراد اور اداروں کے سربراہوں سے مکالمہ بھی کیا ہے اسی لیے کتاب کا ذیلی عنوان ''تاریخ کا سفر'' بھی رکھا ہے، اس کتاب کے آخر میں حسب روایت کتب کی ایک فہرست بھی دی ہے جہاں سے حقائق اخذ کیے ہیں اور ابتداء میں انگریزی کی ایک کہاوت بھی نقل کی ہے۔

IF YOU STEAL FROM ONE WRITER IT IS PLAGIARISM

IF YOU STEAL FROM TWO IT IS RESEARCH

اپنی کتاب ''تاریخ کا سفر۔ بلکینیا سے بازنیا تک'' کے حوالے سے اطہر رضوی کا یہ کہنا بھی ہے کہ:

''اس کتاب پر میں نے وقتاً فوقتاً تین برس لگائے ہیں۔ اس تحقیق کی جستجو مجھے ترکی، ایران اور بازنیا لے گئی۔ توڑانٹو میں بازنیا مسجد (جو جامعہ حسر یوبیگ کہلاتی ہے) کے امام طیب پاسن بیگوچ (Tayib Pasanbegovic)، بازنیا میں پاکستان کے سفیر ڈاکٹر محمد طارق، بازنیا کے عظیم عالم محقق اور دانشور ڈاکٹر انیس کارچ اور بازنیا کے صدر علیا علی عزت بیگوچ سے تبادلہ خیال کا شرف حاصل ہوا اور بلکیپیا، عثمانیہ دور، بازنیا اور کوسووو پر جتنی کتابیں دستیاب ہو سکتی تھیں ان کا مطالعہ کیا۔

اس تصنیف سے قبل میں نے خدا کے منتخب بندے'' لکھی تھی جو عشروں کی تحقیق اور ذاتی مطالعہ کا ماحصل تھا۔ یہ کتاب یہودیوں، اسرائیل اور فلسطینیوں پر اردو میں لکھی ہوئی (جہاں تک مجھے علم ہے) پہلی کتاب تھی۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ پاکستان میں اسے وہ پذیرائی نصیب نہ ہوئی جس کی وہ مستحق تھی۔

زیر بحث کتاب کو میں انگریزی زبان میں زیادہ آسانی سے لکھ سکتا تھا لیکن یہ سوچ کر کہ انگریزی اور مغربی زبانوں میں اس موضوع اور سانحے پر بیسیوں کتابیں تحریر کی جا چکی ہیں، اردو میں ''تحقیقات اور تاثرات'' کے عنوان سے ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی کا ایک مضمون نظر سے گذرا، اس کے علاوہ بدقسمتی سے کوئی معتبر تحریر مجھے نہیں مل سکی۔ اس لیے اس خیال کے مدنظر کہ برصغیر میں بیسویں صدی کے اس انتہائی اہم موضوع پر ایک تحقیقی تحریر سیاسی شعور کے حامل اور سلطنت عثمانیہ سے دلچسپی رکھنے والے قارئین اور سنجیدہ سوچنے اور سمجھنے والے اذہان کے لیے اردو زبان میں فراہم کر رہا ہوں۔ میں نے اپنی تمام تحریروں میں حتی الامکان کوشش یہی کی ہے کہ

میرے اپنے خیالات، جذبات اور نجی تعصبات حق گوئی اور تاریخ کی روح کو مسخ نہ کریں بلکینیا کی تاریخ اور یورپ میں سلطنت عثمانیہ کی داستان نسلی نفرت، مخاصمت اور نزاع کی داستان ہے۔ کوئی دو مصنفین کسی ایک واقعہ یا مسئلے پر صد فیصد اتفاق نہیں کرتے۔ میں نے تاریخی حوالوں ذاتی مشاہدوں اور منتظم اشخاص کے تاثرات کو اعتدال اور منطق کی روشنی میں رکھ کر واقعات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔"

اس تفصیلی اقتباس کے بعد بظاہر "بلکینیا سے بازنیا تک" پر مزید اظہار خیال کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اس کتاب کو آج کل کے رومانی اور افسانوی طرز میں لکھے جانے والے سفرناموں میں شامل ہونے سے صرف اطہر رضوی کے تاریخی شعور واستدلال، تحقیقی محنت وبصیرت اور بے لاگ حقیقت بیانی نے روکے رکھا ہے تو دوسری طرف ایک کھردرا، بے لطف و بے مزا اور غیر دلچسپ طرزِ تحریر نہ ہونے کی وجہ سے اطہر رضوی نے تاریخ نویسی میں ایک طرزِ نو اس طرح ایجاد کی ہے کہ اپنی محنت سے جو مطالعہ کیا، اپنے اسفار سے جو مشاہدہ کشید کیا پھر اپنے خیالات کی گواہی کے لیے بوزنیا کے صدرِ مملکت سے لے کر ٹورنٹو میں بوزنیا کی مسجد کے پیش امام تک سے مکالمہ کرنے کے بعد جو نتائج اخذ کیے، اس خشک تر اور تلخ ترین اور الم انگیز تاریخی بیان میں اپنے فطری ادبی ذوق کے سہارے کہیں بھی پھیکا اور سپاٹ پن پیدا نہیں ہونے دیا یہی وجہ ہے کہ ماضی سے متعلق جملوں کو بھی عہد حاضر سے جوڑ دیا ہے۔

اطہر رضوی نے "بلکینیا سے بازنیا تک" میں تاریخ کا سفر وہاں بھی کیا ہے جہاں مسلمانوں کی عظمت رفتہ (خلافت عثمانیہ) کے ستون عدل و انصاف، رواداری، مساوات، اخلاقیات اور حسن سلوک کی بنیادوں پر قائم رہے ہیں یا ظلم وتعدی کی مثال بنے ہیں اور جہاں مسلمانوں یا امت مسلمہ پر ظلم و جبر، خوف ودہشت، بربریت وخوں ریزی کے سیاہ بادل

چھائے ہیں وہاں بھی ان کے مطالعہ اور مشاہدے کا سفر جاری رہا ہے۔ اطہر رضوی نے بین السطور اپنی اس کتاب میں یہ پیغام بھی دیا ہے کہ ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں اور ناؤ کاغذ کی سدا چلتی نہیں۔ ظالم کو اگر اس کے عہد میں کوئی سزا نہیں ملتی تو اُس کو تاریخ عبرت ناک سزا دیتی ہے۔ حالانکہ ظالم اپنے ظلم کے نشے میں اتنا مدہوش ہوتا ہے کہ اُسے اپنا ظلم عین انصاف اور ناانصافی عدل و کامرانی محسوس ہوتی ہے۔ اطہر رضوی صاحب حساس اہل قلم ہونے کے ساتھ ساتھ عقیدتاً مسلمان بھی ہیں اور ان سے گاہے ماہے ملاقاتوں میں یہ تاثر بھی قائم ہوا ہے کہ وہ جذباتی اور اس حد تک صاف گو ہیں کہ جو کچھ ان کے دل میں ہوتا ہے اس کا اظہار زبانی بھی ہو جاتا ہے اور زبان قلم سے بھی — اس کتاب کے سلسلے میں انھوں نے بوزنیا میں روا رکھے جانے والے بہیمانہ ظلم سے مکمل آگاہی حاصل کرنے کے لیے محض صحافیانہ رپورٹوں یا سنی سنائی باتوں پر کامل اکتفا نہیں کیا بلکہ خود اس خطہ ارض کا سفر کرنے کی ٹھانی جہاں انسانیت منہ چھپائے پناہ کی متلاشی تھی۔ اور فطری جذبات کے اظہار پر قابو رکھتے ہوئے حقائق تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اطہر رضوی کی کتاب "بالکینیا سے بازنیا تک" (مطبوعہ ۲۰۰۱ء) سے قبل ان کی جو اور کتب شائع ہو چکی ہیں ان کا بھی تذکرہ کر دیا جائے۔

۱۔ خدا کے منتخب بندے (1998ء)

۲۔ ہر ملک ملک ماست (1998ء)

۳۔ غالب۔ عالمی سیمینار (1998ء)

۴۔ میر تقی میر عالمی سیمینار (2000ء)

۵۔ یاد کے موتی (شعری مجموعہ)

۶۔ بیادِ غالب (غالب کے مصرعہ ہائے طرح پر منعقد کیے ہوئے مشاعروں کا انتخاب)

آخر الذکر دو کتابیں میری نظر سے نہیں گذریں پھر بھی یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ مصنف/ مؤلف کی نظر میں یوں تو اس کی تمام ہی کتابیں قابل قدر اور قابل ذکر ہوتی ہیں لیکن وہ کتابیں جن سے اطہر رضوی کی انتھک محنت کا اظہار ہوتا ہے وہ ''خدا کے منتخب بندے'' اور ''بالکیا سے بازنیا تک'' ہیں۔ اور اب ان کی آٹھویں کتاب عالمی دہشت گردی کے موضوع پر شائع ہورہی ہے، اس کتاب کی تیاری میں بھی اطہر رضوی نے نہایت عرق ریزی سے کام لیا ہے اس طرح تصانیف و تالیفات کی تعداد کے اعتبار سے ان کا شمار کینیڈا میں مقیم جناب شان الحق حقی اور جناب اکرام بریلوی کے بعد کیا جاسکتا ہے، ممکن ہے کوئی اور بھی کنیڈا میں ایسا مصنف ہو جس کی کتابوں کی تعداد ان تین حضرات سے بھی زیادہ ہو، وہ میرے علم میں نہیں ہے۔ میں نے جب ان کی ایک اور اہم کتاب ''خدا کے منتخب بندے'' پڑھی تو اندازہ ہوا کہ اپنے موضوع کی اس اچھوتی اور مختصر کتاب کو جس محنت اور جانفشانی کے ساتھ سینکڑوں کتابیں کھنگالنے کے بعد تحریر کیا گیا ہے یہ موضوع اردو زبان میں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ یہ کتاب آغاز سے اختتام تک غور وفکر کی دعوت دیتی ہے۔ اطہر رضوی نے بہت سوچ سمجھ کر اس کتاب کو ''سوچنے اور سمجھنے والے اذہان کے نام'' معنون کیا ہے۔

دوسرے صفحے پر علامہ اقبال کا یہ شعر درج ہے۔

تری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے

ایک صفحے پر دس افراد کی تصاویر دی گئی ہیں جن کا عنوان ہے WANTED اور ان تصاویر کے نیچے لکھا ہے—

''اسکاٹ لینڈ یارڈ نے فلسطینی حکومت کی جانب سے اپنے ملک کے خطرناک ترین مجرموں کی فہرست اور ان کی گرفتاری پر انعام کے اشتہار سارے فلسطین اور انگلستان میں لگوائے۔ مناخم بگین کا نام سرفہرست ہے۔''

اطہر رضوی اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

''۔مجھے صیہونیوں کے وسائل، ذرائع، رسوخ اور CLOUT اور ان کی پوشیدہ خبر رسانی کے جال کا پورا علم ہے۔ دراصل اس کتاب کی تصنیف غائیت اسی چھپی ہوئی طاقت کا انکشاف ہے۔''

پھر آگے چل کر رقم طراز ہیں۔

—''ہر شخص کے پوشیدہ، نجی تعصبات (PRIVATE BIASES) ہوتے ہیں، یہ انسانی فطرت ہے۔ میں نے اپنی تحریروں میں حتی الامکان کوشش کی ہے کہ میں اپنے تاثرات کو تاریخ کی صحت پر ترجیح نہ دوں۔ ہر ممکنہ تلخ یا خوشگوار واقعہ کے تعلق سے جو میرے علم میں آیا میں نے اپنی ذہنی تربیت، سوجھ بوجھ اور فلسفے کی روشنی میں سوچا اور ایک رائے قائم کی۔''

''مجھے اگر صیہونیوں سے (عام یہودیوں سے نہیں) کوئی بغض یا شکایت ہے تو وہ صرف اس لیے نہیں ہے کہ انھوں نے ایک اجنبی زمین پر دنیا کے چار کونوں سے آکر اس پر قبضہ کرلیا ارو وہاں کے صدیوں کے رہنے والے باشندوں کو باہر نکال پھینکا۔ مجھے زیادہ گلہ اس بات کا ہے کہ انھوں نے اپنی شاطرانہ فراست سے مغرب کے دماغ اور ذہن کو ایسا مفلوج یا منجمد کردیا ہے کہ اس میں اس سلسلے پر عاقلانہ (Rationality) تدبیر کی صلاحیت تقریباً ختم ہوچکی ہے۔''

''خدا کے منتخب بندے'' سے جو مذکورہ اقتباسات آپ نے پڑھے۔

افغانستان سے لے کر عراق تک کی تمام ''جنگی حکمت عملی'' ساری دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ دنیا بھر کے کروڑوں افراد نے امن کے حق اور دہشت گردی کے خلاف نعرے لگائے، احتیاج کیے— یہ مظاہرے اس ذہنیت کے خلاف تھے جس نے بڑی طاقت

اور اس کے اتحادیوں کو تارِ عنکبوت کی طرح اپنے جال میں جکڑ رہا ہے— یہ نام نہاد اتحادی" صیہونی ذہن کے غلام بن کر ایک روبوٹ کی طرح اس کے احکام پر عمل کرتے رہے ہیں۔ افغانستان اور عراق کے واقعات تو ابھی دو تین برس کے ہیں لیکن فلسطین میں اسرائیل کی انسانیت سوز سرگرمیاں تو نصف صدی سے جاری ہیں۔ ان انصاف پسند اتحادیوں کو صرف ہنود و یہود کو تقویت پہنچانا ہی اپنا منصب قرار دے رکھا ہے نہ کشمیر کا مسئلہ حل ہوتا ہے نہ فلسطین کا۔ اطہر رضوی نے اس چھپی ہوئی طاقت کو بے نقاب کیا ہے جو صیہونیت کا نقاب ڈالے ہوئے ہے۔ ''خدا کے منتخب بندے'' کے بارے میں خود اطہر رضوی کی تحریر کے اقتباس سے آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ وہ کس موضوع پر ہے اور اس کو معرضِ تحریر میں لانے کے لیے مصنف کو کتنی محنت کرنا پڑی ہے۔

دنیا میں اس بات کا سب ہی کو علم ہے کہ جو طبقہ یا گروہ جتنا چھوٹا ہوتا ہے اتنا ہی مربوط اور مضبوط اور منظم ہوتا ہے۔

یہودیوں کا شمار دنیا کی قدیم اور معزول و مغضوب قوم میں ہوتا رہا ہے۔ لیکن جب بحیثیت قوم انھوں نے یہ طے کرلیا کہ انھیں بڑی اقوام کے چنگل اور دستبرد سے نجات حاصل کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی لائحہ عمل اختیار کرنا پڑے گا تو انھوں نے اپنی ترجیحات میں دو باتوں کو اولیت دی اور ان دونوں پر ہر طرح اور ہر طریقے سے عمل کیا۔ پہلی ترجیح انھوں نے تعلیم کو دی۔ اور دوسری تجارت کو۔ اس عمل میں انھیں ایک صدی کام کرنا پڑا ہو یا دس صدیاں۔ آج نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ جدید تعلیم کے کسی بھی اہم موضوع کو دیکھ لیجیے اس کا موجد یا معلم یہودی ہوگا۔ اسی طرح کسی بھی بڑے تجارتی ادارے کو لے لیجیے اس کا سربراہ بھی آپ کو یہودی ملے گا۔

''خدا کے منتخب بندے'' میں اطہر رضوی نے یہودیوں کی تاریخ تنظیم اور طریقہ کار کو بہت ہی واضح طور سے بیان کیا ہے۔ اور بغیر کسی لاگ لپٹ کے یہ بات لکھ دی ہے کہ موجودہ

زمانے کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک براعظم امریکا کی ریاستوں یعنی یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکا کی پالیسیوں پر یہودی کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔

میں اپنے بارے میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ ''تاریخ'' خصوصی طور پر میرا مضمون نہیں رہا ہے۔ چنانچہ اطہر رضوی کی تاریخی اہمیت کی کتابوں کی چھان بین کے لیے اس موضوع کے ماہرین اپنی رائے دے سکتے ہیں۔ میں تو صرف ان کی کتاب کے تعلق سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ موضوع کا انتخاب کرنے کے بعد اطہر رضوی کینیڈا کی لائبریریوں اور اپنے واقف کاروں کے پاس موجود کتابوں کو پڑھتے ہیں۔ نوٹس تیار کرتے ہیں اور پھر اس موضوع کو اردو میں لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہمارے عبد القوی ضیا صاحب، اللہ اُن کے درجات بلند کرے۔ حیدر آباد سندھ کے سٹی آرٹس کالج میں تاریخ پڑھاتے تھے۔ اور 1955ء میں یا اس سے ایک دو سال پہلے ان کی ایک ضخیم کتاب ''تاریخ اندلس'' شائع ہوئی تھی۔ میں نے وہ کتاب اسی زمانے میں دیکھی تھی۔ تاریخ کے حوالے سے کتاب لکھنے کے لیے جو انداز اختیار کرنا پڑتا ہے وہی انداز ''تاریخ اندلس'' کا تھا۔ لیکن بلکیبیا سے بازنیا تک'' یا ''ہر ملک ملک ماست'' میں شامل تاریخ پر مبنی مضامین میں اطہر رضوی نے اپنے مشاہدے کو بھی شامل کیا ہے اور جو کچھ اپنی فہم و شعور کے مطابق درست سمجھا ہے وہ بیان کیا ہے یوں اطہر رضوی کی کتابیں تاریخ کی کتابوں سے مختلف نظر آتی ہیں اور اگر تاریخ داں برا نہ مانیں تو یہ بھی لکھ دوں کہ مختلف ہونے کے ساتھ ممتاز بھی ہیں۔ اس کی وجہ جو میں پہلے عرض بھی کر چکا ہوں یہی ہے کہ اطہر رضوی نے کتابیں لکھتے وقت کسی مصلحت کو پیش نظر رکھنے کے بجائے حقیقت اور سچائی کو سامنے رکھا ہے۔ یہی سبب ہے کہ خشک تر، تلخ تر حقیقتوں کے بیان میں اطہر رضوی نے کسی مصلحت، خوف اور اندیشے کو اپنی تحریر کی راہ میں سنگ گراں نہیں بننے دیا بلکہ اپنے مزاج اور اپنی ذات کی تمام تر صاف گوئی شگفتہ نگاری اور حقیقت بیانی کے جوہر کو نمایاں کیا ہے۔ ممکن ہے بعض پڑھنے والوں کو ''خدا کے منتخب بندے'' کا اندازِ تحریر خشک اور بے لطف محسوس ہو لیکن

دیکھنا یہ چاہیے کہ جو بھی اس کتاب کا اندازِ نگارش ہے وہ اپنے موضوع سے بالکل پیوست ہے۔ اُس میں کہیں جھول نہیں ہے۔ اس کتاب کے برعکس ''ہر ملک ملک ماست'' کے مختصر مضامین، تاریخی حقائق کے دوش پر اطہر رضوی کے گہرے مشاہدے کو سنبھالے ہوئے ہیں اور ساتھ ساتھ ادبی چاشنی بھی رکھتے ہیں۔

میں نے اطہر رضوی کو کا یک محنتی مصنف کہا ہے۔ اس کا ایک پہلو جہاں یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تحقیقی اور تاریخی نوعیت کی کتابوں کی تصنیف سے قبل متعلقہ ممالک کا سفر کرکے حالات کا جائزہ لیا۔ وہاں لوگوں سے جو بھی معلومات حاصل ہوسکتی تھیں وہ اکٹھا کیں۔ اور پھر مغربی مصنفین کی کتابوں کے سفر پر نکل گئے۔ اپنے موضوع اور مطلب کا جو مواد نظر آیا اس کو اپنے طور پر قبول کرکے معرض تحریر میں لے آئے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ خوبی بھی ان کی تحریر میں نظر آئی کہ وہ نظریہ سازی سے دور ہی دور رہے۔ اپنے مسلک کے خلاف بھی اگر ان کے ذہن نے کسی حقیقت کو قبول کیا تو وہ بھی انھوں نے اپنی تحریر میں سمودیا۔

دوسرا پہلو اُن کی محنت کا یہ ہے کہ اپنے ادبی ورثے کی حفاظت کرنے کے ساتھ ساتھ، کنیڈا میں مقیم عام لوگوں سے روشناس کرانے کے لیے انھوں نے جوش، محمد تقی میرؔ۔ اسد اللہ خاں غالبؔ اور میر ببر علی انیسؔ کے حوالے سے عظیم الشان اجتماع منعقد کیے۔ عہد حاضر میں ادب کے وہ اکابر۔ جو میرؔ، غالبؔ اور انیسؔ کے کام سے واقف، رتبے سے آگاہ اور مقتدرہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ اُن کو پاکستان و ہندوستان اور انگلستان سے کنیڈا بلاکر مقالے پڑھوانا۔ اور پھر ان تمام مقالوں کو کتابی صورت میں محفوظ کردینا، آسان کام نہیں ہے۔ لیکن اس محنت طلب کام کو بھی انھوں نے نہایت خوش اسلوبی اور سلیقے سے انجام دیا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ اطہر رضوی نے اتنی محنت کیوں کی ہے۔

کیا صرف مسلمانوں پر ہونے والے مظالم پر دنیا کو متوجہ کرنے کے لیے۔؟ نہیں۔ اگر یہ مقصد ہوتا تو بقول خود وہ یہ کتابیں آسانی کے ساتھ انگریزی زبان میں تحریر کرسکتے تھے۔

کوئی مصور تصویر کیوں بناتا ہے۔ شاعر شعر کیوں لکھتا ہے۔ افسانہ نگار افسانہ کس لیے تحریر کرتا ہے۔؟ اپنی فکر، اپنے خیال، اپنے جذبات کے اظہار کے لیے اور اپنے اور اپنے خیال میں دوسروں کو شریک کرنے کے لیے، اسے خودنمائی بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہ اگر خودنمائی ہے تو اس میں محمد تقی میر بھی مبتلا تھے کہ آگرہ (اکبر آباد) سے دہلی اور دہلی سے لکھنؤ تک کا سفر کیا۔ غالب بھی اسی خودنمائی کا شکار تھے کہ تازہ غزل کہنے کے بعد اپنے دوستوں اور شاگردوں کو بھیجتے تھے۔ انیس بھی خودنمائی کے شوقین تھے کہ مرثیہ کہنے کے بعد مجلس میں سناتے تھے۔

پھر اطہر رضوی موردِ الزام کیوں گردانے جائیں۔ وہ دراصل اردو کے شیدائی ہیں اس لیے ادب کو اپنایا ہے۔ وہ اسلام کو اپنا دین سمجھتے ہیں اس لیے جہاں جہاں بھی مسلم قوم کسی بھی انداز سے بدحالی، بدنظمی کا شکار ہے، اس کے بارے میں جستجو کر کے کتابیں تحریر کرتے ہیں۔ یہ بات میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ اطہر رضوی کنیڈا کی فعال ادبی شخصیتوں میں سب سے نمایاں ہیں! اپنی کتابوں کو تالیف و تصنیف کرتے ہوئے کہیں کہیں اگر اطہر رضوی کے لہجے میں تلخی درآئی ہے تو یہ ان کے مزاج کی صاف گوئی کا اظہار ہے۔

ہم اگر اپنے ماحول اور اپنے اطراف نظر ڈالیں تو محسوس کریں گے کہ عمومی برائی اور خامی سے کوئی شخص بھی مبرا نہیں ہے۔ اطہر رضوی بھی آج کے زمانے کے آدمی ہیں۔ میں ان کی ذاتی خرابیوں اور خوبیوں کے بارے میں کوئی بات بھی حتمی طور سے نہیں کہہ سکتا کہ مجھے ان سے ذاتی طور پر کوئی اچھا یا برا تجربہ نہیں ہوا ہے۔ البتہ یہ ضرور سننے میں آیا ہے کہ ان کی صاف گوئی کبھی کبھی مخاطب کی دل شکنی اور برہمی کا باعث بھی ہو جاتی ہے یہ میرے خیال میں اس بات کی گواہ ہے کہ اطہر رضوی کسی بات کو دل میں رکھنے کے قائل نہیں ہیں۔ میں نے یہ دیکھا کہ وہ جس شخص کی جس خوبی سے بھی متاثر ہو جاتے ہیں اس کی تعریف میں بے اندازہ مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں اس لیے یہ بات سمجھ میں آتی ہیں کہ وہ جس سے برہم یا ناراض

ہوتے ہوں گے وہاں بھی مبالغہ آرائی ساتھ نہیں چھوڑتی ہوگی۔ اور پھر بقول غالبؔ

ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے؟

اس لیے اطہر رضوی کی ذاتی خامیوں کے تذکرے سے قطع نظر کرتے ہوئے ان اس خوبی کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ کینیڈا کی فعال ادبی شخصیتوں میں سب سے نمایاں ہیں۔ ان کو اردو اور پاکستان سے محبت ہے۔ جب بھی پاکستان میں کوئی اہم واقعہ، حادثہ یا سانحہ ہوتا ہے۔ وہ دل گرفتہ وملول نظر آتے ہیں اور اپنے جذبات کے اظہار کے لیے شاعری کا سہارا لیتے ہیں۔ اسی طرح شمالی امریکا میں برسوں سے رہنے کے باوجود کوشش یہی کرتے ہیں کہ اردو بولتے وقت کسی دوسری زبان خاص طور سے انگریزی کا کوئی لفظ استعمال نہ کریں۔ ان کی رہائش ٹورنٹو کے جس علاقے میں ہے اُس محلے کا نام HIDDEN VALLEY ہے لیکن وہ اپنے تعارفی کارڈ تک میں اسے ''پوشیدہ وادی'' لکھتے ہیں۔ اللہ کرے ذوقِ محبت اور زیادہ۔

اطہر رضوی کی تحریریں

عبداللہ جاوید، مسی ساگا، کناڈا

اطہر رضوی کی کتابیں جس طرح شائع ہو رہی ہیں اور وہ بھی تسلسل کے ساتھ، اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہیں کہ وہ ٹی وی دیکھنے، شطرنج، تاش یا گولف وغیرہ کھیلنے سے قریب قریب بچ گئے لیکن ان سب سے زیادہ خطرناک مرض یا علت قرطاس وقلم سے اپنے آپ کو بچا نہ سکے۔

وہم کا علاج کہتے ہیں لقمان حکیم کے پاس نہیں تھا لیکن آج گلی گلی ماہران نفسیات کے پاس موجود ہے۔ اسی طرح مرض عشق کا علاج میر صاحب کو میسر نہ ہوا ہو اور فراق تک پہنچتے پہنچتے آگ سے مبدل ہو گیا ہو۔

بھاگ بلائے عشق سے بھاگ ناداں! آگ ہے، آگ ہے، آگ

عصر نو کے تانترکوں اور عاملوں کے جنتروں، منتروں اور تعویذ گنڈوں گے زیر اثر نہ صرف شفایابی کے قابل قرار پا چکا ہے بلکہ کچی عمر کے لڑکے لڑکیوں سے لے کر بوڑھے بوڑھیوں تک کی دسترس میں دکھائی دیتا ہے۔ لیکن قرطاس وقلم کی عِلّت یا مرض جو کچھ بھی وہ ہے، ہنوز لاعلاج ہے۔ بعض اوقات کسی کسی کی یہ مرض اس شدت سے پکڑتا ہے کہ وہ مرزا غالب کی طرح صریر خامہ (کاغذ پہ قلم چلنے کی آواز) کو نوائے سروش، غیب کی آواز خیال کر کے، ہونے کو نہ ہونا اور ہستی کو نیستی کہنے لگتا ہے۔ ہمارے اطہر رضوی کو اس مرض نے اس شدت سے نہیں پکڑا، جس شدت سے غالب کو پکڑا تھا کیوں کہ وہ خیر سے، آخری خبریں آنے تک

باہوش وحواس ہیں۔ کبھی کبھی کاغذ پر بال پین کی رگڑ کی آواز سن لیتے ہیں تو فوری طور پر یا تو کاغذ دوسرا استعمال کرنے لگتے ہیں یا پین تا کہ صریر خامہ کے کسی بھی غیر اعلانیہ حملے سے خود کو محفوظ کرلیں۔ ان کی کتابوں میں مضامین تو ہوتے ہیں لیکن غیب سے آئے ہوئے نہیں ہوتے۔ وہ اپنے مضامین مشاہدہ خودلاتے اور بقلم خود لکھتے۔ بعض اوقات ان مضامین کی صداقت کو جانچنے کے لیے سفر کرتے ہیں۔ متعلقہ مقامات کا معائنہ اور عینی مشاہدہ بھی کرتے ہیں، وہاں ذاتی طور پر تحقیق وجستجو کرتے ہیں، ذاتی طور پر کے اس بنیادی محرک کو آپ نے نظر انداز کیا تو گویا آپ نے اپنے اور اطہر رضوی کے درمیان ایک دیوار کھڑی کرلی۔ اطہر رضوی کی کتابوں کو اردو ادب کے کسی شعبے یا شعبے سے آگے بڑھ کر کسی صنف میں سمونا ایسی کھیر بن گیا ہے کہ جو ٹیڑھی ہے لیکن میں نے دیکھا ہے کہ نہ تو اطہر رضوی کی کتابیں ٹیڑھی ہیں اور نہ ہی کھیر ٹیڑھی ہے۔ یوں بھی محترم قارئین آپ مجھ سے کامل اتفاق کریں گے کہ کھیر کی پتیلی یا پیالے کو ٹیڑھا کیا جاسکتا ہے لیکن گھر کو ٹیڑھا نہیں کیا جاسکتا اصل معاملہ یہ ہے کہ جناب اطہر رضوی نے خود ہی اپنی تصانیف میں سے کسی کو کچھ اور کسی کو کچھ کہہ کر پکارلیا ہے یا اشارے کنائے کئے ہیں بس پھر کیا تھا اللہ دے اور بندہ لے چند بوجھ بجھکڑ تبصرہ نگار پیمائشی فیتے، محدب عدسے اور جانے کیا کیا اٹھالائے اور اپنے اپنے طور پر ان کی کتاب سفرنامے کے سانچے میں فلاں کتاب تحقیق کے اور فلاں کتاب سفرنامے کے سانچے میں فلاں کتاب تحقیق کے اور فلاں تاریخ کے چوکھٹے میں ٹھیک ٹھیک نہیں سمارہی ہے مجھ طالب علم پڑھنے والے کے خیال میں اطہر رضوی کی کتابوں کو آج کی اصطلاح کے مطابق 'نان فکشن' غیر افسانوی کتابوں میں شمار کیا جانا چاہیے۔

آج کی دنیا اور آج کے دور میں کتابی تمدن کے عام زوال سے عہدہ برآ ہونے اور اس کی ترقی کی خاطر مغربی دنیا میں نان فکشن کتابوں کی اشاعت پر زور دیا جانے لگا اور اس طرح ایک بار پھر کتاب سے بیزار نسلوں کو کتابوں کی جانب رجوع کرنے میں کامیابی حاصل کی گئی۔ اصناف ادب کی قیود اور حدود میں لچک پیدا کی گئی اور ورائٹی (تنوع) پر ترجیحی اصرار کیا جانے لگا آج کی

سفر نامے کی کتاب، سفر نامہ ہونے کے علاوہ بھی بہت کچھ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا آج کے سفر نامے میں سفر کم اور 'نامہ' زیادہ ہوتا ہے۔ جناب اطہر رضوی جانے انجانے آج کی اردو دنیا کے ایک کامیاب "نان فکشن" لکھک (رائٹر) ہیں۔ میں جب اطہر رضوی کو اپنی نظروں کے سامنے چلتا پھرتا دیکھتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں یہ آدمی جو اتنا ٹھوس لگتا ہے اصناف ادب اور ان کے سانچوں کے معاملے میں اتنا سیال کیسے ہوسکتا ہے۔ اور اس کی تحریروں میں اتنا زیادہ تنوع کس طرح آجاتا ہے کہ وہ کسی مروجہ سانچے میں ٹھیک نہیں سماتیں۔ اب اس معاملے کو اس زاویے سے دیکھیں جس کی جانب میں نے اوپر توجہ دلائی ہے۔ ان کی کتاب "کون عبث بدنام ہوا" پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ یہ کتاب اس لائق تھی کہ اس کو اردو حلقوں اور پاکستان میں داد و تحسین سے نوازا جاتا۔ اس کا فوری طور پر انگریزی زبان میں ترجمہ کروایا جانا چاہیے تھا۔ اس کتاب میں دہشت گردی کے موضوع کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں کسی قسم کی جلد بازی کا ارتکاب نہیں کیا گیا ہے۔ اردو اور انگریزی میں جو دوسری کتابیں دہشت گردی کے موضوع پر لکھی گئیں ان کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاید دہشت کی وحشت ان کے لکھنے والوں پر حاوی ہوگئی تھی۔ اس کتاب میں جیسا کہ کتاب کے گرد پوش یا گرد پوش پر تحریر ہے۔ دہشت گردی کا پس منظر۔ جواز۔ اور تجزیہ اس رسان سے پیش کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا حیران رہ جاتا ہے اس سے قبل میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ اس کتاب میں دہشت گردی کے موضوع کا احاطہ کیا گیا ہے یہاں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ احاطہ ضرورت سے کہیں زیادہ وسیع بھی ہے اور ہمہ گیر بھی۔ اس وسعت اور ہمہ گیریت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ موضوع کے پس منظر کو اجاگر کرنے کے لیے مصنف نے قریباً اٹھارہ ثانوی عنوان قائم کیے گیارہ ذیلی عنوانات کے تحت جواز کے پس منظر کے تحت مصنف نے انسانی تہذیبیں، کے ثانوی عنوان سے بات شروع کی۔ یہ ایک جرأت رندانہ ہی کہی جائے گی۔ یہ اتنا اہم اور بڑا موضوع ہے کہ اس پر لکھنے کے لیے برسوں کی ریاضت اور جہازی سائز کی ایک سے زائد کتابوں کی ضخامت درکار ہوگی۔

اطہر رضوی نے صرف دس صفحات کے اندر اس موضوع سے گتھم گتھا اور اُکھاڑ پچھاڑ کر دکھائی ہے۔ قیاس کیا جانا چاہیے کہ موضوع تو موضوع خود اطہر رضوی کا کیا حال ہوا ہوگا۔ اگر اُن کی اسلوبی سیالیت کا مشاہدہ کرنے کی ضرورت پیش آئے تو ان دس صفحات سے ہوسکتا ہے۔ اس کتاب سے رخصت ہونے سے قبل یہ کہنا ضروری ہے کہ مصنف نے رسمی اور مصنوعی توازن پر توجہ نہیں دی ہے۔ اس کے برخلاف اس موضوع پر جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں سے بیشتر میں شعوری طور پر توازن برقرار رکھنے کی کوشش صاف طور پر آشکار ہوتی ہے۔ (دو ایک کتابیں قطعی ایک طرفہ بھی مل جائیں گی) اطہر رضوی کی کتاب میں ایک لائق ستائش صفت ملتی ہے کہ ان کا انداز بڑی حد تک معروضی ہے۔ ایک مسلم لیکھک کے طور پر اس حساس اور نازک موضوع پر تھوڑی بہت موضوعیت کا مظاہرہ کرنا اگرچہ فطری امر ہے لیکن اس سے کتاب کی معروضیت کا مجموعی تاثر مجروح نہیں ہوتا۔

جب آج کا مشہور نقاد جو اپنے آپ کو سرگزشتی نقاد (بایو کریٹک Bio Critic) کہتا ہے، ہیرولڈ بلوم یہ فقرہ لکھتا ہے "قلم کار میں The work in the writer تو میں اس سے اتفاق کرنے میں مشکل محسوس کرتا ہوں کہ کیوں کہ آج کے دور میں نہ تو سرگزشت لائق اعتبار ہے اور نہ ہی خودنوشت۔ کسی اور سے اپنی ستائش لکھوائی جائے تو سرگزشت اور اپنی آپ ستائش کی جائے تو خودنوشت تخلیق ہوتی ہے۔ سرگزشت کو پر بیتی اور خودنوشت کو آپ بیتی کہتے ہیں۔ یاپ بیتی جو آپ بیتی کے نطفۂ ناتحقیق سے پیدا ہوتی ہے (اگرچہ اردو میں زیادہ عام نہیں) ایسی تصنیف یا تالیف ہے جس کا مصنف یا مولف اپنے کپڑے بیچ چوراہے پر اتارنے کے ساتھ اپنے وقت کے اکابرین ادب کے کپڑے بھی اتار دیتا ہے۔ ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ جب ہیرولڈ بلوم یہ کہتا ہے "مصنف یا قلم کار کسی نہ کسی طور سے اپنی کتاب میں ہے "The writer somehow is in the work تو میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔ کون عبث بدنام ہوا میں" اطہر رضوی کو میرے علاوہ میرے بیشتر پڑھنے والوں نے موجود پایا ہوگا لیکن میں یہ

مناسب سمجھ رہا ہوں کہ ان کی کتاب ''گر ہم برا نہ مانیں'' میں ان کی ایک آدھ جھلک اور دیکھ لی جائے کیوں کہ جلد ہی ہمیں ان کی اس کتاب سے واسطہ پڑنے والا ہے جس میں اطہر رضوی نے اپنے چند ہم عصروں کی جھلک دکھائی ہے۔

اردو میں ''نان فکشن'' کتابوں کا رواج نہ ہونے کے برابر ہے جب کہ انگریزی اور دوسری زبانوں (شمول ہندی) میں ان کی گرم بازاری ہے۔ اطہر رضوی کی کتاب ''گر ہم برا نہ مانیں'' اپنے عنوان ہی سے قاری کو چونکا کر اپنی ورق گردانی پر مائل کر دیتی ہے''گر تو برا نہ مانے'' کے معروف فقرے کو''گر ہم برا نہ مانیں'' میں بدل کر اطہر رضوی نے کتاب کو پرکشش بنالیا ہے۔ یہ ایک کثیر جہتی تصنیف ہے نہ تو اس کا موضوع ایک ہے اور نہ ہی اس کی صنف ہی ایک ہے۔ سفرنامہ ہے لیکن سفرنامے کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ تاریخ بھی ہے اور نہیں بھی۔ تحقیق کی کتاب ہے۔ نہیں بھی ہے۔ ان سب کے علاوہ مجموعہ مضامین بھی ہے۔ الغرض مصنف نے نثری تخلیق کے مروجہ سانچوں سے مکمل آگاہی کے باوجود اپنے قلم کو کسی ایک سانچے کے حوالے سے باز رکھا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ قاری بوریت، بیزاری یا تھکن کا شکار نہیں ہوتا۔ اس کتاب میں یکسانیت نام کی چیز نہیں ملتی۔ نہ صرف کتاب کے ابواب میں تلون اور تنوع ہے بلکہ پیراگراف دو پیراگراف۔ سطر در سطر قاری کے مطالعے کا ذائقہ بدلتا چلا جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اطہر رضوی قاری کو کتاب سے چپکائے رکھنے کے ہتھیاروں سے پوری طرح لیس ہو کر تصنیف و تالیف کے میدان میں اترے ہیں۔

''گر ہم برا نہ مانے'' کے بعد اطہر رضوی کی تازہ قلمی واردات''چہرے باتیں، یادیں، لوگ''، قلمی خاکوں کی کتاب ہے۔ کتاب کے دیباچہ نگار پروفیسر سحر انصاری نے ان نثری تحریروں کو خاکے، مضامین، کوائف یعنی تینوں اصناف کا مجموعہ قرار دیا ہے۔ اطہر رضوی نے سرحرف'' کے تحت لکھا ہے''آندرے ژید جب یہ کہتا ہے کہ کتاب ایک شراکت کا نام ہے۔ اس کی قدر و قیمت جتنی بڑھتی جائے گی اتنا ہی اس کے مصنف کا عمل دخل کم ہوتا جائے گا تو

اس کے نظریے کی روشنی میں میرا کسی قسم کا معروضہ لایعنی ہوگا۔ میں نے اس نکتے پر سنجیدگی سے سوچا ہے۔ جناب اطہر رضوی خاصی پختہ عمر کے آدمی ہیں ان کی تحریروں اور باتوں سے ذہنی پختگی اور بالغ نظری ہویدا ہوتی ہے بڑی عمر کے باوجود وہ ہمہ وقت کچھ نہ کچھ سیکھنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ایسے آدمی کے بارے میں یہ قیاس کرلینا کہ وہ خاکے، کے صنفی لوازمات سے بے بہرہ ہوسکتا ہے کس طرح درست ہوسکتا ہے۔ کسی بھی صنف ادب پر تھوڑا بہت پڑھ لینا اور ضروری معلومات بہم کرنا کونسا مشکل کام ہے۔ معمولی سی کتب بینی سے ایسا ممکن ہے اور جب لکھنا ہی ٹھہرا تو قدرے تفصیلی مطالعے کا خیال آنا لازمی ہے۔ کسی بھی صنف سے تفصیلی آگاہی کے بغیر اطہر رضوی جیسا پختہ عمر اور بالغ نظر قلم کار کس طرح کچھ لکھ سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب ظاہر ہے کہ یہی ہوگا کہ ایسا قرین قیاس نہیں۔ اب ہم اپنے بنیادی سوال کا جواب دینے کے مرحلے تک پہنچ رہے ہیں اور وہ جواب یہ ہے کہ جو کچھ اطہر رضوی نے کیا ہے، یا ہونے دیا ہے وہ ان کی کمزوری، نقص یا عیب قطعی نہیں ہے۔ یہ تو ان کی انفرادیت ہے۔ آپ نے چھوٹے بڑے آبشار دیکھے ہوں گے۔ اگر آپ ان آبشاروں کے مشاہدے کے بعد کنیڈا یا امریکہ سے 'نیا گرا' کو دیکھیں گے تو آپ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ آپ کے حواس اس نظارے کو اپنی گرفت میں لانے کی مساعی میں ناکام رہ جائیں گے۔ 'نیاگرا' آپ کو حواس باختہ کردے گا۔ 'نیاگرا' آبشاروں کے بارے میں آپ کی اس وقت تک کی معلومات کی ہر قسم کی حد بندیوں کو توڑ کر آبشاریت، کی ایسی دنیا میں لے جائے گا جس سے آپ آشنا تھے اور نہ آشنا ہوسکتے تھے۔ ایسی صورت میں کیا آپ 'نیاگرا' کو آبشار تسلیم کرنے سے انکار کردیں گے؟ آپ ایسا ہرگز نہیں کریں گے۔ تو پھر آپ کیا کریں گے۔ آپ اپنے 'آبشار' کے تصور میں مناسب تبدیلی لائیں گے، ایسی تبدیلی جس کی رو سے آبشاروں کی تعریف میں 'نیاگرا' بھی سما سکے۔ شعروادب میں ایسی مثالیں مل جاتی ہیں۔ شیکسپیئر کے سونیٹ، سونیٹ کے صنف کی عام طور پر تسلیم شدہ استانزائی ترتیب کو نظر انداز کرتے ہیں۔ دور کیوں جائیں علامہ اقبالؔ کی

رباعیات میں رباعی کی صنفی حد بندیوں سے تجاوز کرنے کی مثالیں مل جاتی ہیں ان کی غزلیات کیا غزل کی صنف کے اندر ہیں۔اردو مرثیہ کیا اپنی صنفی حد بندیوں میں رہ سکا؟ شعروادب اور اس کی اصناف کو بدلتے رہنا ہے شعروادب میں کچھ بھی ٹھہرا ہو، ساکت اور جامد نہیں ہوتا اور جو ہوتا ہے وہ مرجاتا ہے۔

جس کو ہم 'خاکہ' کہتے ہیں اس کی ایک تاریخ ہے۔ وہ ایک غیر واضح طور پر ادب میں داخل ہوا۔ اس کی ابتدائی شکل کچھ تھی اور اب کچھ ہے۔ مختلف زبانوں میں اس کا آغاز اور اس کی بڑھوتری (Growth) مختلف انداز میں ہوئی۔ اس کا تعلق مغربی ادبیات سے ہے۔ انگریزی ادب میں اس کا جنم ممتاز ناول نگار چارلس ڈکنس کی صحافیانہ تحریروں کی کوکھ سے ہوا۔ ڈکنس کی یہ نگارشات بوز کے قلمی نام سے شائع ہوئیں۔ بعد میں ''بوز کے خاکے'' کتابی صورت میں آئے۔ ڈکنس کے ان خاکوں کو دو گرہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک گروہ کے خاکے لندن کی زندگی کی عکاسی پر مشتمل تھے اور ان میں کہانی کی ہلکی سی آمیزش بھی نہیں ملتی تھی جبکہ دوسرے گروہ کے خاکوں میں تخلیقی عنصر، کردار اور کہانی پن، کہیں کہیں 'شاعرانہ انصاف' کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ واشنگٹن ارونگ کے خاکے جو ۱۸۲۸ میں نیویارک سے ''جیفری کرے یون کے خاکوں کی کتاب'' کے نام سے شائع ہوئے خاکے کی صنف کی ابتدائی شکل کا تعین کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

آیئے اس مرحلے پر یہ دیکھتے ہیں کہ ایک ادبی صنف کے طور پر خاکے کے بارے میں انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، میں کیا درج کیا گیا ہے۔ ''ایک چھوٹا نثری بیانیہ بسا اوقات کوئی دلچسپ تذکرہ کسی ثقافت کے کسی پہلو کے بارے میں اسی ثقافت سے متعلقہ فرد کا لکھا ہوا جو متعلقہ ثقافت سے باہر والے قارئین کے لیے تحریر کیا گیا ہو'' یہ تو تھی خاکے (ادبی خاکے) کے مستند ترین تعریف، اب ذرا اس کی وضاحت بھی ملاحظہ ہو'' مثال کے طور پر ہندوستان کے اندر دوران سفر پیش آنے والا کوئی واقعہ جو کسی انگریزی جریدے میں شائع ہوا ہو اور غیر رسمی

اسلوب میں لکھا گیا ہو۔ خاکہ کسی قصے اور مختصر افسانے کے مقابلے میں کم ڈرامائی، زیادہ بیانیہ اور تجزیاتی ہوتا ہے خاکہ نگار بے تکلفانہ گفتگو کے لہجے میں فیصلے صادر کرنے کے بجائے، مشورے دیتا ہے اگر مندرجہ بالا تعریف بشمول وضاحت سختی سے لاگو کی جائے تو اردو، ہندی ہی کے نہیں بلکہ دنیا بھر کی زبانوں کے اعلیٰ ترین ''خاکے'' کی صنف کی چار دیواری سے باہر ہو جائیں گے۔ اطہر رضوی کے خاکوں کا تو شمار ہی کیا۔ اُن کو تو بلا غور و فکر اور شاید بغیر پڑھے باہر رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور تو اور انگریزی خاکہ نگاری کے سب سے معتبر نام چارلس ڈکنس کو بھی شاید ہی جگہ مل سکے دیکھا آپ نے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے ماہر ادبی اصناف نے ادبی خاکے کی کس قدر لائق تعریف، تعریف مرتب کی ہے۔

خاکہ نگاری میں چارلس ڈکنس کے بعد جی کے چسٹرٹن کا نام آتا ہے جس کی نگارشات نے یہ ثابت کر دکھایا کہ ادب کا یہ فارم، طنز او رہجو کے لیے بھی بے حد سازگار ہے۔ خاکے میں تخیل کے عمل دخل کا امکان ممکن نہ تھا لیکن تھینیل ہاتھارن Nathanial Hawthorn نے اپنے شاہ کار خاکے 'منظر شب' A night scene میں یہ بھی حد کمال تک کر دکھایا۔ انگریزی زبان کے خاکوں کے بارے میں جو کچھ کہا گیا وہ مغربی زبانوں کے خاکوں پر صادق آتا ہے۔ ایک اور بات جو سارے مغربی ادب میں اس صنف کے بارے میں کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ صنف اب مروج نہیں رہی ہے شاید مغرب کے عصری تہذیبی مزاج نے اس کو مسترد کر دیا۔ میرا خیال ہے صحافت کی آغوش سے بھاگا ہوا یہ بچہ ایک مرتبہ پھر صحافت کے ہاتھ لگ گیا اور اخباری کے خاکے 'نام دیو مالی' کو احترام سے دیکھتے ہوئے، عصمت چغتائی کے خاکے ''دوزخی'' (جو مرحومہ نے اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی پر لکھا تھا) کا ذکر کرتے ہوئے، میرا جی پر شاہد احمد دہلوی کے تحریر کردہ خاکے کو سراہتے ہوئے میں اپنے قلم کو روک رہا ہوں کہ تفصیل میں جانا مناسب نہیں۔ میں نے اتنا کچھ بھی محض اس لیے عرض معروض کیا کہ اس رویے سے مطمئن نہیں تھا جو اطہر رضوی کی خاکہ نگاری کے معاملے میں رکھا جا رہا ہے۔ ''چہرے، باتیں،

یادیں، لوگ" ادبی خاکوں کی کامیاب کتاب ہے جہاں تک میں نے غور کیا ہے ان خاکوں کا تنوع ہمیں پریشان کر دیتا ہے۔ اگر اس کتاب کے خاکے ایک نہج کے ہوتے یا ایک نہج سے لکھے جاتے تو کسی کو ایسا سوچنے کی ضرورت نہیں پیش آتی کہ یہ خاکے یہ ہیں، وہ ہیں، ایسے ہیں، ویسے ہیں۔ اس کتاب کا ہر خاکہ ڈنکے کی چوٹ پر خاکہ ہے۔

اس کتاب میں کل گیارہ خاکے ہیں۔ ان گیارہ خاکوں میں صرف چار خاکوں کا تعلق غیر شاعر افراد سے ہے۔ ان چار میں سے بھی ایک در پردہ شاعر ہیں (اکرام بریلوی) اور ایک غالبؔ کے طرف دار بھی ہیں اور سخن فہم بھی، اس پر طرہ یہ کہ دل کے بیماروں کے مسیحا بھی ہیں (ڈاکٹر من موہن شرما) یہی وہ نکتہ ہے جس کو فراموش کرنے والا کوئی ناقد یا مبصر ان خاکوں کو جانچنے میں غلطی کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ ادھر اطہر رضوی نے انتہائی معصومیت سے شاعر کی شخصیت اور اس کی شاعری کو باہم مربوط کر رکھا ہے۔ شاید ان کا خیال یہ ہے کہ شاعر کی ذات میں شاعری کے علاوہ جو کچھ ہوتا ہے، ثانوی ہوتا ہے اسی سبب سے وہ شاعر کا خاکہ لکھتے سے شاعری سے بھڑ جاتے ہیں جب کہ نقادی خاکہ نگاری کا منصب یہ نہیں ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان خاکوں میں 'خاکہ پن' کی کمی یا فقدان محض اس لیے نظر آتا ہے کہ ان میں شاعری زیادہ اور شاعر کم دکھائی پڑتا ہے ماسوا عالی صاحب' اور حمایت علی شاعر، کے خاکوں کے جو قدرے متوازن ہیں۔

اس کتاب کے دو خاکے ایسے ہیں جن کے تناظر میں اطہؔر رضوی کی تحریر کو کاٹ دار اور ان کے قلم کو 'شمشیر برہنہ' کہا گیا ہے یہ خاکے دو مشہور شخصیات جمیل الدین عالی، اور حمایت علی شاعر سے متعلق ہیں۔ میرے طالبعلمانہ مطالعے کے مطابق خاکہ 'عالی صاحب، ایسے فقروں سے بھرا پڑا ہے جو نثری قصائد کا مزاج رکھتے ہیں 'عالی صاحب، کتاب کے صفحہ ۱۵ سے صفحہ ۳۸ تک محیط ہے۔ صفحہ ۱۶ پر پہلی بار عالؔی جی کا ذکر آتا ہے۔" ان ہی محفلوں میں (حلقۂ ارباب ذوق کراچی کی محفلیں) کسی اتوار کو میں نے پہلی بار جمیل الدین عالؔی کو دیکھا اور انہیں غزل

پڑھتے ہوئے سنا۔ ان کی بذلہ سنجی سے سارے حاضرین متاثر لگتے تھے ان کے حسن ظرافت سے لوگ محفوظ ہو رہے تھے۔ ان کی شخصیت سے ایک بشاشت رستی محسوس ہوتی تھی۔'' کتاب کے صفحہ ۲۰ پر عالیؔ صاحب کا ذکر'' بہر حال عالی صاحب (بخاری صاحب کی طرح) ایسی دانش مندانہ نوک جھونک میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ وہ جہاں گئے شائقین کی توجہ کا مرکز بنے رہے'' کتاب کے صفحہ ۲۱ پر عالیؔ جی'' وہ اپنی آواز اور اپنی شخصیت کے آہنگ کو جس طرح ایک مناظرے میں سموتے ہیں۔ یہ ان کا اپنا ایک کمال ہے۔ عالیؔ صاحب کی ساری زندگی کا جائزہ عمیق تحقیق کا متقاضی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عالیؔ صاحب ہشت پہلو شخصیت کے حامل ہیں۔ وہ لاکھ اپنے آپ کو محض مشاعرہ باز شاعر سمجھیں، اردو ادب کے اساتذہ نے تقسیم ملک کے بعد پاکستان کی نئی نسل کے شعراء میں فیض، ناصر کاظمی، منیر نیازی کے ساتھ انہیں صف اول کے شعراء میں تسلیم کیا ہے'' (راقم الحروف کا خاکہ نگار اور اس کے متذکرہ اساتذہ کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں) صفحہ ۲۱ پر یہ فقرہ دیکھیے'' اردو شاعری کے کینوس پر عالیؔ صاحب کے دوہوں کا جمال ہمیشہ اُجاگر رہے گا'' صفحہ ۲۲ پر یہ فقرہ ملتا ہے'' عالیؔ صاحب کی شخصیت کے انگ انگ سے شہزادگی جھانکتی نظر آتی ہے۔ وہ کبھی کبھی اپنے زمانے کے راجا اندر اور کاسونو واکی مشترکہ تصویر نظر آتے ہیں'' صفحہ ۲۵ پر یہ فقرہ دیکھیے'' شعر وسخن'' غزلوں، دوہوں اور گیتوں کی اصناف میں عالی صاحب کی انفرادیت مستند ہے، تاہم ان کی خلاقی کی عظمت نے اردو ادب کی نثر میں بھی ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں۔'' اسی صفحے پر آگے ملاحظہ کیجیے'' عالی صاحب کے'' حرفِ چند'' کے دو حصوں کو اردو کے ادب عالیہ کی سوغاتوں میں شمار کیا جانا چاہیے۔'' آگے چل کر یہ فقرہ توجہ طلب ہے'' عالیؔ صاحب کے کالم ان کی عالمی شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں اور اس کا اندازہ ایسے افراد بہ آسانی کر سکتے ہین جو بذات خود'' آفاقی شہری'' ہوں...... عالی صاحب کے سفر نامے ان کی خلاقی کی صلاحیتوں کو تکمیل کی سطح تک پہنچاتے ہیں۔'' عالی صاحب پر اُن کے (اطہر رضویؔ) ایک مضمون اسے ایک اقتباس

خاکے میں شامل کیا گیا ہے۔ ''آخرشب کسی خاموش جھیل کے ساکت پانیوں پر بیٹھا ہوا کنول کا ایک نیم وا پھول صبح کا انتظار کرتے کرتے چپ چاپ کھل اٹھے اور یکایک آس پاس کی فضا اس کی بھینی بھینی خوشبو سے معطر ہو کر ایک سحر انگیز کیفیت پیدا کر دے۔ عالی صاحب کا نام میرے ذہن کے پردے پر کچھ ایسے ہی نقوش میرے شعور کے دائرے میں کچھ ایسی ہی کیفیت پیدا کرتا ہے'' آپ نے محسوس کیا ہوگا۔ صفحہ ۲۹ سے عالی صاحب کے خاکے میں گریز کا عنصر شامل ہوتا ہے اور چند ایک شکایات مذکور ہوتی ہیں لیکن فقروں میں کچھ کاٹ آتی ہے اور نہ قلم کی شمشیر برہنہ ہوتی ہے البتہ جب وہ پاکستان کی اقلیم ادب میں لابیوں اور مقتدر کرم فرماؤں کا ذکر کرتے ہیں تو کچھ واشگاف لہجے میں بات کرتے نظر آتے ہیں 'عالی صاحب' کا خاکہ 'انٹی ہیرو' جیسی لفظی ترکیب کے استعمال کے باوجود 'ہیرو پرستش' کے رنگ میں ختم ہوتا ہے۔ صفحہ ۳۸ کا یہ فقرہ ملاحظہ کیجیے ''اور پھر اس لمحہ موجود میں وہ اردو تہذیب کا آخری چراغ ہیں، جس کی نرم، ملائم، دھیمی تاب سے اردو جہاں عشروں سے فیض یاب ہوتا رہا ہے۔'' اب اگر کوئی یہ کہے کہ ان کے قلم کی شمشیر برہنہ اور اس کی کاٹ انکے خاکے ''حمایت علی شاعر'' میں دیکھی جاسکے گی تو میں یہ عرض کروں گا کہ اطہر رضوی کے اس خاکے کو میں نے اپنے لیے ''ناقابل مطالعہ'' قرار دے لیا ہے۔ اہل دانش نے ''میاں بیوی'' کے جھگڑے سے دور رہنے کا مشورہ دے رکھا ہے لیکن میں نے لڑکپن سے اپنے آپ کو دو دوستوں کی 'کٹی' سے دور رکھا ہے اطہر رضوی کی کتاب ''گر ہم برا نہ مانیں'' مطبوعہ 2006 اور 2007 صفحہ 12 پر حمایت علی شاعر کا ذکر ملتا ہے۔ ''حمایت علی شاعر میرے اتنے پرانے اور قریبی دوست ہیں کہ اس کی مدت کے اظہار سے ہم دونوں کی عمروں کا پتہ چل جائے گا۔ اگرچہ وہ مجھ سے کئی سال بڑے ہیں لیکن ہم دونوں کی ادبی زندگی کا آغاز ساتھ ساتھ ہوا۔'' اس کے بعد والے ورق پر ایک رنگین تصویر ملتی ہے جس میں حمایت علی شاعر اور اطہر رضوی ساتھ کھڑے ہیں۔ آپ ہی بتائیں آیا میں نے درست فیصلہ نہیں کیا۔ ''ستیہ پال آنند'' کتاب کا دوسرا خاکہ ہے جن سے اطہر رضوی

تقریباً چوبیس سال قبل دہلی میں ملے تھے بعد ازاں کراچی میں انہوں نے خاکہ نگار کی تین کتابوں کی تقاریب اجرا میں تقاریر کیں۔ پھر وہ امریکا آ گئے۔ جب بھی وہ اپنے کینیڈا میں مقیم بیٹے کے ہاں آئے تو اپنے نئے شعری مجموعے کے ساتھ آئے اور اہل ٹورانٹو نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس خاکے کی خصوصیت یہ ہے کہ اطہر رضوی نے اس کے لیے مواد بہت جمع کیا ہے اور زیادہ مواد بالراست صاحب خاکہ سے حاصل کیا جس سے اس کی توقیر اور اعتبار میں اضافہ ہوا تاہم صنف غزل کی مخالفت میں ان کو اولیت دینے کی چوک کر بیٹھے۔ اس ضمن میں بہت پہلے، تقسیم ہند سے بھی قبل بہت معرکے ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند اور اس طالب علم ادب کے خیالات بلکہ نظریات میں بے شمار اشتراک کی قدریں ہیں۔ میرے علاوہ اور بھی ہمارے ہم خیال مل جائیں گے۔ ترقی پسند تحریک، جدید ادب کی تحریک یا تحریکات کے بارے میں، فیض کے بارے میں ہمارے خیالات ایک سے ہیں۔ فیض کے بارے میں جو کچھ ستیہ پال جی کہہ رہے ہیں، ایک دو اور لوگوں نے کہا ہے کہ بلکہ کچھ زیادہ ہی کہا ہے۔ ن۔م۔ راشدؔ کو فوقیت دینے والے ہمارے علاوہ اور بھی مل جائیں گے میراجیؔ کو اہمیت دینے میں بھی ہم تنہا نہیں ہیں۔ ایک بات اور اطہر رضوی نے ڈھیر بھر معلومات تو اکٹھی کر لیں لیکن اس پیارے سے، شوخ سے، شریر سے بچے کو نہیں دیکھ سکے جو اس ظالم کے اندر چھپا بیٹھا ہے۔ شیکسپیئر کے ایریل کی مانند، یہی وہ بچہ ہے جو اندر سے کبھی کسی کو اور کبھی کسی کو ایک آدھ چٹکی لے لیتا ہے اور بھگتنا پڑتا ہے بیچارے ستیہ پال کو ورنہ ستیہ پال تو پیار ہی پیار ہے۔ اس کی ذات تو ملک آف ہیومن کنیڈنس، سے شرابور ہے ان دنوں وہ تنہا رہ گیا ہے۔ اس کی رفیقۂ حیات نے اس کو دغا دے دی ہے اور اکیلی یاترا پر پرلوک سدھار گئی ہے۔ اس کو بھی جانے کی لگ گئی ہے۔ ان دنوں چند بوڑھوں نے اسے گھیرا ہوا ہے جن سے وہ "بدھ مت"، سکھ ازم اور ہندو دھرم کے تقابلی مطالعے کے موضوع پر باتیں کرتا ہے۔ ایسے میں اپنے آپ کو یہ سوچ کر مطمئن کر لیتا ہوں کہ ایک شیطان جس کا نام نامی ساقی فاروقی ہے

اس سے ہر روز فون پر بات کر لیتا ہے۔ ایسے ہی گڑے وقت میں ہر بندے بشر کو ایک شیطان کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔

'گیان چند جین' پر اطہر رضوی کا خاکہ حیران کن حد تک متوازن ہے۔ وہ اپنی کتاب سے متنازع شخصیت بننے میں کامیاب ہو کر ہمیں اپنی جدائی سے اداس کر گئے۔ یہ سب یوں لگتا ہے کہ ایک ثانئے میں واقع ہو گیا۔ اب یہ صورت حال ہے کہ لوگ ان کی اختلافی کتاب کو رو رہے ہیں اور ہم ان کی رحلت کو۔ وہ ایک جید عالم تھے اور عالم روز روز نہیں پیدا ہوتے وقت ان کو برسوں روئے گا اور دنیا خالی خالی لگے گی۔

میں نے اطہر رضوی کے اس خاکے کو متوازن کہا ہے اگرچہ خاکہ نگار نے صاحب خاکہ کی کتاب ''ایک بھاشا۔ دو لکھاوٹ، دو ادب'' کے خلاف یہ لکھا'' گیان چند جین صاحب نے اس میں اتنا زہر بھر دیا ہے۔ اتنی اذیت سمودی ہے۔ اتنا اشتعال کا ساماں جمع کر دیا ہے کہ اس کی مجموعی حیثیت مندرجہ بالا تصانیف کے ہم وزن نظر آتی ہے'' جن تصانیف کی جانب اشارہ ہے وہ ولیم میور، ڈاکٹر ہنٹر، مولانا عین الحق سوامی سردانند اور سلمان رشدی کی مشہور زمانہ نزاعی کتابیں ہیں۔''

یہ سب لکھنے بلکہ اور بہت کچھ لکھنے کے بعد اطہر رضوی نے گیان چند جین کو اپنے خاکہ پڑھنے والوں کے سامنے کچھ اس طرح لا بٹھایا کہ ان پر پیار آنے لگا۔ ہمارے سامنے وہ جین صاحب تھے جو اُس کے کردار کی ایک اہم خصوصیت سے آگاہ ہوتے ہیں۔ ان میں زبردست صبر، تحمل اور رسان ہے اور یہی ان کی پہچان ہے۔ اس کتاب میں ''ثریا اور سونیا'' ایک ایسا خاکہ ہے جو ہر پڑھنے والے کے دل کو چھوتا اور آنکھوں کو آنسوؤں کی سوغات سے نوازتا ہے اس خاکے کو پڑھیں اور سونیا، کے لیے اندر ہی اندر سوگوار نہ ہوں ایسا ممکن ہی نہیں۔ سونیا کا کردار حیران کن ہے۔ اس کے بارے میں پڑھ کر آپ اگر فولاد کے بنے ہوں تو موم ہو جائیں گے لیکن جب آپ اس فولاد کا ادراک کریں گے جس سے سونیا کے کردار اور اس کی

شخصیت کی تشکیل ہوئی ہے تو آپ کو سمجھ میں نہ آئے گا کہ آپ کیا کریں؟ اطہر رضوی نے سونیا کے خوبصورت ظاہر کے ساتھ اس کے باطن کی فولادی صلابت کا ادراک دے کر اپنے اس خاکے کو زبردست کامیابی سے ہم کنار کر دیا ہے۔ ایسی ہی بصیرت (وژن) کسی خاکہ نگار کے لئے باعث توقیر ثابت ہوتی ہے۔

''اکرام صاحب'' اردو کے ایک بڑے ناول نگار، افسانہ نویس اور صاحب بصیرت نقاد ہونے کے ساتھ اور بھی بہت کچھ ہیں۔ اکرام بریلوی جب قلم ہاتھ میں لیتے ہیں تو ادب کا ہر شعبہ ان کے قلم کی جانب جھلتی نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے اس امید پر مبادا وہ اس کی جانب متوجہ ہوں۔ اس خاکے پر بات کرنا غیر ضروری لگتا ہے کیوں کہ خاکہ نگار نے اس کی پیشانی پر یہ تحریر کر دیا ہے ''اکرام صاحب میرے بزرگ، ادبی مشیر اور صلاح کار ہیں۔'' تاہم اطہر رضوی نے جرأت رندانہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اکرام صاحب کی زبان اور اسلوب پر کچھ لکھا ہے۔ مثالیں بھی دی ہیں حوالہ جات کے ساتھ۔ آخر میں یہ فقرہ جڑ دیا ہے ''پاکستان کی کسی یونیورسٹی میں اگر کوئی دقیق نویسی پر تھیسس تیار کرتا ہو تو اس کے لیے اکرام صاحب کی ناولوں کا مطالعہ ازبس ضروری ہوگا۔''

اصل معاملہ یہ ہے کہ آج کے عام بے اسلوبی کے زمانے میں کسی قلم کار کا صاحب اسلوب ہونا سمجھ میں آنے والا معاملہ ہی نہیں ہے حالانکہ آج بھی اس فقرے کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا "Style is the man" اسلوب ہی کسی کی شناخت ہے ''نسیم سید'' کا خاکہ پڑھنے کی چیز ہے، بات کرنے کی چیز نہیں۔ ان کے خاکے پر بات کرنے سے یہ بہتر لگتا ہے کہ جب بھی موقع ملے اور جہاں بھی موقع میسر آئے ان کی باتیں سنئے۔ عجیب شخصیت ہے علمیت اور ذہانت کا مرکب اگر ان کا ہمہ وقت مسکراتا چہرہ مددگار نہ ہو تو بات کرنا مشکل ہو جائے۔ نسیم سید کے ذکر پر میں ''چہر باتیں، یادیں لوگ'' سے رخصت ہوتا ہوں۔

—oooOooo—

اطہر رضوی: ایک منفرد مورخ و ادیب

پروفیسر شارب ردولوی، لکھنؤ، انڈیا

اطہر رضوی ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں وہ بیک وقت ایک اچھے ادیب و شاعر اور محقق و مورخ ہیں۔ کسی ایک شخص میں ان تمام خوبیوں کا یکجا ہو جانا معمولی بات نہیں ہے لیکن ان کی جو خصوصیت میری نگاہ میں سب سے زیادہ اہم ہے وہ ان کی دردمندی، انسان دوستی اور صاف گوئی ہے۔ تحقیقی و تنقیدی موضوعات پر اب تک ان کی دس سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ان کا شمار اردو کے اہم اور منفرد ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ان کی بعض کتابیں خاص طور پر ہر ملک ملکِ ماست، خدا کے منتخب بندے، تاریخ کا سفر بلکینیا سے بازنیا تک، کون عبث بدنام ہوا، اور گر ہم برا نہ مانیں...... ان کے تاریخی شعور، انسان دوستی اور صاف گوئی کی بہت اچھی مثالیں ہیں۔ وہ ایک اچھے انسان اور دوست ہیں لیکن ان کی بے لاگ رائے کے اظہار میں نہ مصلحت درمیان آتی ہے اور نہ دوستی۔

اطہر رضوی واقعات اور حالات کا بڑی دقت نظر سے مطالعہ کرتے ہیں۔ انھوں نے دنیا کے بیشتر اہم ملکوں کا سفر کیا ہے لیکن ان کا سفر سیاحت برائے سیاحت نہیں، ہر سفر کے پیچھے ان کا مقصد کسی چیز کی تلاش اور جستجو رہا ہے۔ اسی لیے میں انھیں صرف سفر نامہ نگار نہیں قرار دے سکتا۔ اگر ان کی کسی کتاب پر سفر نامہ کا شبہ بھی ہو تب بھی وہ شہروں کے قدیم آثار یا وہاں کے لوگوں کی اخلاقی قدروں کے راوی نہیں ہیں۔ ان کے یہاں تاریخ کے عمل اور ردعمل کے ساتھ اس عہد کا کرب بھی ملے گا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ جس عہد، ملک، حکومت یا

تہذیب کا ذکر کرتے ہیں خواہ وہ دولت عثمانیہ ہو، اسپین، اندلس، ترکی، مراکش، الجزائر، ہو یا جدید حوالے سے عراق، ایران، افغانستان، ہندوستان، پاکستان، بوسنیا اور بنگلہ دیش ہو وہ خود وہاں کا ایک کردار ہوتے ہیں اس طرح وہاں کے تہذیبی، علمی اور ثقافتی عروج کے خوش آئند تذکروں کے ساتھ اس کے زوال کا کرب جھیلنے والے شخص بھی وہی ہیں۔ کسی کو ان کے نظریے سے اختلاف ہوسکتا ہے یا ان کی 'کھری' بات بری لگ سکتی ہے لیکن ان کی دردمندی اور خلوص پر شک نہیں کیا جاسکتا۔

آج دنیا کا ایک بڑا مسئلہ دہشت گردی ہے، جس کا سب سے زیادہ شکار ہندوستان و پاکستان ہیں اس کا ذمہ دار کون ہے اور اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ امریکہ میں ٹریڈ سنٹر اور ممبئی میں تاج ہوٹل پر حملے باقاعدہ جنگی نوعیت کے تھے جو تشویش کا باعث بھی ہیں اور قابل مذمت بھی۔ لیکن صرف مذمت اس کا تدارک نہیں ہے اس کا علاج اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک اس کا بنیادی سبب Root Cause نہ معلوم ہو۔ اطہر رضوی جو تاریخ پر گہری نگاہ رکھتے ہیں اور جنھوں نے اسلامی تاریخ کے مطالعہ کے لیے قدیم اور موجودہ مسلم ممالک کا سفر کیا ہے۔ انھوں نے اس خاصے نازک مسئلہ کے بارے میں کچھ نتائج اخذ کیے ہیں۔ انھوں نے اپنا نظریہ پیش کرنے کے لیے ابتداء سے مسلم حکومتوں کے ثقافتی اور اخلاقی اقدار کا جائزہ لیا ہے کہ ان کا اپنے ملک کی اقلیت کے مذہب اور ثقافت کے بارے میں کیا رویہ تھا۔ شاید یہ ضروری اس لیے بھی تھا کہ آج مسلمانوں پر سب سے بڑا الزام، جو ہندوستان کی بعض سیاسی جماعتوں کی طرف سے عائد کیا جاتا ہے یہ ہے کہ مسلمان حکومتوں نے ہندو عوام کے ساتھ ظلم و زیادتی کا برتاؤ کیا اور انھیں بالجبر مسلمان بنایا۔ امریکہ اور اسرائیل بھی مسلمانوں کے خلاف اس سازش میں برابر کے شریک ہیں بلکہ اس بات پر تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ اگر یہ معلوم ہو کہ اس پردۂ زنگاری کے پیچھے انھیں کا ہاتھ ہے۔

اطہر رضوی نے تاریخی حقائق کی روشنی میں اس مسئلہ کا جائزہ لیا ہے اور مسلمانوں پر عائد کیے جانے والے الزامات کا مدلل اور غیر مدلل انداز میں جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے آج کی صورتحال پر گفتگو کرنے کے لیے ماضی بعید سے لے کر عصر حاضر تک تاریخی شواہد کا ایک ایسا آئینہ پیش کردیا ہے جس میں ہر شکل اپنی اصل صورت میں نظر آتی ہے۔ انھوں نے دلائل کے ساتھ یہ بات تحریر کی ہے کہ سلطنت عثمانیہ سے لے کر ہندوستان کے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر تک کسی حکمراں کے زمانے میں نہ تو غیر مسلمانوں کو دوسرے درجہ کا شہری سمجھا گیا اور نہ انھیں مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا گیا۔ جہاں بھی تبدیلی مذہب کے واقعات ہوئے ان کا سبب معاشی، سماجی اور اخلاقی حالات تھے جن کی وجہ سے انھوں نے مذہب تبدیل کیا جس کی ایک بڑی مثال بیسویں صدی میں لاکھوں ہندوؤں کا بودھ مت اختیار کرنا ہے۔ مسلمانوں کی مذہبی کشادہ دلی اور رواداری کی بہت سی مثالیں انھوں نے تاریخ سے پیش کی ہیں۔ فرانس کے فلسفی اور دانشور جین بدون Jean Bodin کے حوالے سے انھوں نے ایک اقتباس نقل کیا ہے۔ جس سے ان کے دعووں کی صحت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں؛

''ترکوں کا بادشاہ یورپ کے ایک بڑے حصہ پر حکومت کرتا ہے۔ اپنے دین کی بڑی جگرداری سے حفاظت کرتا ہے لیکن کسی دوسرے مذہب کے پرچار میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کرتا، بلکہ اس کی سلطنت ہر شہری کو یہ حق عطا کرتی ہے کہ وہ اپنے مسلک اور ضمیر کے مطابق عبادت کرے۔ طرفگی یہ ہے کہ وہ استنبول میں اپنے قصر میں چار جداگانہ مذہبوں، یہودیوں، رومن مسلک کے عیسائیوں، یونانی مکتب کے عیسائیوں اور اسلام کی عبادت کی اجازت دیتا ہے۔'' (کون عبث بدنام ہوا، صفحہ 56)

جیو اور جینے دو کی اس پالیسی پر اگر انگریزوں اور امریکیوں نے عمل کیا ہوتا تو آج دنیا کی شکل ہی مختلف ہوتی۔ اطہر رضوی نے اس بات کا بھی بڑی دقت نظر کے ساتھ تجزیہ کیا ہے

کہ مسلم حکمرانوں نے یورپ، ایشیاء، عرب اور افریقہ کے جن ممالک میں حکومت کی وہاں مساوات کے علاوہ علم، فلسفہ و دانش اور تہذیب و ثقافت کو بے حد فروغ دیا۔ اس کے باوجود ایسا کیوں ہے کہ ایسی مضبوط اور وسیع حکومتیں زوال کا شکار ہوتی گئیں۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ:

''اسلامی تاریخ یا عالمی تاریخ کے کسی مورخ کے لیے یہ فیصلہ کرنا کہ وہ کون سا نقطہ یا واقعہ تھا جس نے اسلامی تہذیب کے پیادہ کارواں کا رخ پھیلتی ہوئی ڈھلانوں کی جانب کردیا غالباً غیر ممکن امر ہے تاہم پہلی جنگ عظیم اور دولت عثمانیہ کے سقوط اور قطع و برید کو اس راہ تنزل کا آغاز تصور کرنا چاہیے۔'' (کون عبث بدنام ہوا، صفحہ 48)

یہ صحیح ہے کہ سلطنتوں کے عروج و زوال کی نفسیات بہت عجیب ہے اور کسی ایک سبب کو وجہ زوال نہیں قرار دیا جاسکتا۔

اطہر رضوی ایک ترقی پسند فکر رکھنے والے انسانیت پرست Humanist ہیں۔ مذہب ان کی فکر کی سرحد نہیں ہے۔ وہ ایک وسیع النظر انسان ہیں کسی کے ساتھ نہ تو سیاسی اختلافات کی بنا پر ظلم و زیادتی کو پسند کرتے ہیں اور نہ مذہبی اعتبار سے کسی طرح کی بنیاد پرستی اور قتل و غارتگری کی ان کے یہاں گنجائش ہے۔ انھوں نے تاریخی واقعات کے حوالوں سے یہ بات لکھی ہے کہ امریکہ اور برطانیہ نے اپنے مفاد کے لیے مسلم سلطنتوں کے ٹکڑے کیے، ان پر اپنی مرضی کے بادشاہ بٹھائے اور وہ آپس میں لڑتے رہیں اس کے لیے بنیاد پرستی کی سرپرستی کی۔ آج جہاں کہیں بھی بنیاد پرستی پھیل رہی ہے۔ اس کی افزائش اور فروغ میں کسی نہ کسی سطح پر امریکہ، برطانیہ اور اسرائیل کا ہاتھ نظر آئے گا۔ طالبان آج بہت سے مسلمانوں کے رہنما، لیڈر یا منظور نظر ہوسکتے ہیں۔ لیکن ان کو وجود میں لانے والا تو امریکہ ہی ہے۔ افغانستان کی خانہ جنگی کی مثال دیتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ:

''افغانستان میں اسلام ہمیشہ فکر و عمل کا سرچشمہ رہا ہے..... قبل از طالبان اور مابعد

طالبان جو افغانستانیوں کی زندگی اور فکر میں تبدیلی ہوئی ہے وہ یہ تھی کہ پہلے رویہ اور برتاؤ معتدل اور متحمل ہوا کرتا تھا 1992 تک ملک میں ہندو، سکھ، یہودی، تجارتی اور ثقافتی زندگی کا ایک قابل ذکر حصہ ہوا کرتے تھے..... طالبان کی آمد اور تسلط نے افغانستان کی شناخت اور تشخص کے کینوس پر نیا رنگ بھر دیا تھا۔ مختلف عقائد کے افراد جنھوں نے ابھی تک مذہبی اعتقادات کی بنیاد پر رسم و راہ نہیں کی تھی وہ فرقہ وارانہ تعصب کے زہر کا شکار ہوکر ایک دوسرے کے دشمن ہوگئے۔ خانہ جنگیاں اور قتل و خون اقتدار اور علاقوں کے بجائے فرقہ واریت کے زاویوں پر ہونے لگی۔" (کون عبث بدنام ہوا، صفحہ 263-264)

بنیاد پرستی 'ہندواتو' کی شکل میں یا طالبان کی شکل میں یہ انسانیت کے لیے ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ اس لیے کہ اس میں نہ آپ اصل دشمن پر حملہ کر پاتے ہیں نہ اس کو نقصان پہنچا پاتے ہیں۔ اس میں نقصان ہوتا ہے عام بے گناہ اور غیر متعلق انسان کا۔

اطہر رضوی کی تصنیفات تاریخ و ثقافت سے متعلق ہوں یا ادب سے۔ ان کی تحریر اور ان کے اسلوب میں جو ادبی چاشنی ہے وہ ہر جگہ باقی رہتی ہے۔ یہ ان کے اسلوب کی خوبی ہے کہ تاریخی اور بے کیف موضوعات کو بھی وہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کی دلچسپی میں فرق نہیں آتا۔ اپنے ایک مضمون میں کتب خانوں کی اہمیت اور بعض نجی کتب خانوں کا ذکر کرتے ہوئے ماضی کی اہمیت پر بڑے بلیغ پیرائے میں لکھتے ہیں:

"ماضی کے بطن سے حال پیدا ہوتا ہے اور مستقبل کی نشاندہی کے لیے ماضی کے سنگ میل ہمیشہ ضروری ہوتے ہیں۔ ہر انسان کا ایک سایہ ہوتا ہے اور یہ سایہ اس کے ماضی کی شناخت ہوتا ہے۔ اسی لیے انسانی ارتقاء کے لیے ذہن اور شعور کا ماضی سے رابطہ ضروری ہوتا ہے۔ لائبریری میں محفوظ حکمت و دانش کے شہہ پارے وہ رابطہ ہوتے ہیں"

(گر ہم برا نہ مانیں صفحہ 39)

اطہر رضوی کے عناصر اربعہ میں لکھنؤ کی مٹی اورنگ آباد کا پانی، ہندوستان کی ہوا اور

مغرب کی آتش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے علم و دانش اور ثقافت کے وہ ایسے دلدادہ ہیں کہ اس کا بیان کرنے میں ان کا قلم کبھی نہیں تھکتا۔ انھیں یہاں کی پیاس بار بار لکھنؤ لے کر آتی ہے۔ یہاں کی ادبی اور تہذیبی اقدار کے وہ عاشق ہیں لکھنؤ کی تہذیب کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

''روم، استنبول اور قرطبہ کی طرح لکھنؤ صرف ایک شہر کا نام نہیں ہے۔ لکھنؤ تہذیب اور ثقافت کی میراث، اردو زبان کی نفاست کی شناخت، شعر و سخن کا مکتبہ فکر اور برصغیر میں شیعیت، رثائی ادب اور انیسؔ کی عظمت کی آماجگاہ ہے۔''

اودھ کی تہذیب اور یہاں کے ادب کے دنیا میں کتنے ہی لوگ دلدادہ ہوں گے لیکن اس طرح کسی نے بھی اسے خراج عقیدت پیش نہیں کیا ہوگا۔ لیکن اپنی شدید عقیدت کے باوجود وہ اس کے ایک ''رومانی عاشق'' نہیں ہیں انھیں جہاں کہیں کوئی بات ناگوار ہوئی اس کا اظہار بھی انھوں نے اسی صاف گوئی سے کیا ہے۔ ان کی تحریر کے اس طرح کے حصے بعض لوگوں کو ناگوار ہو سکتے ہیں، لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اطہر رضوی اپنے نظریات کا اظہار کرتے ہیں کسی مصلحت سے کام نہیں لیتے۔ انھوں نے لکھنؤ کی تعزیہ داری کی رسومات پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''...... تعزیہ داری کی رسومات میں 'کرڑ پتھی Cult' کے عناصر مترشح ہیں جو یقیناً ناپسندیدہ ہیں۔ بحیثیت مجموعی مجھ ناچیز کی نظر میں عصر حاضر کی مجالس محرم امام حسینؑ کی عظیم قربانی اور ان کے پیغام کی کما حقہٗ صورت گری نہیں کرتی ہیں اور یہ صورت حال غالباً کسی حد تک لکھنؤ کے پروردہ ذیلی کلچر کی رہین منت ہے۔'' (گر ہم برا نہ مانیں، صفحہ 89-88)

اطہر رضوی کی بات بالکل غلط تو نہیں ہے لیکن مجموعی حیثیت سے صحیح بھی نہیں ہے۔ اس لیے کہ اہم علماء خطبا اور ذاکرین مثلاً ڈاکٹر کلب صادق صاحب مولانا حمید الحسن صاحب، مولانا کلب جواد صاحب اور بہت سے علماء ایسے ہیں جو ان مجالس کے ذریعہ امام حسین علیہ

السلام کی عظیم قربانی کے بنیادی مقصد اور اصول اسلام سے لوگوں کو آشنا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مجالس میں شیعوں کے علاوہ اہل تسنن اور اہل ہنود بھی شریک ہوتے ہیں اسی سلسلہ میں ابھی ڈاکٹر کلب صادق صاحب نے تین لکچر، اسلام مذہب یا مشن، کے موضوع پر دیے جس میں ہزاروں غیر شیعہ حضرات سامعین کی صفوں میں موجود تھے۔ لیکن اس طرح کی روایتی مجالس بھی ہوتی ہیں جن کا ذکر اطہر رضوی نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔

اطہر رضوی کے موضوعات میں بڑا تنوع ہے۔ وہ ایک دانشور ہیں اس لیے ان کی فکر کسی ایک خانے میں محدود نہیں ہے۔ انھیں علامہ اقبال کی طرح مسلمانوں کے زوال کا افسوس ضرور ہے لیکن وہ ان لوگوں میں ہیں جو ماضی پر فخر تو کرتے ہیں لیکن ماضی میں جیتے نہیں۔ وہ ہر مسئلہ کو 'آج' کے علم اور 'آج' کی روشنی میں دیکھتے ہیں وہ مذہب ہو یا سیاست اور یہی ان کی تحریر کی سب سے بڑی خوبی اور دلکشی ہے۔ اردو میں اچھے لکھنے والوں کی کمی نہیں ہے لیکن ایمانداری سے اپنا اور حالات دونوں کا تجزیہ کرنے والے اطہر رضوی کی طرح کے لوگ یقیناً بہت کم ہیں۔

کون عبث بدنام ہوا؟

پروفیسر ڈاکٹر سعادت سعید، انقرہ، ترکی

ظہور اسلام کی بدولت جہالت اور تاریکی کے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی انسانیت کو جو عظیم اخلاقی، علمی اور فکری خزینے ملے ہیں اس کا اعتراف مشرق و مغرب کے باشعور دانشوروں نے کھلے دل سے کیا ہے۔ قرآن پاک کی تعلیمات اپنے اندر ایسے حکمتی جوہر رکھتی ہیں کہ گزشتہ چودہ سو سالوں سے ان کے وسیلے سے انسانیت علم کے موتیوں سے مالا مال ہوتی چلی جارہی ہے۔ قرآن میں دی گئی اخلاقی اور انسانی قدروں کا سب سے کامل نمونہ خود پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات ہے۔ ان کی پیروی کرنے والے مسلمان کسی بھی صورت کوئی ایسا عمل سر انجام نہیں دیں گے جس سے انسانی حیات کے مجروح ہونے کا اندیشہ ہو۔ چنانچہ من حیث القوم مسلمانوں پر دہشت گردی کا لیبل لگانے والے مسلمانوں سے نہ جانے کون جنموں کا بدلہ لینے پر کمر بستہ ہیں۔ برصغیر میں مسلمان اقلیت میں تھے مگر انہوں نے اکثریت پر ہزار سال تک ان کی مرضی کے خلاف حکومت نہیں بلکہ ان کے ساتھ مل کر اکا دکا ادوار کو چھوڑ کر قدیم مذہبی تنگ نظری اور تعصب کے رویوں کی حوصلہ شکنی کی اور انسانوں کو کشادہ ذہنی اور سیکولر طرز حکومت کی نعمتوں سے مالا مال کیا۔ مسلمانوں کے مابین اقتدار کی جنگوں کو چھوڑ کر کہ جن میں باہمی طور برادر کشی اور پدر گستاخی روا رکھنے کے علاوہ کئی دوسرے رشتوں کی بے حرمتی بھی ہوئی ہے۔ مسلمانوں نے مذہبی اقدار کے تابع رہ کر کوئی ایسا کام انجام دینے کی کوشش نہیں کی جس سے قرآن، حدیث اور ان کی روشنی میں سنہرے حروف سے لکھے جانے والے خطبہ حجۃ

الوداع پر غیروں کی انگشت نمائی کا موقع ملنے کا احتمال ہو۔ غلامی کی لعنت پر سب سے پہلے اسلام ہی نے تنقید کی ہے۔ مساوات کے فروغ کے ساتھ ساتھ طاؤس ورباب اول جاننے والے مسلم حکمرانوں تک نے اور غیر مسلموں کی حفاظت کے اسلامی قانون کو مقدم و فائق رکھا۔ ترکی کو مرکز اقتدار بنانے والے سلطنت عثمانیہ کے حکمران اگر چاہتے ہیں تو اسپین میں ہونے والی نسل کشی کے بدلے یورپ میں غیر مسلموں کا صفایا کردیتے مگر انہوں نے اسلامی صبر اور انسان دوستی کی اقدار کی روشنی میں قوم کے دامن پر بھیانک دھبے نہیں لگنے دیئے بقول اطہر رضوی صاحب، ذاتی اخلاق و کردار سے قطع نظر ترک سلطانوں کو اپنے مسلمان ہونے پر فخر تھا۔ وہ ملک گیری اور تسخیر کا جذبہ رکھنے کے باوجود کشادہ ذہن اور غیر متعصب تھے۔ ترک حکمرانوں نے اقلیتی نسل یا فرقے کے افراد کو تیسرے درجے کا شہری نہیں سمجھا۔ متعصب مستشرق اسے مغرب کی دین قرار دیتے ہیں۔ لیکن مغرب میں ازمنہ کہنہ میں تو کیا آج بھی اپنے باشندوں کے درمیان مساوات کو فروغ نہیں ملا[1]۔ کاش کہ وہ سفاک، وحشی، جابر اور ثقافت تاراج ہوتے (جیسا کہ ان پر الزامات لگانے والے سمجھتے ہیں) تو کم از کم آج صلیبی جنگوں کے حامیوں کی پشت پناہی سے فلسطین، بوسنیا، افغانستان، عراق، چیچنیا اور کشمیر میں مسلمانوں کی نسل کشی نہ ہو رہی ہوتی۔ ہر طرف مسلمان ہوتے اور کوئی طاقت ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکتی۔ مگر لا اکراہ فی الدین کے اصول کی پیروی نے مسلمانوں کو یہ دن دکھا دیے ہیں کہ اپنی بنیاد پرستوں کو ترک نہ کرنے والے متعصب نسل کش الٹا مسلمانوں پر بنیاد پرستی کا الزام لگا رہے ہیں۔ ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ آج کی دنیا میں ویٹو پاور کا بے دردی سے استعمال مسلمانوں کا حق سمجھا جاتا۔ نفاذ شریعت کرنے والے ترک سلاطین کے بارے میں اطہر رضوی صاحب کا یہ کہنا تاریخی حقائق پر مبنی ہے کہ "ترکوں کے عدل وانصاف کی یہ کیفیت تھی تمام کٹر اور تھوڈوکس گرجاؤں اور یہودیوں کی اپنی فعال عدالتیں قائم تھیں[2]۔ مسلمانوں تو بعد کی بات ہیں خود اپنے خلاف عیسائیوں اور یہودیوں کے تشدد پسند،

ریاکار اور متعصبانہ رویوں سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ ان کی غلاظتوں، درشت اطواریوں، کم فہمیوں اور بے وقوفیوں کے بارے میں سیاحوں اور دانشوروں کے بیانات الگ کتاب کے متقاضی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ باشعور مورخ کم و بیش اس امر کا اظہار کر چکے ہیں کہ فلسفے اور سائنس سے نابلد مغربی انسانوں کو مسلمانوں نے نشاۃ الثانیہ کا رستہ دکھایا ہے۔ اسپین کی عظیم تہذیب کو یاد کرتے ہوئے اطہر رضوی صاحب نے درست فرمایا ہے کہ ''عرب اسپین نے اپنی دانش و حکمت، اپنے اصولِ جہاں بانی، اپنے طریق شہریت، اپنے تصور حسن، اور اپنے فنون لطیفہ کے جو نقوش اسلامی تہذیب کی یادداشت پر چھوڑے ہیں وہ لافانی اور لازوال ہیں'' [۳]۔ اور اگر ہم اس رائے کو مسلم دنیا کے ہر علاقے میں موجود ثقافتی ورثوں کے پس منظر میں دیکھیں تو ہمارے دلوں کو مزید سکون اور طمانیت نصیب ہو سکتی ہے کہ ابھی تو ہم اپنی تہذیب کو لارڈ میکالے کی مذہب دوست حکمت عملی کے آئینے سے لے کر مغربی تمدن کی برتری کا نعرہ لگانے والوں کے عطا کردہ چلو بھر پانی تک ہی محدود سمجھنے کا بارگراں اٹھائے ہوئے ہیں۔

اطہر رضوی صاحب نے اپنے عہد کے سیاسی، تہذیبی، معاشی اور سماجی پس منظر، منظر اور پیش منظر پر ایک مفکر مورخ کے مانند غور کرنے کے اپنے پرمایہ وتیرے کو اپنی تازہ کتاب ''کون عبث بدنام ہوا'' میں تخلیقی انداز سے برتا ہے۔ انہیں تاریخ نگاری کے بنیادی تقاضوں سے کما حقہ آگاہی ہے۔ وہ مذہبوں، قوموں اور ملکوں (یہودیت، عیسائیت، اسلام، امریکہ، برطانیہ، سپین، یونان، ترکی، انڈونیشیا، مراکش، الجزائر، سوڈان، لبنان، فلسطین، افغانستان، عراق، اسرائیل وغیرہ) کے تاریخی جوہر کی شناخت کے ضمن میں ان کے انسانی، نسلی، ثقافتی اور تہذیبی عوامل میں پیوست نظر آتی ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ وہ جدید تاریخیت، نو تاریخیت، ساختیات، ڈی کنسٹرکشن اور میٹا لزم کے نئے تصورات سے بقدر ضرورت واقف ہیں۔

''کون عبث بدنام ہوا'' میں اطہر رضوی صاحب نے نوم چومسکی، ایڈورڈ سعید، جان ایل ایسپوزیتو، سیموئیل پی ہنٹنگٹن، مائیکل مور کی کتابوں کے متنی حوالوں کو استعمال کر کے ماضی کے مقاصداتی تاریخی مسلمات کو اپنے ذہن کی تشکیلی خورد بین سے دیکھتے ہوئے جن نئے نتائج کا اعلان کیا ہے ان سے نئے عرض پرانے جوہروں سے مکمل پاک ہونے کے درپے ہیں۔ انہوں مسلم ماضی کی عظمتوں کے تذکرے کے ساتھ ساتھ ان اسباب پر بھی مکمل روشنی ڈالی ہے جن کی وجہ سے سپین، ترکی اور ایران جیسی عظیم مسلم سلطنتیں روبہ زوال ہوکر نئے عصری تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق اپنی بقا کی عظیم جد وجہد میں مصروف ہیں۔ پدرم سلطان بود کی منطق سے ''کون عبث بدنام ہوا'' یکسر خالی دکھائی دیتی ہے۔ اطہر رضوی صاحب نے حسب ضرورت اسلامی تہذیب کے عروجی زمانے کے فلسفیوں، سائنس دانوں اور دانشوروں کی ان کتابوں کا تذکرہ ضرور کیا ہے جن سے یورپی نشاۃ الثانیہ کے امکانات روشن ہوئے۔ ان کے تذکرے کا ذیلی مقصد عہد حاضر کے مسلمانوں کو یہ باور کرانا ہے کہ اگر وہ دنیا میں آگے بڑھنے کے خواب تک رہے ہیں تو انہیں سائنس اور ٹکنالوجی کے ساتھ ساتھ علم کے ہر شعبے میں پوری دیانت اور لگن سے مصروف ہو کر دنیا میں اپنا لوہا منوانا ہوگا۔ خدا نے مسلم ممالک کو قدرتی خزانوں سے مالا مال کر رکھا ہے لیکن کیا کیا جائے یہ خزانے سامراجی جالوں میں پھنسے ان سلاطین اور آمروں کے قبضے میں ہیں جو امت مسلمہ کو بوجوہ آگے بڑھنے سے روگ رہے ہیں۔

سامراجی اطلاعاتی محکموں سے برآمد ہونے والے تصورات انسانوں کو انفرمیشن ٹیکنالوجی کے طلسم کدوں میں پھنسا انفعالی معلومات کا عادی بنا کر دنیا بھر میں قومیتوں کے نام پر نفرتوں اور حقارتوں کے تحائف بانٹ رہے ہیں۔ ایڈورڈ سعید نے اسی پس منظر میں کہا تھا: ''ہر ملک کے سرکاری بیانات، ٹیلی ویژن کے اشتہارات، اور خبریں یعنی ترسیلی وسائل کا سسٹم ان خبروں کو گھڑنے والوں کے مفادات کا عکاس ہوتا ہے'' [۳۴]۔ ان کا کہنا ہے کہ انسانی

آرا مخصوص نکتہ نظر کی نمائندگی کرنے کی وجہ سے غیر جانبدار نہیں ہو سکتیں۔ ایسے ہی خطرناک ماحول میں تاریخی بیانیوں اور عصری رپورتاژوں کے بین السطور چھپے مقاصد کو طشت از بام کرنا تاریخ کی بڑی خدمت انجام دینا ہے۔ ''کون عبث بدنام ہوا'' میں اطہر رضوی صاحب اس فریضے سے پورے طور پر آگاہ دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے زائی نسٹ میڈیا پر نشر ہونے والی انسان دوستی کو بطریق احسن ایکسپوز کیا ہے اور بتایا ہے کہ افغانستان، عراق اور فلسطین میں انسان دوستی کے نام پر کس طرح سے مظالم کو فروغ ملا ہے، میڈیائی بیانوں میں موجود جھوٹ کو ثابت کرنے کے لیے اطہر رضوی صاحب نے وقوعات کے اصل رخ دکھانے کا فریضہ نہایت جرات اور دلیری سے ادا کیا ہے۔ ان میں بظاہر متخالف، متجارب اور اذہان کو مغلوب کرنے والے میڈیائی بیانوں سے صداقت تلاش کرنے کی فکری صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ چنانچہ سامراجی میڈیا کے علاوہ وہ مسلم ممالک کے سرکاری اور غیر سرکاری عصری وسائل ترسیل سے وہ حقیقت تلاش کر لیتے ہیں جسے چھپانے کے لیے جھوٹ کے پلندے سامعین، ناظرین اور قارئین کے سروں پر یوں دے مارے جاتے ہیں کہ انہیں سوچنے کی سدھ بدھ ہی نہیں رہتی۔

مصدقہ تاریخ نگاری کی راہ میں حائل رکاوٹوں میں سب سے بڑی رکاوٹ سرکاری مورخ کی فند بازی ہے۔ اسے مزید واضح کرنے کے لیے در فقطنی آفرینی یا جواز فراہمی کا زاویہ بھی مہیا ہو سکتا ہے۔ ''کون نہیں جانتا کہ سرکاری مورخوں نے فریب، دغا، جھوٹ کی بنیاد پر اپنے ممدوحوں کے عظیم جرموں اور قبیح ترین گناہوں کو ایسے ایسے استعاروں، علامتوں اور لفظوں میں محو و نابود کیا ہے کہ قارئین محو حیرت ہیں کہ وقوعات تو کچھ اور تھے لیکن ان کا بیان کسی اور انداز سے ہوا ہے یعنی قتل کرنے کے بعد بھی لہو بھرے ہاتھوں کو دھونے کی ضرورت محسوس نہیں ہونے دی گئی۔ ظلمت کو ضیا اور صرصر کو صبا لکھنے کی فند بازی کا بھانڈا جناب اطہر رضوی صاحب نے بیچ چوراہے پھوڑا ہے اور فسطائیت دوست، آمریت نواز مورخوں کی گل

کھلاتی تحریروں کو اپنے حسیاتی مطالعوں کی بدولت یوں پرکھا ہے کہ دودھ دودھ نظر آیا ہے اور پانی پانی۔

وقوعات نگاری اور میڈیا جہتی کی فندبازی کو آلڈس ہکسلے نے اپنے ایک مضمون ''ورڈز اینڈ بی ہیویر'' میں سرکاری طرفداروں کو شرم دلا دلا کر بے نقاب کیا ہے اور نوتاریخیت کے ایک خاموش پرستار کی مانند سخن فہمی کی منطق کے علم بلند کیے ہیں۔ ایرک ایس مارگولس نے اپنی کتاب وار ایٹ دی ٹاپ آف دی ورلڈ میں ضیاء الحق کو فاتح جنگ افغانستان اور خاتم اشتراکیت قرار دے کر بقول اطہر رضوی صاحب ضیاء الحق سے اپنی دوستی اور عقیدت کا اظہار ضرور کیا ہے لیکن تاریخ نگاری کی دیانتداری کو پس پشت ڈال دیا ہے۔[5]

مکر کی چالوں سے بازی لے جانے والے جب مکمل طور پر بے نقاب ہوتے ہیں تو ان کے لیے معتبر تاریخ نگاروں کے پاس پاسداری کے الفاظ نہیں ہوتے۔ جنگ عراق کے پس منظر میں یہ حقیقت سامنے آ چکی ہے کہ اتحادی افواج طلب کرنے والے بلیئر اور بش کے لیے جنگی جرائم کی عدالتوں میں مقدمے چلانے کے مطالبے زور پکڑتے جارہے ہیں۔ اول تو یہ جنگ اقوام متحدہ کے عندیئے کے بغیر کذب پروری اور حقائق ریزی کی بنیاد پر میڈیا جہتی کے بل بوتے پر لڑی گئی ہے اور دوسرے عراق سے نیوکلیر، کیمیاوی اور حیاتیاتی ہتھیاروں کا بر آمد نہ ہونا اس جنگ کے جواز کو تاریخ میں مستقل چیلنج کی بنیاد بنائے گا۔ اس میں کوئی نئے ملیسووچوں بلکہ خون بہاتی بلاؤں کے نام آئیں گے۔ افسوس اس دور میں رسل اور سارتر جیسے دانشوروں کا فقدان ہے جنھوں نے ویتنام کے جنگی جرائم کے حوالے سے عالمی ٹریبونل قائم کیا تھا۔ عراق، افغانستان اور فلسطین میں ناحق مارے جانے والے ہزاروں معصوم انسانوں کا خون کن کی گردنوں پر ہے؟ اس ضمن میں اطہر رضوی صاحب کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو: ''امریکہ کی موجودہ تقریباً فسطائی حکومت اب اپنی عراقی استعماری رزم آرائی کے تعلق سے یکے بعد دیگرے دن بدن اندرون ملک اپنی ساکھ کھو رہی ہے بلیری کلنٹن نے اپنی سرگزشت'' لی

ونگ ہسٹری'' میں اور پھر ٹی وی پر انٹرویو دیتے ہوئے کہا'' امریکہ میں سیدھے بازو، کروقدامت پسند، اور بنیاد پرست مذہبی گروہوں کی ایک سازش ہے اور بش ان کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنا ہوا ہے''[۶]۔ اس سلسلے میں مہاتیر محمد کا پراکسی وار کا تصور اور نیلسن منڈیلا کا یہ خیال کہ'' اگر کسی ملک نے دنیا میں ناقابل بیان مظالم روا رکھے ہیں تو وہ امریکہ ہے''[۷] بھی قابل غور ہیں)

''بش کے رفیق اور ہم نوااب اس امر کا اعتراف کرنے لگے ہیں کہ اس نے اور اس کے محاربی ٹولے نے عراق پر جنگ جوئی کے لیے جو جواز پیش کیے تھے وہ دراصل جھوٹ کا پلندہ تھے''[۸]۔

اپنے مصدقہ تاریخی مقدمے:'' کون عبث بدنام ہوا'' میں اطہر رضوی صاحب نے بار بار اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ تاریخ نگار اگر کار جہاں کی بہتر تفہیم اور انسانی مستقبل سازی کے نکتہ نظر سے مملو ہے تو وہ انسانی خدمت انجام دے رہا ہوتا ہے۔ اس کی عقیدت محض اور جذباتیت انسانی اذہان کی درست سمت نمائی کی راہ میں حایل ناقابل عبور چیلنج بن جاتی ہے۔ اس تناظر میں بسا اوقات ایک دیوار قہقہہ قارئین کو ساکت و منجمد کر دیتی ہے۔ اطہر رضوی صاحب کا مصدقہ تاریخی مقدمہ عقل اور عدل کے معیار اور تاریخ و تفکر کی روشنی میں فراہم کیے ہوئے منطقی جوازوں کو تاریخ نگاری کی بنیاد مانتے ہوئے اس امر کا واضح پرچار ہے کہ'' انسانی تاریخ تہذیبوں کی تاریخ ہے۔ تہذیبوں کی سرحدیں نہیں ہوتی ہیں۔ مختلف زمینوں، مختلف نسلوں کے مذاہب، روایات، تمدن، طرز زندگی، اقدار و محرکات کے مجموعے سے کسی تہذیب کا تصور پیدا ہوتا ہے تہذیبوں کا سفر تاریخ کے سفر سے جداگانہ ہوتا ہے۔ سلطنتیں ابھرتی ہیں اور ڈوب جاتی ہیں، حکومتیں بنتی ہیں اور ٹوٹ جاتی ہیں حکمراں دور بہ دور آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، تہذیبیں کبھی سیاست یا اقتدار کے عروج و زوال کی پابند نہیں ہوتیں۔ مذہب تہذیبوں کی بنیادی شناخت ہے اور بقول کرسٹوفر ڈاسن دنیا کی تمام عظیم

تہذیبوں کی بنیاد عظیم مذہبوں کی بنیاد واساس پر قائم کی گئی ہیں۔ چنانچہ رضوی صاحب نے بالکل درست کہا ہے کہ "ایک فرد آدھا الجزائری اور آدھا فرانسیسی تو ہوسکتا ہے لیکن وہ آدھا مسلمان اور آدھا کیتھولک کبھی نہیں ہوسکتا۔"[9] جدید مغربی تہذیب کے پس منظر مین جو مذہبی جنون موجود ہے اس کا مظاہرہ مغلیہ ہند پر انگریزی تسلط کے بعد اس کے متنازعہ حصے بخرے اور جنگ عظیم اول کے بعد اتحادی افواج کے ہاتھوں وسیع وعریض عثمانی سلطنت کے خاتمے کی حکمت عملی اور بعد ازاں مشرقی یوروپ خصوصاً بوسینیا میں مسلمانوں کی نسل کشی، ترکی کی مغرب کی بے پناہ خدمات کے باوجود اس کا یوروپی یونین میں نہ لیا جانا، افغانستان اور عراق کی جنگوں کے حوالے سے صلیبی جنگ کا لفظ استعمال کرنا اور اسرائیل اور بھارت اور روس کی ریاستی دہشت گردی کی پشت پناہی کرتے ہوئے اپنے مقبوضہ علاقوں کو آزاد کرانے کی جنگ لڑتے فلسطینیوں، کشمیریوں اور چیچنیوں کو دہشت گرد قرار دینا مغربی تہذیب میں موجود مذہبی منافرت کے شاخسانے نہیں تو اور کیا ہے۔ اس ساری صورت حال میں امید کا پرچم ہاتھ میں لیے ایک اسلام دوست مورخ یہ کہہ کر کہ "تہذیبیں گردشی خصلت کی ہوتی ہیں کوئی تہذیب کبھی آخری یا دایمی نہیں ہوتی"[10] مسلمانوں کو اپنے عصری ذہنی اور فکری انتشار اور بے یقینی یا عدم خود اعتمادی کے خول سے باہر آنے کی وہ مثبت دعوت دینے کے مترادف ہے جس کے ڈانڈے ترکی میں سلیم سوم کی تنظیمات نو، ایران کے جمال الدین افغانی کی تحریک اتحاد امت، ہندوستان میں سرسید احمد خاں کی اصلاحی تحریک اور اقبال کے تصور عروج ملت، مصر میں سید قطب، محمد عبدہ اور حسن البنا، مراکش میں علال الفاسی، تیونس میں عبدالعزیز، الجزائر میں عبدالحمید ابن بدلیس اور جدید ایران میں ڈاکٹر علی شریعتی کے مسلم احیا کے تصورات سے جا ملتے ہیں۔

(۲)

مغربی تہذیب کو علامہ محمد اقبال نے اپنی مختلف کتابوں اور خصوصاً اپنی دورِ آخر کی

مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' اور علی شریعتی نے اپنے فکری مقالوں میں منطقی اور فکری اعتبار سے ملت اسلامیہ کے لیے خطرے کی گھنٹی قرار دیا ہے۔ ان کے مندرجہ ذیل اقتباسات ملاحظہ ہوں اقبال ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' میں کہتے ہیں: ترجمہ

''جب تک تو رزق حلال کا نکتہ نہیں مانا جائے گا: تیری جماعت پر زندگی و بال ہی رہے گی: افسوس کہ یورپ اس مقام سے آگاہ نہیں ہے: اس کی آنکھ اللہ کے نور کو دیکھنے والی نہیں ہے: اسے حلال اور حرام کے بارے میں خبر نہیں ہے: اس کی حکمت خام ہے اور اس کا کام نامکمل: ایک قوم دوسری قوم پر پل پڑی: اس نے اناج اگایا اور وہ اس کا حاصل لے گئی: ضعیفوں کی روٹی اڑالینا حکمت ہے: نئی تہذیب کا شیوہ آدم دری ہے: آدم دری کا پردہ سوداگری ہے: یہ بینک کہ جو یہود کی چالاک فکر کا نتیجہ ہیں: وہ انسان کے سینے سے نور حق چھین لے گئے ہیں: جب تک یہ نظام تہ و بالا نہیں ہوتا: دانش تہذیب اور دین خام مال ہیں'' (در اسرار شریعت)

''مشرق اور مغرب تو آزاد ہیں: ہم ہی غیروں کا شکار ہیں: ہماری اینٹ غیروں کی تعمیر کا سرمایہ ہے: دوسروں کے مقصد لیے جینا گہری نیند نہیں مرگِ جاودانی ہے: ہندوستانی ایک دوسرے سے برسر پیکار ہیں: انہوں نے پرانے فتنوں کو پھر سے جگا دیا ہے: یوں فرنگی مغربی زمین کے باشندے کفر اور دین کے جھگڑے میں ثالث بن گئے''[11] (ہندوستانیوں کے نفاق پر چند آنسو)

سیاسیات حاضرہ نے بقول اقبال غلاموں کی زنجیر کو سخت تر کیا ہے۔ مغربی جمہوریت ملوکیت کا نیا روپ ہے جب یوروپی ارباب نے جمہور کے ہنگامے کی گرمی دیکھی تو آزادی انسانی حقوق اور نیشنلزم وغیرہ کے نام پر انہوں نے اپنا کام پختہ کیا اور دیگر نظاموں کو ناپختہ قرار دیا۔ اقبال نے انسان سے بار بار یہ اپیل کی ہے کہ اگر وہ آزادی کا طلبگار ہے تو اسے یوروپی یا مغربی پیچاکوں میں نہیں الجھنا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں (ترجمہ)

"پیا سارہ لے لیکن اس کے انگوروں کی نمی میں نہ کھو: اس کی گفتار کی گرمی سے بچ: اس کے پہلو دار حرف سے حذر کر: اس کے سرمے سے آنکھیں اور زیادہ بے نور ہو جاتی ہیں: غلام انسان اس سے اور زیادہ غلام ہو جاتا ہے: اس کے پیالے کی شراب سے محفوظ رہ: اس کے جوئے کی ہرا دینے والی چال سے بچ: مرد حر اپنی خودی سے غافل نہیں ہوتا: اس کی افیونی گولی نہ کھا: اپنی حفاظت خود کر: فرعونوں کے آگے موسیٰ گفتار بن"[12]

اقبال اس بات سے بھی نالاں تھے کہ مسلم قیادت نور روح سے خالی سیم پرست جاہ مست اور کم نگاہ ہے۔ اس کا باطن خدا سے خالی ہے ہمارے قائدین حرم میں پیدا ہو کر کلیسا کے مرید ہو جاتے ہیں۔ بانگ درا سے ارمغان حجاز تک اقبال نے اتحاد بین المسلمین پر بہت زور دیا اور اکثر فرمایا کہ مسلمان ایک قوم تھے اب کئی قدموں میں بٹ گئے ہیں اپنی بزم کو انہوں نے خودی کی زنجیر سے چھٹکارا حاصل کیا اور اپنی موت کو آواز دی۔ وہ فرنگیوں کے ساتھ پیوست ہو چکے ہیں اور فرنگی افسوں سے بے خبر ہیں۔ اگر انہیں اس جادو سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تمنا ہے تو سب سے پہلے اجارہ دار مغربی طاقتوں کی آستین میں چھپے فتنوں کو پہچاننا ہوگا۔ اقبال مسلمان سے کہتے ہیں ترجمہ

"اگر تو اس کے فریب سے امان چاہتا ہے تو
اس کے اونٹوں کو اپنے حوضوں سے بھگا دے"[13]

یوں کھل کر اس امر کا اظہار کر رہے ہیں کہ مغربی فلسفہ صارفیت نے مسلمانوں کو اشیا کا غلام بنا دیا ہے۔ وہ فاقہ کش اپنے مقام سے آگاہ نہ ہونے کے سبب دست فرنگ سے اپنی پاک جان کے عوض جو کی روٹی اور لات ومنات خریدتے ہیں۔ یورپ نے بقول اقبال دنیا میں لادینیت کی طرح ڈالی ہے اس نے اپنی ہی شمشیر سے اپنی شہ رگ کاٹ لی ہے۔ وہ تو میمنے کی پوستین میں مستور بھیڑیا ہے۔ وہ بھیڑیا جو ہر پل کسی میمنے کی گھات میں ہے۔ فرنگیوں کی دانش نے تلوار سونت رکھی ہے جہاں کہیں انہیں انسان دکھائی دیتا ہے اور اسے مارنے کے

درپے ہوتے ہیں۔ نئے یورپی سوداگر دیدہ دلیری سے میمنے کے بھیڑیوں پر حلال ہونے کا فتویٰ صادر کررہے ہیں۔ نیو ورلڈ آرڈر کے مقابلے میں کسی نئے نظام کی بنیاد ڈالنی چاہیے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ کفن چوروں سے فراخی قلب کی امید رکھنا بے سود ہے۔ بڑی طاقتوں کے باہمی سمجھوتے مکروفن کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ یہ معاہدے بھی بندر بانٹ کے لیے ہوتے ہیں یعنی ایک طاقت کا شکار اگر ایک بھیڑ ہے تو دوسروں کا نخچیر دوسری۔ کئی آشوب روزگار اور فتنہ انگیز نکتے ان کی ظاہری گفتگو کا حصہ نہیں بنتے۔[۱۴]

ڈاکٹر علی شریعتی کا کہنا ہے۔

"یورپ میں امراء اور سرمایہ داروں کی مدد سے سترہویں اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے دوران مشینوں نے ترقی کی مشین متواتر کھپت کی ضرورت پیدا کرتی ہے۔ سو زائد یا فاضل پیداوار کے لیے قومی حدود سے نکل کر بین الاقوامی منڈیوں کی ضرورت پیش آئی یوں یہ طے کرلیا گیا تھا اس زمین پر بسنے والا ہر انسان کارخانوں میں تیار ہونے والی تجارتی اشیا کا صارف ہو کے رہے گا۔ مقامی انسانوں کو نئی اشیا کا صارف بنانے کے لیے ان کے مزاج کی تبدیلی ناگزیر ٹھہری اور لباس، کھپت کے طریقے، سامان آرائش، رہائش اور شہر کو تبدیل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ان معاشروں کی قلب ماہیت کی جاتی تا کہ یوروپی، افریقی اور ایشائی معاشرے یا باالفاظ دیگر دنیا کے تمام انسان باہمی طور پر ہم آہنگ ہوسکیں۔ اقوام عالم کی روحوں اور سوچوں کے اختلافات کو ختم کرنے کے لیے انہیں ایک سانچے میں ڈھالنا ضروری تھا یوں جدیدیت کے نام پر دنیا کو ایک نئی تہذیب کی خوش خبری دی گئی۔[۱۵]

اس جدیدیت کی یلغار دانش وعلم کے وسیلے سے کی گئی تاریخ، اخلاقیات نفسیات، معاشیات، سماجیات، ادب وفن اور سائنسی علوم میں نئے نظریات کو فروغ دیا گیا اور مقامی دانشوروں اور درسگاہوں میں انہیں رائج کیا گیا۔ یوں ایسے لوگ پیدا ہوئے جو اپنی تہذیب سے بیگانہ ہوگئے تھے اور مغربی تہذیب کے چنگل میں پھنس گئے تھے۔ اقبال کے دور میں

دنیا کے بیشتر ممالک پر مغربیوں کے براہ راست قبضے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد بہ امر مجبوری یہ پالیسی تبدیل ہوئی اور مشینی پیداوار کے ذریعے نو آزاد ممالک کی منڈیوں پر قبضے کیئے گئے۔ اقبال نے ان کی اس روش کو بہت پہلے بھانپ لیا تھا۔ اور مغربی تہذیب و انداز معیشت کے ضمن میں کہا تھا ترجمہ:

"اے رنگ کے حصار میں جکڑے انسان رنگ سے پاک ہو۔ ہمارا زخم اس کی دین ہے۔ نشتر بھی اسی کا ہے سوئی بھی۔ ہم ہیں خون کی ندی ہے اور رفو کی آس ہے۔ تو خود جانتا ہے کہ بادشاہی غلبہ پانے کا نام ہے۔ ہمارے عہد میں سوداگری کا غلبہ ہے۔ دکان کا ایک تختہ تخت و تاج کا شریک ہے۔ تجارت کا مدار نفع پر ہے۔ اور بادشاہی کا خراج پر۔ آج کی دنیا کا حاکم سوداگر ہے۔ اس کی زبان خیر اندیش ہے اور دل شر پسند۔ تو اگر اس کا کاروباری دیانت کا مداح ہے تو بس اتنا جان لے۔ اس کے ریشم سے تیری کپاس نرم ہے۔ اس کے کارخانے سے بے نیازانہ گزر جا۔ موسم سرما میں اس کی پوستین مت خرید۔ جنگ اور ضرب کے بغیر انسانوں کو قتل کرنا اس کا دستور ہے۔ اس کی مشینوں میں موتیں گردش کرتی ہیں۔ اس کے قالین کے عوض اپنا بوریا نہ دے۔ اس کے فرزیں کے بدلے اپنے پیادہ نہ مروا۔ اس کا موتی ناقص ہے اور اس کے لعل میں بال آیا ہے۔ اس سوداگر کی مشک کتے کی ناف سے نکلی ہے۔ تیری آنکھیں اس کی بنائی مخمل سے مسحور ہیں۔ اور تو اس کے رنگ اور چمک کے ہاتھوں لٹ گیا ہے۔ تو نے اپنے معاملے میں سوگرہیں ڈال لی ہیں۔ اپنی دستار کو اس کے ریشم سے نہ بنا۔ کوئی بھی ہوشمند اس کے مٹکے کی شراب نہیں پیتا۔ جس نے اسے چکھ لیا وہ وہیں اسی شراب خانے میں دم توڑ گیا۔ وہ مسکراتا زیادہ ہے اور شور کم مچاتا ہے۔ ہم بچوں کی مانند ہیں اور وہ چینی بیچ رہا ہے۔ یارب یہ سوداگری ہے یا جادوگری۔ رنگ اور خوشبوؤں کے تاجر منافع سمیٹ لے گئے۔ ہم ان کے اندھے اور ناشناس خریدار ہیں۔ اے آزاد انسان جو کچھ تیری مٹی میں نمو پاتا ہے۔ اسے بیچ، اسے پہن، اسے کھا۔ وہ نیک روحیں کہ جنھوں نے اپنے آپ کو پہچان لیا

ہے۔ انہوں نے اپنی گدڑی تک خود بنائی ہے۔ تو کہ عصر حاضر کے وتیرے سے بے خبر ہے۔ کھلی آنکھوں سے یورپ کی چیرہ دستیاں دیکھ۔ وہاں کے تاجروں نے تیرے ابریشم سے قالین بنائے اور پھر انھیں بیچنے کے لیے تیرے سامنے لا ڈالا۔ تیری آنکھ نے اس کے ظاہر سے دھوکا کھایا۔ تجھے اس رنگ اور چمک نے کہیں کا نہ رکھا۔ حیف ہے اس دریا پر کہ جس کی موج میں تڑپ کم تھی۔ اس نے اپنے ہی موتی کو غوطہ خوروں سے خریدا۔''[۱۶]

آج مسلمانوں کے لیے پہلے سے کہیں زیادہ ضروری ہے کہ وہ مغرب اور ان کے حلیفوں کے تاجرانہ اور صارفانہ چنگل سے باہر نکلیں اور خود انحصاری اور قناعت کے راستے پر چل کر اپنی دولت اور تہذیب کو برباد ہونے سے بچائیں۔ اپنی تجارتی پالیسیوں پر نظر ثانی کرتے ہوئے مسلم علاقوں پر مشتمل عالمی مسلم مارکیٹ کے قیام کے لیے کوشاں ہوں۔ اپنے معاشی اور علاقائی دفاع کے لیے مل جل کر منصوبے بنائیں اور اس دولت کو واپس لینے کا لائحہ عمل تیار کریں جو مختلف حیلوں بہانوں سے مغربی ہم سے چھین لے گئے ہیں۔ بوسنیا، کشمیر، قبرص۔ فلسطین اور دیگر مسائل کو مغربیوں کی اعانت مفادانہ سے بچ کر اپنے وسیع تر مفاد میں خود حل کر سکیں۔

اطہر رضوی صاحب کو مسلم تاریخ سے گہری وابستگی ہے۔ ان کی کتابوں کے سیاحتی حصوں کے مطالعہ سے قاری کو ان کی اسلامی اقدار سے دلچسپی کا سراغ ملتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی ارکان کو ماننے والے ایک غیر متعصب پختہ عقیدے کے مسلمان ہیں۔ انہیں اسلامی تاریخ خصوصاً عثمانی اسلامی تاریخ سے اس قدر لگاؤ ہے کہ وہ اس سے متعلق اہم اور غیر اہم جزئیات پر مکمل عبور رکھتے ہیں۔ ترکی میں سکالروں کے درمیان پانچ برس رہ کر بھی میں ان جزئیات سے بہت کم واقفیت حاصل کر پایا ہوں جو اطہر رضوی صاحب نے اپنی دو انتہائی تحقیقی اور فکری سعی کی کتابوں ''کون عبث بدنام ہوا'' اور تاریخ کا سفر بلکیدیا سے بوزنیا تک[۱۷] میں درج کردی ہیں۔ وہ جہاں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے

راشدین اور ائمہ مطاہرہ اور اسلام کی خدمت کرنے والے سلاطین اور اس کے لیے لافانی کارنامے سرانجام دینے والے عظیم انسانوں کی تعریف میں سراپا عقیدت بن جاتے ہیں وہاں وہ اسلام سے نابلد مسلمانوں اور اس کے نادان دوستوں کے خرافات آشنا اعمال و واقعات پر شدید ردعمل کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ ''کون عبث بدنام ہوا'' میں اطہر رضوی صاحب نے مسلم تاریخ پر تحقیق کرنے والے مستشرقین کی کتابوں سے خاصا استفادہ کیا ہے[18]۔ اور دیانتداری سے ان کی انتھک ریسرچ، عالمانہ تحقیق اور عرق ریز مطالعے کو خلوص دل سے سراہا ہے۔ وہ اس بات پر بھی فخر کرتے ہیں کہ مسی ساگا کی مرکزی لائبریری میں جو کینیڈا کی بڑی لائبریریوں میں شمار نہیں کی جاتی مغربی مصنفین کی لکھی ہوئی سلطنت عثمانیہ پر پچاس سے زائد اور مسلم اسپین پر ان سے کہیں زیادہ کتابیں موجود ہیں۔ اطہر رضوی صاحب کا کہنا ہے: ''اسپین پر عربوں نے سات سو اکیاسی سال حکومت کی اور وہاں انہوں نے سلیمان اعظم کے دور تک تین براعظموں پر اپنی سلطنت کا جھنڈا نصب کیا۔ وسط ایشیا کی ساری مملکتوں میں جہاں جہاں اپنی تاریخ، ثقافت اور گمشدہ عظمت کی تلاش میں وطن پرستوں نے ایک نئی جدوجہد شروع کی ہے مجھے اس جدوجہد سے گہری دلچسپی ہے۔''[19]

''کون عبث بدنام ہوا'' کا عنوان ہی اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اطہر رضوی صاحب عصری مسلمانوں کے اختیار کے خلاف سامراجی اور میڈیائی پراپیگنڈے کو ناحق سمجھتے ہیں اور دہشت گردی کے اسباب وعلل کے مدنظر مغربی کٹھ پتلی تماشوں کو تمام تر بے امنی اور لاقانونیت کا ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ اس کی دلیل ان کے نزدیک یہ ہے کہ طالبان بنانے والے بھی وہ ہیں اور عراق کو کیمیاوی ہتھیار فراہم کرکے ایران اور کردوں کے خلاف استعمال کرنے کی ترغیب دینے والے بھی وہ ہیں۔ اور اب لومڑ بہانوں سے عراق میں داخل ہو کر عراق کے اپنے ملک کو سامراج کو پنجوں سے بچانے والے مجاہدوں پر دہشت گردی کا الزام لگانے والے بھی وہ ہیں۔ جب اسرائیل کے لیے لڑی جانے والی پراکسی جنگوں کا خاتمہ ہو جائے گا تو دنیا سے

سامراج کی پالیسیوں کے ردعمل کے طور پر پیدا ہونے والی دہشت گردی بھی ختم ہو جائے گی۔ گزشتہ کئی برسوں سے فلسطینی قابض اسرائیلی فوجوں کے ہاتھوں مارے جا رہے ہیں اور لاچاری میں خودکش حملے کر رہے ہیں لیکن میڈیائی جہت نمائی نے دنیا بھر میں انسان دوستی کا دعوی کرنے والے لوگوں پر ایسا نفسیاتی دباؤ ڈال رکھا ہے کہ وہ اپنے ملک کا قابض افواج سے چھڑانے کے لیے جو مزاحمتی جنگ لڑ رہے ہیں اسے دہشت گردی کا نام دیا جا رہا ہے۔ کشمیر، فلسطین، چیچنیا، عراق اور افغانستان سے اگر غیر ملکی افواج نکل جائیں تو ان سب خطوں میں امن قائم ہوسکتا ہے۔ ایسا امن آج ویت نام، الجزائر، مراکش اور دنیا بھر کے فرانسیسیوں، انگریزوں، روسیوں، پرتگالیوں وغیرہ ہم سے آزاد ہونے والے اکثر ایشائی، افریقی اور یوروپی مسلمان ممالک میں ہے۔

''کون عبث بدنام ہوا'' میں اطہر رضوی صاحب نے مسلمانوں کو خود احتسابی کی دعوت دیتے ہوئے ان میں موجود جہالت، پدر سلطانی، فرقہ واریت، عاقبت نا اندیشی، ضرر رساں جذباتیت، خودغرضی اور نفسانفسی کے رویوں کی نشاندہی کی اور کہا ہے کہ جب تک وہ ان کی بیخ کنی نہیں کریں گے زمانے بھر کی رسوائیاں اور ذلتیں ان کے حصے میں آتی رہیں گی۔

(۳)

اطہر رضوی صاحب کی غالب دوستی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، میں آپ کو یہ شعر سناتے ہوئے کہ ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر.......... کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے۔

غالب مردہ پرستی کے حق میں نہیں تھے۔ غالب نے انگریزی تہذیب و ثقافت کے حوالے سے بعد میں بھی بہت کچھ لکھا حتی کہ اپنی کتاب دستنبو میں فرنگیوں کو بہت حد تک مظلوم و مجبور بھی ٹھہرایا اور اپنی طرف سے انگریزی حکومت کی اطاعت کا اخباری اشتہار بھی شائع کروایا اور صاحبان عالی شان کے قصائد بھی لکھے۔ ان میں سے بہت سی باتیں تو انہوں نے

اپنی جان بخشی کروانے اور سکہ نویسی کا الزام دھونے کی وجہ سے لکھیں لیکن جب سر سید احمد کو وہ نئی انگریزی ایجادات و علوم کے بارے میں بتا رہے تھے تو اس قسم کا کوئی دباؤ ان پر نہیں تھا۔ کعبہ اور کلیسیا کے مابین کشمکش انہیں بہت پہلے نظر آ گئی تھی۔ سر سید کی توجہ نئی عالمی وعلمی وفکری تبدیلیوں کی جانب دلا کر انھوں نے اس عظیم مصلح کی رہنمائی کی جس نے آگے چل کر مسلمانوں کو ہندوستان میں اپنی غلامی کے باوجود سر اٹھا کر چلنے کا حوصلہ اور مان دیا۔ غالب انگریزوں کے رائج کردہ قوانین کو سراہتے ہوئے انہیں حیرت انگیز قرار دیتے ہیں۔ مغربی سائنسدانوں اور ہنر مندوں کی ہنر مندی اور ایجادات کو اپنے پیش رووں پر سبقت لے جانے والا سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کسی ملک کے نظم ونسق کی بنیاد اس کا دستور ہے اور فی زمانہ اس معاملے میں فرنگیوں سے کوئی بہتر نہیں ہے۔ وہ نہ صرف انصاف اور دانش کو باہم مربوط کرنے والے ہیں انہوں نے ہند کو کئی قسم کے قوانین فراہم کیے ہیں۔ انہوں نے چقماق کی جگہ تنکے سے آگ پیدا کی ہے۔ ان کے دخانی جہاز سمندروں کو مسخر کر رہے ہیں۔ ریل گاڑی بہت تیزی سے دشت وصحرا پار کرتی ہے۔ انہوں نے بے تار برقی ایجاد کی اور تیزی سے پیغام رسانی کا بندو بست کیا۔ انہوں نے ساز سے مضراب کے بغیر نغمے نکالے ہیں اور لفظوں کو پرندوں کی مانند اڑایا ہے۔ غالب اگر چہ لندن نہیں گئے تھے لیکن وہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اس شہر نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ وہ ایک روشن باغ کی مانند ہو گیا ہے اس میں بغیر چراغ کے شہر روشن ہو جاتا ہے۔ فرنگیوں کے موجودہ آئین کے سامنے دوسرے آئین پرانے ہو گئے ہیں۔ غالب جان چکے تھے کہ کلیسائی تہذیب اور انگریزی ثقافت اپنے جال اس حد تک پھیلا چکے ہیں کہ ان سے بچ کے نکلنا محال ہے اس لیے جہاں انھوں نے کلیسا کے آگے اور کعبہ کے پیچھے ہونے والی بات کہی اور دونوں کے مابین موجود کشاکش و کشمکش کا ذکر کیا وہاں سر سید احمد کی کتاب تصحیح آئین اکبری کی منظوم فارسی تقریظ لکھتے ہوئے انھوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر اب نئے خیالات و دساتیر کو حاصل کرنا ہے تو ہمارے ادیبوں

اور دانشوروں کو مغرب میں ہونے والے تحقیقی تخلیقی اور سائنسی کاموں کی جانب رجوع کرنا ہوگا۔ اس تقریظ کا ترجمہ کچھ یوں ہے۔

''یاروں کو نوید ہو کہ سید کی توجہ کی بدولت اس پرانی کتاب کا دروازہ کھلا ہے، آنکھ کی بینائی اور بازو کو طاقت میسر آئی ہے۔ کہنگی نے نیا لباس پہنا ہے، آئین کی تصحیح کا کام ان کی ہمت والا کے مقابلے میں باعث ننگ و عار ہے، وہ دلی طور پر اس شغل سے وابستہ ہوئے اور اپنے لیے مسرت کا سامان پیدا کیا اور اور رائگاں کام کیا۔ اگر کوئی ان کے گوہر کی تعریف نہیں کرسکتا تو ان کے اس کام کی بدولت ان کا مداح ہو جائے گا۔ جس کام کی اصل ایسی ہو اسے وہی سراہے گا جس کا طور طریقہ ریا کاری ہے، میں کہ ریا کاری کے دستور کا دشمن ہوں اور مجھے اپنی وفا کا از خود اندازہ ہے میں اس کے اس کام پر اگر آفرین نہیں کہتا تو یہ میرے لیے آفرین کی جا ہے۔ میں شاعری میں بے آئین لوگوں کی مثل نہیں ہوں، فن شعر کے بارے میں جو کچھ مجھے معلوم ہے کوئی نہیں جانتا، زمانے میں اس متاع کا کوئی خریدار نہیں، سید کو اس سے نفع کی نہ جانے کیوں امید تھی، انہوں نے خیال کیا ہوگا کہ یہ بلند پایہ دفتر ہے تا کہ اس کی مدد سے وہ کچھ دیکھا جائے جسے دیکھا جانا چاہیے۔''

اگر آئین کے بارے میں ہم سے پوچھا جائے تو ہم کہیں گے کہ اس پرانے بت خانے میں آنکھیں کھول کر انگلستان کے صاحبوں کو دیکھو، ان کے انداز اور طور طریقے کو دیکھو، انہوں نے کیسے کیسے قوانین کو رائج کیا ہے، جو کچھ کسی نے نہیں دیکھا تھا اسے وجود بخشا ہے، ان ہنرمندوں نے ہنرمندی میں اضافہ کیا ہے، ان کی سعی ان کے پیش رووں پر سبقت لے گئی ہے، آئین رکھنا اسی قوم کا حق ہے کہ ملکی نظم و نسق میں ان سے کوئی بہتر نہیں ہے، انہوں نے انصاف اور دانش کو باہم مربوط کیا ہے اور ہند کو صد گونہ قوانین فراہم کیے ہیں وہ آگ کہ جو پتھر سے نکالتے تھے ان ہنرمندوں نے اسے خس سے پیدا کیا ہے، انہوں نے پانی پر کیسا جادو کیا ہے کہ دھواں کشتی کو پانی میں چلاتا ہے'' کبھی بھاپ کشتی کو جیحوں (دریا) میں لے جاتی ہے

اور کبھی بھاپ کو دشت میں لے جاتی ہے، بھاپ مشین کے پرزوں کو گھماتی ہے وہ بیل اور گھوڑے کی مثل بھاگتی ہے، بھاپ سے چھوٹی کشتی رفتار پکڑتی ہے، اس کے سامنے موج اور ہوا دونوں بے بس ہو جاتے ہیں۔ وہ ساز سے مضراب کے بغیر نغمے نکالتے ہیں اور حرف پرندوں کی مانند اُڑنے لگتے ہیں، کیا تو نہیں دیکھتا کہ یہ دانا گروہ بات کو دو لمحوں میں سو کوس سے لے آتا ہے، یہی لوگ ہوا میں یوں آگ لگا دیتے ہیں کہ وہ اخگر کے مانند روشن ہو جاتی ہے، لندن جاؤ کہ اس رخشندہ باغ میں بغیر چراغ کے شہر روشن ہو جاتا ہے، ان ہشیار مردوں کے معاملات کو دیکھو۔ ان کے ہر آئین میں کئی سو نئے آئین ملاحظہ کرو، ان کے آج کے زمانے کے دستور کے سامنے دوسرے آئین پارینہ ہو گئے ہیں۔

اے بیدار مغز عاقل انسان کتاب میں اس طرح کے بیش قیمت و تیرے موجود ہیں، جب کوئی اس قسم کے موتیوں کا خزانہ دیکھ لیتا ہے تو پھر وہ اس خرمن کی خوشہ چینی کیوں کر کرے گا۔ اگر تو سوچتا ہے کہ اس کا طرز تحریر عمدہ ہے تو جو تو سب سے بہتر جانتا ہے اس سے بھی بڑھ کر ہے، ہر عمدہ کام سے بڑھ کر عمدہ کام بھی موجود ہوتا ہے، اگر سر موجود ہے تو تاج بھی تو موجود ہوگا، خدائے فیاض کو بخیل شمار نہ کر، اس نخیل سے اب بھی تازہ کھجوریں دستیاب ہیں، مردوں کو پالنا مبارک کام نہیں ہے، تو خود ہی بتا کہ اس کے علاوہ اور کوئی معاملے نہیں ہیں۔

غالب خاموشی کا دستور دلکش ہے اگر چہ تو نے عمدہ بات کہی ہے تاہم اس کا نہ کہنا اور بھی عمدہ ہوتا، دنیا میں تیرا دین سید پرستی ہے تعریف سے گریز کر اور دعا دے کہ یہ تیرا دستور ہے۔ اس سراپا صاحب دانش سید احمد خان عارف جنگ پر کرم خداوندی ہو کہ وہ جو بھی چاہیں اس سے پالیس خوش قسمتی ان کی خادم بنی رہے۔"[۲۰]

"کون عبث بدنام ہوا" میں اظہر رضوی نے اپنے ممدوح غالب اور عہد نو کے مسلم مصلحین کی آوازوں پر لبیک کہتے ہوئے اس امر کا کھل کر اظہار کیا ہے کہ:

''ان سب دانشوروں کا مجموعی اور مشترکہ خیال یہی تھا کہ اسلام کی تعلیمات مغرب کی جدید فکر اور سائنس کو نہ صرف قبول کرنے کی اجازت دیتی ہے بلکہ وہ قرآن مجید کی روشنی میں اس کی حمایت کرتی ہے۔ وہ مغرب کی اخلاقیات اور استعماریت کے مکر وفن کے سخت مخالف تھے لیکن اس کی سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی، سیاسی فکر کی آزادی، اختلاف رائے کی برداشت، جواب وہ حکومت اور حق انتخاب کی خوبیوں کی اسلام کے نظام زندگی میں شمولیت کے حامی تھے''۔[۲]

اقبال نے ایک زمانے میں کہا تھا کہ اگر عالم مشرق کا جنیوا تہران ہو جائے تو شاید کرہ ارض کی تقدیر بدل جائے۔ اطہر رضوی صاحب نے اپنی کتاب میں کھل کر لکھا ہے کہ مغربی سیاست سے خیر توقع عبث ہے۔ اس وقت اسلامی دنیا کو ایک ایسے فکری اور سیاسی مرکز یا ادارے کی ضرورت ہے جو اس کو مغرب کے اوچھے واروں سے قبل از وقت آگاہ کرے اور ان سے محفوظ رہنے کے لیے مناسب طریق ہائے کار کی نشاندہی کرے۔ یہ کام کسی حد تک تن تنہا اطہر رضوی صاحب نے کرنے کی طرف پہلا قدم اٹھایا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ کارواں بنانے کے لیے مسافر کب شریک سفر ہوتے ہیں۔ انھیں اسلام کی عقلی اور سائنسی تعبیر پسند ہے کیوں کہ اسی کی بدولت حقیقی اور متحرک فکر کی آئینہ بندی ہو سکتی ہے۔ وہ آئین نو کے علمبردار ہیں اور طرز کہن پر اڑنے کو جہالت کا نام دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں اسلام کی نئی تعبیر ہی مسلمانوں کو مغرب کی اندھی تقلید سے محفوظ کر سکتی ہے۔ اطہر رضوی صاحب کا تصور تہذیب انہیں اپنی تخلیقی جڑوں کی جانب لوٹنے کا پیغام دیتا ہے۔ اس تہذیب نے غور وفکر اور حصول علم پر بنیادی توجہ دی ہے۔ وہ اس تناظر میں قارئین کو مشتے از خروارے الرازی، ابن سینا، البیرونی، ابن رشد، ابن خلدون، ابن تیمیہ، ابن بطوطہ، الادریسی اور عباس ابن فرناس کے نام یاد دلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان عظیم مسلم شخصیتوں نے:

''جغرافیہ، معدنیات، باغبانی، نباتات، حیوانات، کیمیا، طبیعات، فلکیات، ریاضیات،

طب، فلسفہ، منطق، تاریخ نگاری کے فنون یورپ کے حوالے کیے۔''

اس کی تصدیق وہ ہسٹری آف میڈیول اسلام نامی کتاب کے مصنف جے جے مینڈرز سے کرواتے ہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے اندلس کی سوغات کے عنوان سے معتبر حوالوں کی روشنی میں لکھا ہے ''اسپین کی سرزمین پر عربوں نے جو علمی، ثقافتی، تہذیبی اور دانشورانہ سوغاتیں چھوڑی ہیں وہ ہندوستان میں مغلوں؛ مصر میں فاتمیوں، بلقان میں ترکوں، ایران میں صفوی سلطنتوں کی یادگاروں سے عظیم تر ہیں'' ۲۲

اس کی تصدیق اطہر رضوی صاحب نے پال کولز مصنف کتاب ''دی اوٹومن ایمپیکٹ آن یورپ'' سے کروائی ہے۔ ان حقائق کو مزید وزن عطا کرنے کے لیے ((جرنیٹو عرب پین از) حبیب سیلوم، ڈسمنڈ ٹوٹو، گساوڈیرک، (عربزان ہسٹری از) برناڈ ڈلیوس اور (مایلز سٹونز از) سید قطب کے خیالات پیش کیے گئے ہیں۔ اس پس منظر میں اگر مذہبی مقاصد سے شرابور مرکزی مغربی میڈیا مسلمانوں کو بنیاد پرست، مذہبی انتہا پسندی کی علامت، جاہل، جارحیت پسند اور عیش کوش دکھا، سنا اور پڑھا رہا ہے تو اس کا منہ توڑ علمی جواب دینا ہمارے دانش وروں کا بنیادی فریضہ ہے۔

(۴)

آیئے اس مقام پر ہم فرانز فینن کی کتاب دی ریچڈ آف دی ارتھ کو یاد کریں جس میں آبادیاتی اور نوآبادیاتی سائیکی میں موجود اس سامراجی فسطائیت کی متعدد شکلیں دکھائی گئی ہیں جس کا بنیادی مقصد مقامی باشندوں کی توہین، تذلیل اور تعدیم ہوتا ہے۔ اس ضمن میں کارل مارکس، ماؤزے تنگ، ہوچی منہ، انٹونیو گرامچی، ژاں پال سارتر، البرٹ کامیو، علامہ محمد اقبال، ڈاکٹر علی شریعتی، ایرک فرام، ہربرٹ مارکیوز، ایڈورڈ سعید اور نوم چومسکی کے نظریات قارئین کی نظری تربیت میں مزید معاونت کر سکتے ہیں۔ سامراجیت کی جڑیں مضبوط کرنے والے فلسفوں کو ذکر طول کلام کا باعث ہوگا ورنہ تجربیت، منطقی اثباتیت، ساختیات، پس

ساختیات کی آڑ میں بر کلے، ہیوم، کارنیپ، اوٹونیورتھ، پی فرینک، کے گوڈل، اے جے ایر، ڈبلیو موریس وٹ گن سٹائن، کے برکے، ایف ڈی ساسیر، ڈبلیو کاڈویل، بی ملینووسکی، ڈی ریویریا، ژاک ڈریڈا، جے لاکاں، جے کاف مان نے جدید اذہان پر جس سامراجی فکر کو مسلط کیا ہے اور اپنے تاریخی، ادبی، لسانی، عمرانی، نفسیاتی، انسانیاتی، صوتیاتی، علمیاتی اور جمالیاتی تجزیوں کی آڑ میں جو شکار کھیلے ہیں ان کے طشت از بامی مطالعے کے لیے کئی طویل جلدی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ اس جملہ معترضہ کے لیے یہاں کتاب اور ینٹلزم کا حوالہ بے جا نہ ہوگا جس میں ایڈورڈ سعید نے مستشرقین کے قومی اور نسلی مقاصد کو پردہ چاک کرتے ہوئے اٹھاویں صدی کے مستشرقین نپولین، ڈی لیسپس، بل فور، کرومر کارلائل کی اس منطق پر تنقید کی ہے کہ جو مشرق پر مغرب کے غلبے اور نئی منڈیوں کی تلاش کا پیغام دے رہی تھی۔ انیسویں صدی میں شلیگل، گوبینو، م رینان، پامر، ڈوزی پمبولوت، میور وغیرہ کی تحریروں میں جہاں اعلیٰ سطحی مقاصد تحقیق کے دروا ہوئے وہاں ان میں یوروپی تعصبات کی کئی شکلیں بھی نمودار ہوئیں۔ فورٹ ولیم کالج، رائل ایشیاٹک سوسائٹی، امریکن اورینٹل سوسائٹی وغیرہ میں ہونے والے کاموں نے آبادیاتی غلبوں کی حکمت بند پیش بندی میں اہم کردار ادا کیا، سیاحوں اور ینٹل کے تاجروں کے روزناموں میں موجود مقامی مشاہدوں نے اس عہد کی مغربی عسکری طاقتوں کے لیے مستقبلی منصوبے بندیوں کے تجرباتی سامان فراہم کیے، بقول ایڈورڈ سعید "انیسویں صدی کے آخر تک مستشرقین کے یہ کارہائے نمایاں یوروپ کے سیاسی غلبے سے بے رنگ ہو گئے، اور ۱۹۱۸ء میں دولت عثمانیہ کے حصے بخرے کے نتیجے میں مشرق کے رہے سہے آثار بھی یوروپ کی نذر ہو گئے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد برطانیہ اور فرانس بڑی نوآبادیاتی طاقت کے طور پر ابھرے گو روس اور جرمنی کلیتہً ختم نہیں ہو گئے۔ نوآبادکاری کا مطلب تھا مفادات حاصلہ کی شناخت، اور ترجیحات، تجارت کاری، ذرائع ابلاغ، مذہب، فوج اور تہذیب وتمدن پر سیاسی غلبہ۔ مثال کے طور پر برطانیہ اسلام اور اسلامی ممالک کے سلسلے میں

ایک عیسائی طاقت کے طور پر اپنی دخل اندازی کو جائز سمجھتا تھا۔ اس سلسلے میں چند ادارے اس کام کو انجام دینے پر مامور کیے گئے جن کی تفصیل اس طرح ہے۔

سوسائٹی فار پروموٹنگ کرسچین نالج ۱۶۹۸ء۔ سوسائٹی فار دی پروپیگیشن آف دی گوسپل ان فارن پارٹس ۱۷۰۱ء

بیپ ٹسٹ مشنری سوسائٹی ۱۷۹۲ء۔ چرچ مشنری سوسائٹی ۱۷۹۹ء۔ برٹش اینڈ فارن بائیبل سوسائٹی ۱۸۰۴ء

لندن سوسائٹی فار پروموٹنگ کرسچیانٹی امنگ دا جیوز ۱۸۰۸ء۔ یہ ادارے اس کام کو بڑھانے میں معاون ثابت ہوئے۔

یہ سارے مشن یوروپ کی توسیع کے کام میں ممد اور فعال نظر آتے ہیں۔ اس میں اگر آپ تجارتی انجمنوں، جغرافیائی مہم جوئی، ترجمے کے کام کے لیے فراہم کی گئیں مدیں، مشرقی ممالک میں اوپر سے مسلط کیے گئے سکول اور مشن، قونصلر دفاتر، کارخانے اور یوروپی اقوام کی بڑی تعداد میں موجودگی کو بھی شامل کرلیں تو پورا منظر نامہ سامنے جاتا ہے۔ اس کے بعد ان اداروں اور مفادات کا تحفظ پوری قوت اور جوش سے کیا گیا'' ۲۳؎

بس یہی وہ پس منظر ہے جس کی وجہ سے ملت اسلامیہ کے لیے از بس ضروری ہے کہ وہ داخلی شعور حاصل کرے، روشن خیالی کے اطوار بنائے، شناخت ذات یا خودی کے عمل سے آگاہ ہو اور حصول علم سے وابستگی کو دوامی جانے۔ ایڈورڈ سعید سے قبل ڈاکٹر محمد اقبال اور ڈاکٹر علی شریعتی نے دونوں ملت اسلامیہ کے اس بحران اور زوال کا جائزہ بھی لیا ہے جن کی جڑیں عرب ملوکیت کے دائمی تسلط میں تلاش کی جاسکتی ہیں اس ملوکیت نے رومی اور ایرانی سلطنتوں کو مسلم سلطنت میں شامل کر کے نئی طرز کی ملوکیت کو فروغ دیا اور بقول آغا شوکت علی ''اس ملوکیت کی زیر سایہ ایسے لوگوں کا غلبہ ہوا جن کا تعلق پہلے سے موجودہ راہبانہ اور ملوکیت پسند ثقافتوں سے تھا۔ اسے اسپنگلر نے اسلام کے اندر داخل ہونے والی مجوسیت سے تعبیر کیا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام قبل اسلام دور کے عقائد کی طرف لوٹا اور اس میں ان عقائد سے وابستہ تمام تر فلسفیانہ موشگافیاں شامل ہوگئیں۔ یوں اس کو اپنی منزل تک پہنچنے کا موقع ہی نہ ملا۔ یہ کیفیت آج بھی بدستور موجود ہے۔ اقبال کی آواز ماضی کے اس دور کے خلاف ایک بھرپور بغاوت تھی شریعتی نے اپنے عہد میں ایک شخص کی ملوکیت اور استبداد کے خاتمے کے لیے ایک نیا فکری اور عملی لائحہ عمل اختیار کیا۔ انہوں نے ایران کے مغرب زدہ نوجوان دانش وروں کی عادات تبدیل کیں اور انہیں اسلام کی نئی تعبیر کے دائرے میں داخل کیا'' [۴۴]

آج مسلم دنیا میں دانشوری کا جو شدید بحران موجود ہے اس کا اس امر سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ملت اسلامیہ پر قیامتیں ٹوٹ رہی ہیں لیکن اس کی رہنمائی کرنے والا علامہ اقبال کی سطح کا کوئی دانائے راز دکھائی نہیں دے رہا۔ پاکستان کی مثال لے لیجیے کہ جو دنیا کے نقشے پر اسلام کے نام پر ابھرنے والی ریاست ہے۔ یہاں درسی کتابوں میں منتخب اسلامی تاریخ تو پڑھائی جارہی ہے لیکن دانشوروں نے معاصر مسلم دنیا کے مسائل پر گہری چپ سادھ رکھی ہے معاملہ یہیں تک رہتا تو بات اور تھی لیکن انہیں تو بے حسی اور تعصب کی دیمک نے آلیا ہے نہ تو وہ خود معاصر مسلم دنیا کے مسائل پر قلم اٹھاتے ہیں اور نہ ہی کسی اور علاقے میں ان مسائل پر قلم اٹھانے والے کے لیے کلمہ خیر کہتے ہیں۔

(۵)

اطہر رضوی صاحب کی زیر بحث تخلیق کو پاکستان میں پذیرائی ملنی چاہیے تھی لیکن مغربی تہذیب کے سیل میں بہنے والے دانشور مشرقی اقدار کی علم برداری کو رجعت پسندی سے تعبیر کر کے سکھ کی نیند سو رہے ہیں ان کے کان پر جوں تب رینگتی ہے جب چومسکی اور ان کے درمیان پہنچ کر مغرب کی فرعونیت اور تفاخر پر ضرب کاری لگاتا ہے لیکن اگر یہ پیغام اطہر رضوی صاحب نے اپنی کتاب میں زیادہ کھل کر دیا ہے تو ان کے لیے کلمہ خیر کہنے میں انتہائی بخل سے کام لیا جارہا ہے۔

اطہر رضوی صاحب نے ان سوالوں کا جواب دینے کے لیے کہ اسلام کی دمک کس نے ماند کی؟ کیا کس نے اور بھرا کس نے؟ اور دنیا میں فقط مسلمان ہی کیوں معتوب ہیں؟ اپنے متحرک تصور تاریخ کی مدد سے امت مسلمہ کے ایام زوال کے پس منظر میں ایسے شاندار تجزیے رقم کیے ہیں کہ جن کی علمی اور تحقیقی حیثیت معتبر و مستند ہے۔ مغرب کی نسلی برتری، کذب بیانی، لیبل سازی اور رعونت بھرے تفاخر کو کہیں جارج ارویل کے ادبی حوالوں سے اور کہیں نوم چومسکی جیسے حقیقت پسند انسان دوست مفکر کے خیالات کی روشنی میں طشت از بام کیا ہے۔ پاکستان، ترکی، انڈونیشیا، سپین، ہندوستان، مراکش، تیونس سعودی عرب، ایران، الجزائر، افغانستان، فلسطین، عراق سوڈان اور لبنان میں اسلامی تہذیب وتمدن اور سیاست وثقافت کے اتار چڑھاؤ کا اس قدر باریک بین جائزہ ہماری ماقبل کی تاریخی کتب میں نظر نہیں آتا۔ اسلامی عروج وعظمت کی داستان بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اطہر رضوی صاحب نے مسلمانوں کے بارے میں یوروپی اور مغربی اقوام کے منفی رویوں کا تحقیقی اور علمی سراغ لگا کر اپنے غیر متعصب ہونے کی داخلی شہادت بھی دے دی ہے۔ اگر قارئین کو ضیاء الحق کے نظریات، قذافی کی سبز کتاب، بورقیبہ کا جدید اسلام، مسلمانوں میں وہابیت کی تحریک، حزب اللہ، طالبان کی ستم ظریفیاں اور مسلمانوں کے باہمی مناقشات وغیرہ کے موضوعات کی منطقی اور مواد بھری تفتیش درکار ہے تو وہ دردمند دل کے حامل اطہر رضوی صاحب کی تاریخی اور علمی کتابوں کو پڑھنا نہ بھولیں۔ مغرب اور اسلام دشمنی، تہذیب اور تیل، دہشت گردی کے اصل کردار اور مخفی چہرے، غلامی اور آقائیت کے عصری تصورات، ہیگ کی عالمی عدالت، کالے افریقی اور امریکی انصاف، مسلم ممالک کے خلاف نئی عصری جنگوں کے تناظر میں امریکی، صیہونی اور سعودی چشم پوشی، عراق میں امریکی طاغوتیت اور سی آئی کی مہمات جیسے موضوعات کو اطہر رضوی صاحب نے نو استعماریت کی نقاب کشائی کے لیے یوں استعمال کیا ہے کہ وہ جہت نمائی کرنے والے مسلم دانشوروں کی صف کا حصہ بن گئے ہیں۔ ”دی فیسز آف اسلام“

از سٹیفن شوارٹز، ''دی اسلامک تھریٹ، متھ اینڈ ریالٹی'' از جون اسپوزیٹو، ''مسلم ڈسکوری آف یوروپ'' از برنارڈ لیوس'' دی فیلیئر آف پولیٹیکل اسلام'' از اولیور روئے۔ ''ناین الیون'' اور کلچر آف ٹیررازم'' از نوم چومسکی، '' ویسٹرن سٹیٹ ٹیررازم''، از لیکس جارج۔ ''کلیش آف سوی لائی زیشن ری میکنگ آف ورلڈ آرڈر'' از سیموئیل پی ہن ٹن گٹن اور اسی کی متعدد بنیادی کتابوں کے تنقیدی جائزے سے اطہر رضوی صاحب نے ایک ماہر تخصیصی وکیل کی طرح مسلمانوں کی وکالت کے سلسلے میں وہی کام کیا ہے جس کی بنیاد پر سرسید احمد خاں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی آزادی کے لیے رستہ ہموار کیا تھا۔ آج مسلمانوں پر من حیث القوم جو کیچڑ اچھالا جارہا ہے اس پر اطہر رضوی صاحب نے ایسا مصدقہ مقدمہ تیار کیا ہے جسے درجواب غزلِ مغرب کی حیثیت تو حاصل ہو ہی چکی ہے لیکن اس کے ایک ایک شعر کا منصوبہ بند خیال مسلمانوں کی آئندہ رہنمائی کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگا۔

(۶)

تاریخ نویسی جہاں ایک طرف انسانی دنیا کے نشوونما پاتے ماحول کی جدلیاتی تقویم بندی کرتی ہے وہاں دوسری طرف مورخ کے تخصیصی ویژن کی عکاسی سے بھی عہدہ برآ ہوتی ہے۔ اس حوالے سے اسے تعصّبات سے پاک کہنے والوں کی منطق ناقابل قبول ہے۔ میں صرف ایک مثال پر اکتفا کرتے ہوئے اپنی بات آگے بڑھانے کی کوشش کروں گا۔ اکبری دور کے دو مورخوں ابو الفضل اور ملا بدایونی نے معاصر ماحول کی عکاسی اپنی اپنی منصوبہ بند فکر کے حوالے سے کی اور یوں تاریخ کی دو مختلف تعبیریں سامنے آئیں ایک تعبیر کے تناظر میں سیکولر شاہ پرستی کو دیکھا جا سکتا ہے اور دوسری تعبیر کے سیاق وسباق میں مذہبی تنگ نظری کو۔

تا حال تاریخ کا صرف ایک نقطہ نظر قارئین کے اعتبار کی سند پا سکا ہے۔ اس نقطہ نظر میں وقوعات و افکار کے مجادلوں کو ایک جست کے سہارے نئی معنویت عطا کر دی جاتی ہے۔ تاریخ اور زمانے کو مسلسل وحدت کی صورت دیکھنے والے تاریخ کو مدوروقوعات پر مبنی عمل قرار

نہیں دے سکتے۔ اس لیے تاریخ نے ارتقا کے تصور پر مہر تصدیق ثبت کر کے ماضی مطلق میں لوٹ جانے کے برخود غلط نظریات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا ہے۔ شتر سواروں اور بگٹٹ یلغاروں کا دور کب کا گزر چکا ہے مگر کہنے والے گردش ایام کو پیچھے کی طرف لے جانے کی خام خیالی لئے اب بھی امید پرستی کی شمعیں روشن کیے ہوئے ہیں۔ مثبت اور منفی کو ایک جدلیاتی دائرے میں بذریعہ جست مجتمع کرنے والے تاریخ کی اندھیری راتوں میں روشنی کے مینار تعمیر کر چکے ہیں۔

ان معروضات کا فوری مقصد ایک ایسے مورخ کی لکھی ہوئی کتابوں کو متعارف کروانا ہے جس نے شاہ پرستی اور مذہبی تنگ نظری کے تصورات کی آئینہ بندی کرنے کے بجائے مسلم تاریخ کے روشن خیال باب کی منزہ و مشفا ترقیم کو اہمیت دی ہے۔ "تاریخ کا سفر بلکنیا سے بازنیا تک" اور "کون عبث بدنام ہوا" حضرت اطہر رضوی کی لکھی ہوئی وہ دو کتابیں ہیں جن کو پڑھ کر عبرت بین دل اگر ایوانِ مدائن کی تباہی پر خون کے آنسو نہیں بہائے گا تو اسے آئینہ عبرت ضرور جانے گا۔ بلکنیا سے بازنیا تک پڑھنے کے بعد قاری بیک آواز کہہ اٹھتا ہے۔

......اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست...... عظیم ترک سلطنت کی بیخ کنی صرف یوروپی مذہبی اور غیر مذہبی ریشہ دوانیوں کا شاخسانہ نہیں تھا اس میں اپنے بااختیار پردہ دریدوں اور تعیش رسیدوں کے نام ملی جرائم کی سیاہ تختیوں پر جلی حروف سے لکھے نظر آتے ہیں۔ فاعتبروا یا اولا ابصار!

عظیم ترک خلافت کے خاتمے کی داستان جس پیرایہ بیان میں لکھی گئی ہے اسے اگر حقیقت پر مبنی ناول نہ بھی کہا جائے تو بھی اس کی رواں دلچسپ نثر قارئین کو اپنے ساتھ بہائے لیے جاتی ہے اور یوں لگتا ہے کہ جیسے کسی خواب میں بے رحم حقیقتوں کے درباز ہوتے چلے جارہے ہیں۔ ایسی نثر لکھنے اور ایسی معلومات بھری کتاب تصنیف کرنے والا کوئی معمولی آدمی

نہیں ہے اس نے کھلی آنکھوں اپنی ہزار شیوہ عمر کو بسر کرتے ہوئے عبرت خیز مسلم تاریخ کے انتہائی نازک ابواب کو پوری پوری تاریخی ہمدردی سے لکھا ہے اور تسلیم کیا ہے کفر و ایمان کی کشاکش میں نئی تہذیب کی ہرنیاں ہمارے پاس سے زقندیں بھرتی ہوئی گزر گئی ہیں اور ہم تاہنوز ان کے آنے کے منتظر ہیں۔ بازنیا کی آزادی کو یوروپی نسل کش جابروں کے منہ پر فتح مند انسانیت کے ہاتھوں کا سخت طمانچہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ سوال اپنی جگہ بدستور قائم ہے کہ انسان امن و سلامتی کی زندگی بسر کرتا ہوا اچانک بے رحم کیوں ہو جاتا ہے؟ کہیں اس میں اسلحے اور تیل کے تاجروں اور صنعتی آقاؤں کی دولت میں اضافہ کرنے والی روز افزوں صارفیت کی غیر منصوبہ بند پیداوار کا ہاتھ تو نہیں ہے؟

کون عبث بدنام ہوا، اطہر رضوی صاحب کی وہ عمدہ کتاب ہے جس کی تخلیق میں ان کی قیمتی زندگی کے ہزاروں شب و روز بسر ہوئے ہیں گو یہ الف لیلوی رنگ کی تاریخ نہیں ہے تاہم اس میں برہنہ حقائق داستان در داستان اپنے رنگ دکھاتے چلے گئے ہیں۔ صنعتی انقلاب کے بعد سے بننے والے مسلم دشمن اتحادوں کی کچھ جھلکیاں تو ان کی کئی دوسری کتابوں میں نظر آچکی ہیں لیکن جس دیدہ دلیری اور لومڑ چالاکی سے مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دے کر دنیا میں ان کا حقہ پانی بند کرنے کی کوشش ہوئی ہیں اس کی جزئی سطحوں کی تفصیلیں اگر کسی کتاب کا حصہ بنی ہیں تو وہ یہی کتاب ہے، اس کا لب لباب وہی ہے جسے غیر مسلم روشن خیال دانشوروں نے بھی شدت سے محسوس کیا ہے اور اس نتیجے کا اعلان کیا ہے کہ ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی۔ چاہیں ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا۔

''کون عبث بدنام ہوا'' میں اطہر رضوی صاحب نے مغربی استعماری طاقتوں کے حسن کرشمہ ساز کی نقاب کشائی کرتے ہوئے مسلم دنیا کی اخلاقی بافتگی، علم دشمنی، رجعت پسندی، معاملہ نافہمی، ہوس پرستی، ضمیر فروشی اور حکمت ناعملی کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے۔ انہوں نے معاصر دنیا میں اپنوں اور غیروں کے ہاتھ معصوم، نہتے اور بے بس مسلم عوام کی جو درگت بنتی

دیکھی ہے اسے بلا کم و کاست بیان کرتے ہوئے ان سے اپیل کی ہے کہ وہ ایسے جدید علمی سائنسی اور اخلاقی طور طریقے اپنائیں جن کی بدولت وہ کم مائیگی اور بے بسی کی دلدلوں سے باہر نکل سکیں اور دنیا کے سامنے اکڑ کر کہہ سکیں کہ ہم اب بھیڑیئے کی وہ منطق نہیں چلنے دیں گے جس کے سبب وہ معصوم میمنے کو کھا سکے! مارا بہ غمزہ کشت وقضا را بہانہ ساخت۔

''کون عبث بدنام ہوا'' کا غیر جانبدارانہ جائزہ اس حقیقت کو روز روشن کی طرح واضح کرتا ہے کہ یہ کتاب مصنف کی علمی و تحقیقی عرق ریزی کا ثمرہ ہے۔ اس میں تحقیقی اصولوں کی اس سطح کو مد نظر رکھا گیا ہے جس کے نتیجے میں کوئی کتاب دنیا کی بڑی یونیورسٹیوں اور دانش کدوں کے نصابوں میں شامل ہو جاتی ہے۔ اطہر رضوی کی غالب دوستی نے ان کی تاریخی نثر کو علمی و ادبی شگفتگی سے مالا مال کر رکھا ہے۔ اس کتاب کے وسیلے سے جناب اطہر رضوی کی پذیرائی صف اول کے سکالر اور دانشور کے طور پر اگر نہ ہو پائی تو اس میں دور کی دانشوروں کی خود غرضانہ چشم پوشی کا عمل دخل ہوگا۔ اس عظیم تاریخی تخلیق پر ہمیں انہیں دل کھول کر خراج تحسین عطا کرنا ہے۔

حواشی

۱۔ کون عبث بدنام ہوا، از اطہر رضوی، مطبوعہ الحمد پبلی کیشنز لاہور۔ ص ۵۵

۲۔ کون عبث بدنام ہوا ص ۵۵

۳۔ کلیات اقبال، غلام علی اینڈ سنز لاہور

۴۔ کون عبث بدنام ہوا ص۔ ۵۸

۵۔ دانش وروں کا کردار بے ساختہ خطبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ۱۹۹۷ء ترجمہ سہ ماہی اردو ادب دہلی ۲۰۰۳ء۔ ص ۹۰

۶۔ کون عبث بدنام ہوا۔ص ۲۵۸

۷۔ کون عبث بدنام ہوا۔ص۱۲۔۱۳

۸۔ کون عبث بدنام ہوا۔ص۳۴۳

۹۔ کون عبث بدنام ہوا۔ص ۱۳

۱۰۔ کون عبث بدنام ہوا۔ص۱۴۱

۱۱۔ کون عبث بدنام ہوا۔ص۱۴۱

۱۲۔ پس چہ باید کرد اے اقوام شرق ''پھر کیا کرنا چاہیے اے مشرقی قومو!'' ترجمہ سعادت سعید مطبوعہ سہ ماہی ویژن اقبال۔شریعتی فاؤنڈیشن ایجرٹن روڈ لاہور ۱۹۹۱ء

۱۳۔ پس چہ باید کرد اے اقوام شرق ''پھر کیا کرنا چاہیے اے مشرقی قومو!''

۱۴۔ پس چہ باید کرد اے اقوام شرق ''پھر کیا کرنا چاہیے اے مشرقی قومو!''

۱۵۔ پس چہ باید کرد اے اقوام شرق ''پھر کیا کرنا چاہیے اے مشرقی قومو!'' کتاب ترجمہ از راقم الحروف اقبال۔شریعتی فاؤنڈیشن ایجرٹن روڈ لاہور ۱۹۹۲ء

۱۶۔ تہذیب، جدیدیت اور ہم کتاب از ڈاکٹر علی شریعتی ترجمہ از راقم الحروف اقبال۔ شریعتی فاؤنڈیشن ایجرٹن روڈ لاہور۔۱۹۹۰ء

۱۷۔ پس چہ باید کرد اے اقوام شرق ''پھر کیا کرنا چاہیے اے مشرقی قومو!''

۱۸۔ تاریخ کا سفر بلکیپیا سے بوزنیا تک از اطہر رضوی ، مطبوعہ پاکستانی ادب پبلیکشنز کراچی ۲۰۰۱ء

۱۹۔ کون عبث بدنام ہوا کتابیات۔ص ۳۴۷۔۳۴۸

۲۰۔ تاریخ کا سفر بلکیپیا سے بوزنیا تک ص ۴۷۲

۲۱۔ ترجمہ از راقم الحروف تقریظ آئین اکبری از مرزا غالب، کلیات نثر فارسی مطبوعہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۶۹ء

۲۲۔ کون عبث بدنام ہوا۔ ص۷۳

۲۳۔ کون عبث بدنام ہوا۔ ص۶۰

۲۴۔ اوریئنٹلزم از ایڈورڈ سعید آخری باب (کرائی سز) پینگوئن بکس لندن ایڈیشن ۱۹۹۵ء
تلخیص وترجمہ نقی حسین جعفری۔

۲۵۔ پیش لفظ، تہذیب، جدیدیت اور ہم از آغا شوکت علی۔

اطہر رضوی کی دانشوری

''کون عبث بدنام ہوا؟'' کی روشنی میں

پروفیسر وہاب اشرفی، پٹنہ انڈیا

اطہر رضوی میری نگاہ میں ایک دانشور ہیں، جن کی نگاہیں ادب کے علاوہ مختلف قسم کے علوم پر رہی ہیں۔ خصوصاً مسلمانوں کے مسائل ان کی توجہ کی کلید ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی حیثیت اساسی ہے، یعنی اطہر رضوی اپنی تاریخی اور تہذیبی وراثت سے نہ صرف باخبر ہیں بلکہ آج کے حالات نے انھیں جس طرح متاثر کر رکھا ہے انھیں وہ ایک مفکر کی حیثیت سے دیکھتے نظر آتے ہیں۔ اس سلسلہ کی ان کی تین کتابیں مثلاً ''ہر ملک ملک ماست''، ''خدا کے منتخب بندے'' اور ''تاریخ کا سفر'' ذہن میں رہے تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا کہ ان کی معروف کتاب ''کون عبث بدنام ہوا؟'' (۲۰۰۳ء) کیسے محتویات رکھتی ہوگی۔ اطہر رضوی دہشت گردی کو عالمی تناظر میں دیکھنے کی سعی کرتے ہیں اور اس کے پس منظر، جواز اور تجزیے سے کتنے ہی اہم اور کلیدی مسائل کی وضاحت کرتے ہیں۔

اطہر رضوی کا یہ غم رہا ہے کہ مغرب کے ظلم و زیادتی کی کوئی حد نہیں ہے۔ اور اس باب میں امریکی رول خطرناک بھی ہے اور انسان کُش بھی۔ اس نے اعلیٰ انسانی اقدار کو مسمار کرنے کی ایک پالیسی بنالی ہے۔ نہ تو اسے انسانی حقوق کا پاس ہے، نہ کسی ملک کی جمہوریت کی، اس کی نظر میں کوئی اہمیت ہے۔ نہ آزادیٔ اظہار کا وہ مبلغ ہے اور نہ ہی خود مختاری اور

تہذیبی روایات کا پاسدار ہے۔ دراصل دنیا کی حکمرانی کا جذبہ اتنا شدید ہے کہ وہ کسی قسم کی متعینہ قدر کو اہمیت دینے کا روادار نہیں۔ وہ دوسرے ملک کے معاملات میں مداخلت کو اپنا حق سمجھتا ہے اور طرّہ یہ ہے کہ اسے احساس ہے کہ وہ حق پر ہے اور چھوٹے چھوٹے ملکوں کی اذیت کو کم کر رہا ہے، حالانکہ اس کا پنجۂ استبداد مضبوط تر ہوتا جارہا ہے اور ساری دنیا کے لوگ خاموش تماشائی ہیں۔ اس ضمن میں مسلمانوں کی حالت جتنی ربودہ ہے اس کا احساس کیا جاسکتا ہے۔ اطہر رضوی نے خود لکھا ہے:

''کون عبث بدنام ہوا؟'' .... میری دوسری تحقیقی تصنیفات ''ہر ملک ملک ماست''، ''خدا کے منتخب بندے'' اور ''تاریخ کا سفر'' سے فکری مماثلت رکھتے ہوئے ان سب سے قدرے جداگانہ ہے۔ اس تحریر میں محض ''پدرم سلطان بود'' اپنی ازلی مظلومیت اور خود رحمی کی داستانوں کا اعادہ نہیں ہے۔ اس معروضہ میں نہایت وضاحت اور استدلال کے ساتھ قارئین کو اپنے گریبان میں منہ ڈالنے کی پرخلوص دعوت بھی دی گئی ہے۔

ساری حقیقتیں یقیناً تلخ نہیں ہوتی ہیں، لیکن ہمارے ادبی کلچر میں صرف خوشگوار حقیقتوں کو تعلیات کی تہہ داری کے ساتھ قلمبند کرنے کا رعایتی دستور ہے۔ اس تناظر میں اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ اس کتاب میں، میں نے جن عظیم مسلم، عرب دانشوروں، جید علماء، اعلیٰ مرتبت مفکرین اور دانش وحکمت کے پیغمبروں کی مدح سرائی کی ہے، وہ قطعی جائز اور از بس ضروری تھی۔ ان کی شہرت عالمگیر اور ان کا مرتبہ مستند ہے۔ ان کی سطح اور Calibre کی شخصیات یقیناً مغرب میں گزری ہیں لیکن نفس مضمون کے احترام میں یہاں ان کے حوالے غیر ضروری تھے۔

ساتھ ہی میں نے جن تلخ اور تکلیف دہ حقیقتوں کو اجاگر کیا

ہے (وہابیت کی تحریک، طالبان کی تاریخ، اسلامی ممالک کی مطلق العنانیت، خود ساختہ حکمرانوں کی جمہوریت کا فقدان) تو یہ محض تحریر میں توازن پیدا کرنے کی کاوش نہیں ہے، یہ سب میری عشروں کی سوچ اور تفکر کی صورت گری ہے۔"

(بحوالہ: "کون عبث بدنام ہوا؟" از اطہر رضوی "عرض مصنف" ص: ۱۱۔۱۲)

یہ بیان بے حد اہم ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اطہر رضوی تمام معاملات کو ایک محقق کی نظر سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ کہیں وہ جذباتی نہیں ہوتے، نہ ہی سرسری رائے زنی کرتے ہیں۔ ان کے دلائل تحقیق و تفتیش پر مبنی ہیں۔

دانشوری کا تقاضا ہے کہ دانشور اپنے موضوع کے تمام داخلی اور خارجی احوال پر نظر رکھے اور اپنے تجزیے میں سچائیوں کی تلاش کے بعد وہ عناصر تلاش کرے جو بہت Relevant ہوں۔ "کون عبث بدنام ہوا؟" کے مصنف ایسے تمام اوصاف سے متصف ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے محتویات کی کلی خبر رکھتے ہیں۔ وہ اپنے نتائج کو جبس کا شکار ہونے نہیں دیتے۔ گفتگو کو مبہم نہیں بناتے اور تجزیے کو ابہام کی منزلوں سے نہیں گذارتے۔ ان کا موقف ہے کہ وہ موضوع سے متعلق مسائل کو اس طرح دیکھے کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔ ان کے یہاں لاگ لپٹ نہیں۔ ان کے یہاں نہ کچھ چھپانا ہے اور نہ زیادہ دکھانا ہے یعنی ان کے یہاں حدیں مقرر ہیں اور وہ ان حدوں کو جذباتی طور پر پھلانگنا نہیں چاہتے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دوسرے دانشور ڈاکٹر منظور احمد اپنے "پیش لفظ" میں نہ صرف اس کتاب کی ستائش کرتے ہیں بلکہ اس کے بعض تجزیے کو آئندہ مباحث کا ذریعہ بھی قرار دیتے ہیں۔ موصوف کا بیان ہے:

"امریکہ "اپنی قومی سلامتی" کے لیے اس "سلطنت دہشت" کے خلاف ہر ملک میں دخل اندازی کرسکتا ہے، پیش بندی کے طور پر حملہ کرسکتا

ہے، بمباری کر سکتا ہے اور اس ملک میں بزعم خود ''تشدد'' کے کارندوں کو ختم کر سکتا ہے۔ ان کارندوں کے جلو میں جو بے شمار انسانیں ضائع ہوں اور پورے کے پورے ملک کھنڈر بن جائیں وہ سب ''ضمنی نقصان'' Collateral Damage کے ضمن میں آتا ہے۔ اس پس منظر میں اطہر رضوی صاحب کی کتاب مسلمان ملکوں کی حالت کا ان کے تاریخی پس منظر کا تجزیہ کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ جو الزام تراشی ان ملکوں کے خلاف ہوتی رہی ہے وہ بڑی حد تک یک طرفہ ہے اور مسلمان ممالک نے مغرب کے خلاف ایسے اقدام نہیں کیے ہیں جن کی یہ سزا ان کو دی جا رہی ہے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ الزام لگانے والے خود ہی منصف بھی ہے اور خود ہی تعزیر نافذ بھی کرتا ہے۔ یہ تجزیہ بڑی حد تک درست ہے اور اگر اس کو مسلمانوں اور مغرب بالخصوص امریکہ کے مابین غلبہ کی خواہش اور جنگی محاذ آرائی کے پس منظر میں دیکھا جائے تو سو فیصد درست معلوم ہوتا ہے اور اس کی شہادتیں، مسلمان ممالک کی مغرب کے ساتھ تاریخی کشمکش کے پس منظر میں، اس کتاب میں مل جاتی ہیں۔

مجھے کتاب کے نفس مضمون سے مجموعی طور پر اتفاق ہے، اگرچہ بعض تفصیلات یا آرا ایسی بھی موجود ہیں جو میری نظر میں مزید غور و فکر کی طالب ہیں۔''

(محولہ بالا کتاب ''پیش لفظ'' ص: ۱۷۔۱۸)

اس اقتباس کا آخری فقرہ غور طلب ہے۔ دراصل ہر وہ تحریر جو قیمتی ہوتی ہے اور مفکرانہ ہوتی ہے وہ بہت سے مباحث کے دروازے وا کرتی ہے۔ چونکہ اطہر رضوی مسائل کو کھلا رکھنا پسند کرتے ہیں اس لیے ان کی بعض رائیں مزید بحث کی متقاضی ہوسکتی ہیں۔ لیکن نئے

مباحث کا تقاضا اور ہے اور متعلقہ رائے کا وزن اور وقار اپنی جگہ پر۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اطہر رضوی کو دانشور کہا ہے۔ اس لیے کہ ان کی سوچ اور فکر اضطراری نہیں ہے اور نہ کسی ہیجان کی شکار ہے۔

اطہر رضوی کا اسلوب شگفتہ اور رواں ہے۔ جو شخص اپنے مضامین پر حاوی ہوتا ہے وہ گنجلک نہیں ہوتا۔ ابہام اور پیچیدگی وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں فنکار کا ذہن صاف نہیں ہوتا۔ شاعری میں یہ اوصاف وقیع ہو سکتے ہیں لیکن نثر اور خصوصاً فنکارانہ نثر میں ابہام کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رضوی کو خیالات اور الفاظ پر یکساں دسترس ہے۔ لہٰذا نہ الفاظ ہی خیالات سے آگے نکلتے ہیں اور نہ ہی خیالات الفاظ کے گورکھ دھندے میں گم ہوتے ہیں۔ اسلوب کی ایسی شیرینی ان کی نگارشات کو پرکشش بناتی ہے نیز ان کا استدلال زیادہ نکھر کر سامنے آتا ہے اور ذہن و دماغ کو اسیر کرتا ہے۔

افسوس ہے کہ اطہر رضوی پر ابھی بھی بہت کم لکھا گیا ہے۔ حالانکہ ان کی علمی، ادبی، ثقافتی اور تہذیبی کارکردگی ایسی ہے کہ ذہین دماغوں کو ان کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ زبان دانوں کو غالب نے ایک موقع پر للکارنے کی کوشش کی تھی، میں یہی عمل اطہر رضوی کے لیے دہرانا چاہتا ہوں: ؎

بیا و رید گر ایں جا بہ بود زباں دانے
غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

کون عبث بدنام ہوا

(تخلیقی ادبی دستاویز)

ڈاکٹر سید تقی عابدی، کناڈا

"کون عبث بدنام ہوا" تاریخی دستاویز ہونے کے ساتھ ساتھ معلومات اور حقائق کا ایک ایسا کوزہ ہے جس میں نہ صرف دریا کو بند کیا گیا ہے بلکہ اس میں تلاطم بھی پیدا کیا گیا ہے۔اس کتاب کی مثال اس تراشیدہ ہیرے کی طرح ہے جس کے ہر زاویہ تراش سے ایک خاص روشنی ایک خاص چمک دمک نظر آتی ہے جس پر مجھے یقین ہے علمائے فکر ونظر اظہار نظر کرتے رہیں گے۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مجھے اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں کہ مجھے تاریخی مسائل جغرافیائی مناظر اور تہذیبوں کے مطالب سے عمیق آشنائی اس لیے نہیں کہ ان کے مسائل پر مجھے غور وفکر کرنے کا موقع اور وقت نہیں ملا۔ چنانچہ کتاب کے اس رخ کو میں دوسرے مقررین اور مبصرین پر چھوڑتا ہوں جو یقیناً اس موضوع پر عالمانہ گفتگو کریں گے۔میری گفتگو کا سرنامۂ سخن مصنف کتاب اطہر رضوی کا اسلوب سخن ہے۔ اطہر رضوی کی شعری تخلیقات کے علاوہ ان کی دس گیارہ کتابوں میں سے میں نے اس کتاب کے علاوہ تین اور کتابیں یعنی "خدا کے منتخب بندے" ہر ملک ملک ماست اور تاریخ کا سفر "بلکینیا سے بازنیا تک" کا مطالعہ بڑی دلچسپی سے کیا ہے جس کی وجہ سے مصنف کا اسلوب بڑی حد تک مجھ پر آشکار ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کسی بھی چیز کی قیمت کا تعین کرنے سے پہلے یہ امر لازم

ہے کہ اس کی شناخت کی جائے۔ کسی چیز کی قیمت کا تعین اس وقت صحیح ہوگا جب اس کے صحیح مقام کا پتہ لگایا جائے۔ یہاں ہمیں پہلے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ یہ کتاب کس زمرۂ ادب میں شامل ہے۔ اس کتاب کو ادب کی لائبریری کے کس شلف میں رکھا جاسکتا ہے۔

ادب یا ادبیات جس کو لٹریچر بھی کہتے ہیں دنیا کا وہ مستند علم ہے جس کا مقصد انسان کے شریفانہ خصائل کو ظاہر کرنا اور اس کی نشوونما کرنا ہے۔ یہ لفظ اردو میں انہی معانی میں مستعمل ہے جو عربی اور فارسی زبان میں ہے چنانچہ اس علم پر بارہ سو سال پرانی کتابیں بھی عربی میں نظر آتی ہیں۔ جن میں ابن قتیبہ کی ''ادب الکاتب'' اور ''ادب انوار'' خاص شہرت رکھتی ہیں۔ لیکن مغربی دنیا اور خاص کر یورپ کے ادبی عالموں کے درمیان ادب کی تعریف میں ضد ونقیض علائم اور رموز نظر آتے ہیں اور سب سے زیادہ قابل قبول ادب کی تعریف میتھو آرنلڈ کی مانی جاتی ہے جس میں اس نے ''ادب کو زندگی کی تنقید بتایا ہے'' اور اسی تعریف کی ہم تعریف کر کے آگے بڑھتے ہیں جو ہماری زیر بیان کتاب کی بنیاد و اساس ہے۔

دنیا کی ہر زبان و ادب کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ادب لطیف اور ادب سنجیدہ جنھیں انگریزی میں Light Literature اور Serious Literature کہتے ہیں۔ ادب لطیف کو علمائے ادب تخلیقی ادب اور ادب سنجیدہ کو تجرباتی ادب بھی کہتے ہیں۔ ادب لطیف عموماً لاشعوری طور پر اور ادب سنجیدہ زیادہ تر شعوری سطح پر ظاہر ہوتا ہے۔ ادب لطیف مزید دو حصوں میں یعنی شعری اصناف اور نثری اصناف میں تقسیم ہوسکتا ہے۔ شعری اصناف میں بائیس (22) سے زیادہ قسمیں ہیں جس کا تفصیلی جائزہ میں نے اپنی کتاب ''رموز شاعری'' میں کیا ہے۔ نثری اصناف میں (15) پندرہ سے زیادہ قسمیں ہیں جن میں افسانہ، ناول، ڈراما، داستان، انشائیہ، تمثیل نگاری، تنقید، تذکرہ نویسی، سوانح، آپ بیتی، خاکہ نگاری، خطوط نگاری، رپورتاژ وغیرہ شامل ہیں۔ ادب سنجیدہ کی دو قسمیں ہیں ایک ''علوم'' دوسرے سائنس۔

علوم میں معاشیات، عمرانیات، اخلاقیات، تاریخ، فلسفہ اور منطق وغیرہ شامل ہیں۔

سائنس میں طبیعات ، کیمیا، نباتیات اور حیاتیات وغیرہ شامل ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس کتاب کو ادب کے کس خانہ میں رکھیں۔ اس سے پہلے کہ ہم اس کو کسی خانہ میں متعین کریں یہ بھی جان لینا ضروری ہے کہ ادب میں کوئی ایسا خانہ نہیں جس کی حدیں دوسرے خانہ سے ملی ہوئی نہ ہوں یعنی یہ قسمیں دائروں کی شکل میں ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے جدا بھی ہیں۔

"کون عبث بدنام ہوا" سائنس کی کتاب نہیں۔ لیکن کیا یہ سنجیدہ ادب کی قسم علوم کی صنف تاریخ سے تعلق رکھتی ہے۔ کیا یہ تاریخ کی کتاب ہے جب ہم نے اس کتاب کا تجزیہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس میں تاریخی واقعات اور تاریخی دستاویز تو موجود ہیں لیکن مصنف نے استدلال اور جواز سے اس کو تخلیقی رُخ دیا ہے اس میں واقعہ نگاری اور تاریخ نویسی تخلیقی تحریر کو وشت کی وسعت اور شوق پیمائی عطا کرتی ہے۔ چنانچہ یہ کتاب علوم تاریخ کے خانہ میں رکھی نہیں جا سکتی یعنی یہ کتاب ادب سنجیدہ سے سنجیدگی کو حاصل کرتی ہے لیکن اس کی شناخت ادب کے دوسرے حصے تخلیقی ادب سے ہے اور مسلماً یہ شعری روداد نہیں تو نثر ہی میں اس کا مقام ہوگا۔ یہ کتاب کامل طور پر نہ تنقید ہے نہ تمثیل ہے نہ سوانح ہے، نہ رپورتاژ ہے، نہ خاکہ ہے اور بالکلیہ طور پر نہ قصہ کہانی داستاں افسانہ ڈراما ناول اور خطوط نویسی کا نمونہ ہے بلکہ بیان کی گئی اصناف سے ملی جلی ایک منفرد تخلیق ہے۔ جس کا نام اس حقیر کے پاس نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں دنیا میں دس فی صد سے بھی کم پھولوں کے نام ہیں۔ جنگل اور صحراؤں کی وسعتوں میں اُگنے والے ہزاروں پھول ایسے ہیں جن کے نام نہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ پھول اور خوش نما پھول ہیں۔ اسی طرح یہ گلشن تحریر تاریخ نہیں منطق نہیں، واقعہ نگاری نہیں بلکہ ایک جدید تخلیقی تحریر ہے جو اپنی شکل میں منفرد اپنے لہجہ میں ممتاز اور اپنے عمل میں مؤثر ہے۔

مضمون کتاب کی نوعیت کے اظہار کے بعد یہ بھی جان لینا ضروری ہے کہ اس نثری کتاب کی نثر کس طاق کی زینت ہے کیا یہ سادی نثر ہے جس کو عاری نثر بھی کہتے ہیں جس

میں تحریر کی زبان روزمرہ میں ہوتی ہے جس میں وزن قافیہ نہیں ہوتا اور عربی و فارسی کے الفاظ بہت کم ہوتے ہیں۔

کیا یہ ''مرجز'' نثر ہے جس میں وزن ہوتا ہے لیکن قافیہ نہیں ہوتا۔ کیا یہ ''مسجع'' نثر ہے جس میں وزن کے ساتھ ساتھ قافیہ بھی ہوتا ہے۔

ان مطالب کی روشنی میں یہ پتہ چلتا ہے کہ مصنف کی نثر ''عاری'' نثر کے قریب ہے جس میں کہیں کہیں ''مرجز'' اور ''مسجع'' جھلکیاں بھی موجود ہیں۔ اسلوب شناسی میں طرز تحریر کو بڑا دخل ہے۔ مشہور ہے کہ طرز تحریر اسلوب کا وہ اہم آہنگ ہے جس سے صاحب تصنیف کے بارے میں اطلاعات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ یعنی ''نثر'' کی پرکھ اور جانچ پڑتال کا یہ ایک موثر آلۂ تحقیق ہے۔ اس پرآشوب دور میں جہاں کئی نقلی تصانیف جنہیں ہم ''قینچی اور گوند'' کی تصانیف کہتے ہیں فراوان ایک بک اسٹال اور کتب خانوں میں نظر آئی ہیں، جہاں مصنف یا مؤلف صرف دوسری کتابوں کے مضامین اور مطالب من وعن یا خفیف سی تبدیلی کے ذریعہ ''اپنا کر'' اپنے نام سے منسوب کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک کتاب میں متعدد طرز تحریر نظر آئے ہیں اور بڑی آسانی کے ساتھ یہ مسئلہ صاف طور پر واضح ہوجاتا ہے کہ کتاب گل نہیں بلکہ گلدستہ ہے جس میں کئی پھولوں کا عطر اور رنگ شامل ہے اور صاحب نظر افراد ان پھولوں کے نام اور دام سے واقف بھی ہیں۔

میں بڑے اعتماد سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ مصنف عالی خیال جناب اطہر رضوی کی جن چار خوبصورت کتابوں کا میں نے مطالعہ کیا ہے ان کا طرز نوشتن ''بانگ دُہل'' کی طرح اس امر کا اعلان کررہا ہے کہ یہ طرز ان کا منفرد طرز اور وہی طرز ہے جہاں واقعہ نویسی کے فوراً بعد بغیر کسی تعمل اور تحمل کے جواز پیش کرکے فیصلہ کیا جاتا ہے جب کہ دوسرے مصنف اس بے باکانہ جرأت کے اظہار سے دور رہتے ہیں اسی لیے تو صاحب کتاب فوراً اپنے دوست اور دشمن تراش لیتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ''حق گفتاری'' اور ''سچائی کے بول'' انہی آوازوں کے نام ہیں۔

(۳۵۰) صفحات کی اس کتاب کے تین حصے پس منظر، جواز اور تجزیہ پر کئے گئے ہیں۔
کتاب کا سرورق اس صدی کے ایک ایسے تاریخی لمحہ کی نشان دہی کرتا ہے جو خود ایک کتاب کی طرح ذہن میں کھلتا ہے اس ایک تصویر کے ہزاروں رخ ہیں اور اس کتاب میں بھی اس کے کئی رخ پیش کئے گئے ہیں اگر چہ کتاب میں سطور سے زیادہ بین السطور مطالب روشن ہیں۔ بین السطور سحر خیز سپیدی لفظوں کی شفق سے ٹکرا کر نوید صبح کی خوش خبری پیش کرتی ہے۔
شعلہ خیز، شعلہ نما سرورق کے پائتیں دہشت گری کا عنوان مضمون کا تب کا ماحصل ہے جب کہ ''کتاب کا عنوان'' صاحبانِ فکر اور اہل نظر کے لیے لمحہ تجسس اور تعقل بھی ہے۔ کتاب کا انتساب اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ کتاب تخلیقی دستاویز ہے۔ ایک کمسن لڑکا جو جارحانہ بمباری کا شکار ہو کر اپنے تمام چاہنے والوں سے محروم ہی نہیں ہوا بلکہ اپنے اعضا و جوارح سے بھی محروم ہے اس کے ساتھ ساتھ اپنے بنیادی حقوق سے بھی محروم ہے چنانچہ مصنف نے اس کتاب کے ذریعہ حقدار کو حق دلانے کی کوشش کی اور اس کے لیے صرف دو لفظ لکھے ''معصوم و مظلوم'' دونوں الفاظ حروف کے لحاظ سے ہم عدد، وزن کے لحاظ سے ہم وزن لیکن معنی کے لحاظ دو جداگانہ سمندر ہیں جنھیں پانی پر لکیریں کھینچ کر جدا نہیں کیا جا سکتا۔ علی عباس کے چہرے کے نقوش اس کی بے زبانی کی زبان بنے ہیں یہ ہے تخلیقی مزاج۔ مجسمہ ساز اپنے تخلیقی نظر سے چٹان میں مجسمہ دیکھ لیتا ہے اور پھر پیشہ سے اسے پتھر سے خارج کرتا ہے۔ ہم نے بھی علی عباس کی تصویر ٹیلی ویژن اور اخبارات میں دیکھی لیکن کتاب میں داستان کچھ اور ہی نظر آئی۔
اسی طرح کتاب میں تین چار تصاویر کے اوراق ہیں۔
ایک تصویر میں مختلف ممالک کے سربراہوں اور دہشت گردوں کی تصاویر جو ایک دوسرے کو نشانہ ملامت اور مجرم قرار دیتے ہیں۔ البم کی شکل میں پیش کر کے نیچے لکھا گیا ہے۔

''جور و ستم وہی ہیں، انداز جداگانہ''

یہ ایک مصرعہ یا فقرہ پڑھ کر ایلیٹ کا وہ بے مثال جملہ یاد آتا ہے کہ ''میرا دل چاہتا ہے انہی تخلیقات میں ایک جملہ میں وہ پوری بات کہہ جاؤں جو لوگ پوری کتاب میں بھی کہہ نہیں پاتے'' اطہر رضوی کا یہ ایک جملہ کسی پوری دوسری کتاب پر بھاری ہوسکتا ہے۔

اسی طرح ایک دست و پابستہ زنجیری قیدی کی تصویر کے اوپر دو نصف جملے پوری داستان کا عنوان ہیں۔ ''امریکی نظامِ عدل۔ امریکی جمہوریت''

یہ تاریخ کی کتاب نہیں بلکہ تاریخی کتاب ہے جس میں تخلیقی اُپچ ہر صفحہ سے ظاہر ہے مصنف شاعر ہے، مورخ ہے، مؤلف ہے، اس کا خیال معتبر اور انداز بیان مؤثر ہے۔ کتاب میں جا بہ جا مصرعوں، شعروں اور قطعات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ''پس منظر'' جو دراصل منظر در منظر ہے اس کے لوح پر چھوٹی بحر میں لمبی داستان کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

چنانچہ یہ ہولناک واقعہ تین چار صدیوں کا پکتا لاوا تھا جو آتش فشاں سے پھوٹا۔ ''جواز'' یعنی "License to Kill" جو دونوں طرف کا نعرہ اور منشور ہے۔ اس کو چار مصرعوں میں اس سے بہتر کیا بیان کیا جاسکتا ہے۔

تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام
تم نے لوٹی کشتِ دہقاں، تم نے لوٹے تخت وتاج
پردۂ تہذیب میں غارت گری آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج

یہی نہیں بلکہ استدلال میں قرآنی آیات کے تراجم، بزرگان دین و دنیا کے اقوال زریں مشہور کہاوتیں اور علم وادب کے تحقیقی مسائل پر بھی مستند حوالے جات نظر آئیں۔ ''اسلام میں جبر نہیں کہہ کر قرآن کی آیت ترجمہ'' دین میں زبردستی نہیں نیکی اور بدی واضح طور پر الگ

الگ ہو چکی ہے۔ عربی کہاوت، چار چیزیں کبھی واپس نہیں آتیں۔

''کہی ہوئی بات'' ''نکلا ہوا تیر'' ''کھویا ہوا موقع'' ''گزرا ہوا لمحہ''۔

اس کتاب میں انگریزی بیانات، مشاہدات جوں کے توں نقل کیے گئے ہیں تا کہ ہر شخص اپنی فکر و ہمت استدلال سے اس کے نتائج تک پہنچ سکے اس گفتگو کے آخر میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ کتاب ایک اچھی عمدہ کارآمد کتاب ہے چونکہ اس میں اچھی کتاب کے تینوں اقدار موجود ہیں جو ذہن اخلاق اور جذبات کو مہمیز کرنے کے لیے موجود ہیں۔ اس سے ہمارے ذہن و عقل پر گہرا اثر پڑتا ہے اور عدل و عدالت کو سمجھنے اور جانچنے کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے اس سے ہمارے اخلاق کی نشوونما ہوتی ہے اور اخلاقی اقدار کی تربیت جو ادب کا سب سے اہم مقصد ہے پورا ہوتا ہے اس سے ہمارے جذبات میں تازگی اور احساس پیدا ہوتا ہے جو انسانیت کی شناخت ہے ایک پھول صرف جذبات کی ایک حس جمالیات Esthetic Sense کو اجاگر کرسکتا ہے لیکن اخلاق اور عقل و منطق پر کوئی خاص اثر انداز نہیں ہوتا۔ پند و نصیحت اور موازنہ اشعار اخلاق کی تربیت کر سکتے ہیں لیکن جمالیاتی حس سے دور رہتے ہیں۔ سائنس کے مسائل عموماً عقل کو تیز کرتے ہیں لیکن دیگر لوازمات سے مبرہ ہوتے ہیں لیکن یہ کتاب ''کون عبث بدنام ہوا'' تمام اقدار کو تقویت بخشتی ہے۔ اور یہاں میں اس مصرع پر اس کتاب کے تعارف اور اس کے مصنف کی دقیق نگاہوں کو تمام کرتا ہوں۔

ع۔ آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

شاعر، ادیب اور اسکالر اطہر رضوی

ڈاکٹر تنویر احمد علوی، دہلی، انڈیا

اطہر رضوی مغرب کے اردو ادیبوں، شاعروں اور مصنفوں میں ایک امتیازی حیثیت سے متعارف انسان اور ادبی شخصیت ہیں۔ ان کے یہاں شاعر، ادیب اور اسکالر کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کرنے کا کوئی ایسا جذبہ یا رویہ نہیں ملتا جسے ہم ان کی زندگی اور ان کے ذہن کی سطح پر ابھرتے اور تیرتے ہوئے خیالات کی صورت میں ایک نظر میں دیکھ سکیں۔

وہ اپنے پیشے کے اعتبار سے بھی ادب سے رشتہ نہیں رکھتے مگر وہ گہرے طور پر مطالعہ کے آدمی ہیں اور ان کے وسیع مطالعے میں ان کا تجربہ اور مشاہدہ بھی شریک ہے۔ اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب راقم الحروف کو ان کے ساتھ قیام کرنے، ان کی باتیں سننے اور ان کے تذکروں اور تبصروں میں شریک ہونے کا موقع ملا۔

وہ زیادہ نہیں بولتے خاموش رہتے ہیں اور ان کی خاموشی میں سوچنے اور سوچتے رہنے کی فکری روش ہمیشہ اپنا کام کرتی نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنے شہر ٹورانٹو میں رہتے ہوئے علم وادب اور شعر وشعور کی خاموش خدمت کے لیے جو طریقہ کار اختیار کیا اس میں ان کے خلوص خدمت کو بھی دخل ہے اور انسانی شرافت کو بھی۔ وہ ٹورانٹو میں قائم غالب اکاڈمی کے سربراہ بھی ہیں اور اس کے بانی بھی اور اس کے لیے مسلم کام بھی کرتے رہتے ہیں مگر اپنے نام کے لیے نہیں ایک مفید ادبی کام کے لیے۔ ٹورانٹو کے دوسرے ادیبوں شاعروں اور دانشوروں سے ان کے مخلصانہ اور محبانہ تعلقات ہیں۔ ان روابط کا سلسلہ بہت سے ملکوں کے اہل ادب

اور ارباب فکر وفن سے بھی جڑا رہتا ہے وہ اپنے ذوق وشوق اور کاروباری تقاضوں کے تحت دوسرے ملکوں اور تاریخی شہروں کا سفر بھی کرتے رہتے ہیں۔ جس پر گاہ گاہ وہ اپنی گفتگو میں روشنی بھی ڈالتے ہیں۔ اطہر رضوی صاحب کے پاس ایک اچھا کتب خانہ ہے۔ جس میں انگریزی، جرمن اور اردو زبان کی بہت سی اہم کتابوں کو ایک نظر میں دیکھا جاسکتا ہے۔ مضامین کے علاوہ وہ اپنے پسندیدہ تاریخی اور تہذیبی موضوعات پر مستقل کتابیں بھی لکھتے رہتے ہیں اور نگارش وگزارش کے مرحلے میں وہ مسلسل ان کتابوں کو نظر میں رکھتے ہیں جو ان کے لیے مستند مآخذ کے طور پر کام آتی ہیں۔ بغیر سند وحوالہ کے وہ کوئی بات کہنا علمی اور تاریخی نقطہ نظر سے غلط سمجھتے ہیں۔ اس کا اظہار خود بھی انہوں نے اپنی نئی کتاب ''بلکیدیا سے بازنیا تک'' کے پیش لفظ میں کیا ہے۔ جن اہم موضوعات پر وہ قلم اٹھاتے ہیں اور حقائق کی چھان بین سے گزرتے ہوئے کوئی منصفانہ فیصلہ دینا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے وہ قابل وسوخ اور لائق اعتماد مصادر سے استفادہ کرتے اور احتیاط سے ضروری اقتباسات اور حوالوں کو ان سے نقل کرتے ہیں۔

انہوں نے اس سے پیشتر لکھی جانے والی کتاب ''خدا کے منتخب بندے'' کے سلسلہ میں بھی یہی علمی رویہ اختیار کیا تھا۔ اس کتاب میں صیہونی تحریک اور اسرائیلی جارحیت کے منصوبوں اور ماضی میں سامنے آنے والے تاریخی مظاہرے کو پیش کیا تھا۔ ان کی سوچ اور Approach سنجیدہ مطالعہ کے نتائج کو اس طرح پیش کرتی ہے کہ ان کی رائے سے اختلاف آسان نہیں رہ جاتا۔ ''خدا کے منتخب بندے'' جس تاریخی مطالعہ کا نام ہے وہ ایک کتاب دستاویز ہے اور اس سے رجوع کیے بغیر ہم اپنے دور کے اس اہم مسئلہ کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتے جس کے پس منظر سے اسرائیلی تحریک ابھرتی ہے۔ یہ بڑی بات ہے کہ وہ صرف پروپیگنڈے، یا گروہ بندیوں کے اثرات سے خود کو آزاد رکھتے ہوئے اپنا ذہنی سفر جاری رکھتے ہیں۔ ان کی تحریریں خاص معاملات میں بنیادی وصف حقائق کی جستجو اور ان کو سامنے

رکھ کر تاریخی اور معاشرتی سچائیوں پر ہیں۔

زیر نظر کتاب "بلکنیا سے بازنیا تک" میں بھی پیمانہ ان کے پیش نظر رہا ہے۔ ہم بیسویں صدی کے دوران بلکہ ربع اول میں خلافت عثمانیہ کے حوالے اور مغربی یوروپ کے جارحانہ اور مفاد پرستانہ اداروں کے پس منظر سے جن تاریخی سچائیوں کو ابھرتے ہوئے دیکھتے ہیں ان پر اردو میں لکھا جاتا رہا ہے۔ مگر عظیم ترکی سلطنت، جس کو خلافت عثمانیہ کہا جاتا تھا، مشرقی یوروپ میں پھیلے ہوئے زیر نگیں علاقوں کے بارے میں بالعموم ہمارے قارئین اور اہل علم اتنا نہیں جانتے تھے جتنا ان کے بارے میں جاننا ضروری تھا۔ جنگ بلقان یا ریاستہائے بلقان کی بات اس زمانے کے اخبارات کی فائلوں میں اب بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ مگر ترکی سلطنت کا ان سے کیا رشتہ رہا اور ماضی و موجود کے حالات میں کیا تغیرات رونما ہوئے ان پر تفصیلی گفتگو اس کتاب میں سامنے آئی ہے۔

بلکنیا کتاب میں ریاستہائے بلقان کو کہا گیا ہے جن میں ہنگری، رومانیہ، بلگیریا، یونان، مئے ڈونیا، یوگوسلاویہ، بازنیا اور ترکی شامل ہیں۔ بازنیا بازنطینی سلطنت کے حوالے سے سامنے آنے والا ایک نام ہے۔ اس نام کا مآخذ بوسنیا ہے۔ اب سے چند سال پہلے مارشل ٹی ٹو کے بعد جب یوگوسلاویہ اپنی سیاسی وحدت کو قائم نہ رکھ سکا تو بوسنیا میں بھی نئی تحریکات اور آزادی استقلال کا جذبہ پیدا ہوا۔ یہ کوئی غیر فطری بات بھی نہ تھی لیکن سربیا اس کی حکومت ملٹری اور سرب باشندوں نے جو بوسنیا کے لوگوں پر مظالم کئے ہوائی حملوں تک کی نوبت آئی وہ مشرقی یورپ کی تاریخ کے نہایت اہم اور دل ہلانے والے واقعات میں سے ہے۔ زمانہ بہ زمانہ مختلف قوموں کی طرف سے بالادستی اور اس سے آگے بڑھ کر چیرہ دستیوں کا مظاہرہ تاریخ کے ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔ موجودہ دور میں جس سے ہم بیسویں صدی کے اواخر میں بطور خاص روشناس ہوئے مسلمان اقوام کے خلاف جارحانہ رویوں کی گوناگوں مثالیں سامنے آتی رہتی ہیں اس سے نفسیاتی پیچیدگیاں بھی بڑھ رہی ہیں۔ مسلمانوں کا اپنے

مذہب اور تاریخ سے جو نسلی اور نفسیاتی رشتہ ہے اس کو مغربی اقوام آج Appreciate نہیں کر سکتے اور میڈیا کے ذریعہ جو مصنوعی سچائیاں سامنے آتی ہیں بلکہ لائی جاتی ہیں ان سے صحیح تصویر نہیں ابھرتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان مسائل سے ہماری ذہنی وابستگی اور ان کی صحیح تفہیم اور تجزیہ ہمارے تجسس سے محروم رہ جاتا ہے۔ ہم مسلمانوں کی طرف سے جذبہ جہاد کی بات تو بار بار کرتے ہیں لیکن ان ستم ظریفیوں اور جارحانہ کاروائیوں کی طرف ہمارا ذہن منتقل نہیں ہوتا جن کی وجہ سے یہ پیچیدہ صورت حال سامنے آتی ہے۔

بوسنیا کے مسلمانوں میں بیداری اور مشرقی یورپ کی سیاست سے جس میں یوگوسلاویہ اور سربیہ کا جارحانہ رویہ بھی شامل تھا بیزاری کو اسی لیے پورے طور پر سمجھا نہیں جا سکا۔ یہ کتاب ان بہت سے مسائل کی تاریخی، تہذیبی، نسلی اور نفسیاتی گتھیوں کو سلجھاتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ اور یہ ایک طرح سے روشنی کا سفر بن جاتا ہے کہ حقائق کی جستجو اور ان کا تجزیہ مصنف کے قلم اور قدم کی رہنمائی کرتا رہا ہے اور ان کی نگاہ کی روشنی میں ہم بھی اس راہ کے پیچ وخم کو دیکھ سکتے ہیں۔ عثمانی ترکوں کے نسلی سلسلوں پر فاضل مصنف نے جو نظر ڈالی ہے وہ بھی ایک اہم بات ہے مگر اس سے بڑی بات یہ ہے کہ ان سلاطین کی جو مذہبی خلافت کی نمائندگی بھی کرتے تھے حکمت عملی کے بارے میں ان تمام غلط فہمیوں کو جو غلط بیانیوں کی صورت میں تاریخ کے صفحات کی زینت بنتی جا رہی ہیں انہوں نے مستحکم اور منصفانہ تاریخ کی روشنی میں سمجھنے اور سنجیدہ سطح پر اخذ نتائج کے سمجھانے کی ایک قابل تعریف کوشش کی ہے۔ اس میں ایک ''جزیہ'' کا مسئلہ بھی ہے جو ہندوستان مسلم عہد اور اس کے نظام محصولات کے ضمن میں بھی وجہ اختلاف بنا رہا ہے۔

عثمانی ترکوں کی حکومت کو تاریخ اور تہذیب کے اس دور کی روشنی میں دیکھنا زیادہ بہتر ہے جو اس تاریخی سلطنت یا عہد خلافت کے زمانے کی اپنی رسائیاں اور نارسائیاں ہیں مشرقی یورپ میں ریاستہائے بلقان پر قبضہ کے لیے جو اقدامات کیے گئے ان میں جبر واستحصال کو کتنا

دخل تھا اور اس عہد کی تاریخ کے انتظامی امور کو اس حکمت عملی سے کیا تعلق تھا جس کے تحت یہ انتظامی رویے اختیار کیے گئے تھے۔ مصنف نے آئین اکبری کی طرح مختلف انتظامی شعبوں کا مختصر جائزہ لیا ہے۔

ہم یہ فراموش نہیں کر سکتے کہ ۱۴۹۲ء میں جب اسپین مسلمانوں کے تصرف سے نکل گیا اور ان پر مظالم شروع ہوئے تو اس کا کوئی ردعمل مشرقی یورپ کے ان علاقوں پر نہیں ہوا جو ترکوں کے زیر نگیں تھے۔ چنگیز خاں، ہلاکو خاں اور تیمور کے حملے اپنے طور پر کتنے ہی قہرامانی مظالم اپنے ساتھ رکھتے ہوں مگر ترک حکومت ان پر آشوب ادوار میں بھی اپنے انتظام واستحکام سے محروم نہیں تھی اور اس کے نزدیک اور دور کے بہت سے افریقی اور ایشیائی علاقے اس کے تصرف میں تھے۔ بات اس کے دور عروج کی نہیں ہے بلکہ عہد زوال میں جب مشرق کا مرد بیمار کہلاتا تھا ترک انتظامیہ کی خرابیاں اور کمزوریاں، اس دور تاریخ کی سنجیدہ مصنفین کی زبان قلم پر آتی رہی ہیں۔ اطہر رضوی نے کھلے دل سے ان کا اعتراف کیا ہے۔ تاریخ کے مطالعہ اور خود مصنف کی طریقہ رسائی میں یہ بات ہر طرح قابل ذکر اور لائق تحسین ہے۔

عام طور پر ترکوں کے عہد زوال کو انیسویں صدی سے وابستہ کیا جاتا ہے لیکن اطہر رضوی نے اس کے سلسلے کو سولہویں صدی کے نصف آخر سے جوڑا ہے اور اس ضمن میں سلیمان اعظم کے بعد ترک سلاطین کی جو خلفاء امت بھی تھے ان کمزوریوں کا اعتراف کیا ہے اور ان کی برائیوں کی طرف واضح اشارے کیے ہیں جو اس زوال کا باعث تھے۔ شخصی سلطنتوں کا عروج و زوال کچھ ایسا ہی حکم رکھتا ہے کہ ”عروج مہر بھی دیکھا تو دو پہر دیکھا“، مگر مغل سلطنت اور اپنے دور زوال کے ساتھ عثمانی سلطنت کا بیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں تک باقی رہنا تاریخ کے نہایت اہم اور نتیجہ خیز واقعات میں سے ہے اور اطہر رضوی نے بحیثیت ایک مورخ ان کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ ایک بات جس کی طرف ذہن منتقل ہونا چاہیے وہ یہ کہ افواج اور ان کے لیے وسائل سفر کے اعتبار سے مغربی یورپ نے پندرہویں اور سولہویں صدی میں جو ترقی کی

ترک اس کا مقابلہ نہیں کر سکے اور اگر دیکھا جائے تو مغلوں کی ہندوستان میں بھی وہی تاریخ ہے۔ مغل حکومت ۱۸۵۷ء میں ختم ہوئی اور ترکی خلافت ۱۹۲۰ء میں۔ مگر دور زوال کے اسباب قریب قریب وہی تھے کہ مغربی اقوام کی سائنسی، تجارتی اور تکنیکی پیش رفت کا مقابلہ ترک اور مغل نہیں کر سکے۔

مشرقی اقوام کے ایک بہت بڑے ڈرا بیک یا سبب پسماندگی کے پندرہویں اور سولہویں صدی سے لے کر انیسویں صدی تک جو سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقیوں کے اثرات ہیں کا ذکر کرتے ہوئے رضوی صاحب نے بڑی جرأت سے کام لے کر یہ کہا ہے۔ کہ عثمانوی حکمرانوں کی سوچ قدامت پرست تھی۔ قانون، فن نجوم حکومت کے امور کی بنیادی تعلیم کے علاوہ انہیں کسی موضوع سے دلچسپی نہیں تھی۔ ہر وہ شئے جو غیر اسلامی تھی انہیں اس سے مخالفت تھی اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ سلطان نہ صرف عثمانوی سلطنت کا حکمران تھا بلکہ وہ اسلامی دنیا کا خلیفۂ وقت بھی تھا۔ انہیں بیرونی دنیا کی معلومات سے زیادہ شریعہ اور شیخ الاسلام کے نافذ کیے ہوئے قوانین سے دلچسپی تھی وہ ہر غیر مسلم عیسائی یا یہودی کو نسبتاً ارزل اور حقیر تصور کرتے تھے۔

مذہب ایک روشنی اور رہنمائی ہے مگر اس ضمن میں اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کیا جانا چاہیے کہ ہر دور اور ہر سرزمین کے مسلمانوں کے مسائل مختلف ہوتے ہیں یہ وہ بڑی سچائی ہے جس کی طرف شاہ ولی اللہ نے متوجہ کیا تھا۔ افسوسناک بات جس کی طرف اطہر رضوی نے بھی اشارہ کیا ہے یہ تھی کہ وسائل اور مسائل کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا گیا تھا۔ سلطنت عثمانیہ کے بہت بڑے حامی بھی یہ نہیں سمجھ رہے تھے کہ سلطنت کے زوال کے اسباب کیا ہیں۔ مغربی ممالک کی سیاسی ریشہ دوانیاں بے شک اس زوال اور اس کی پیچیدہ صورتحال میں شریک تھیں مگر مسلمان بیشتر اسلامی ممالک میں اس حقیقت پر نظر داری سے قاصر تھے۔ اطہر رضوی نے جس طرح تاریخی اور تحقیقی نقطہ نظر سے ان امور پر گفتگو اور ان کا تجزیہ

کیا ہے وہ بے حد اہم بات ہے اور ایک نتیجہ خیز کوشش۔

انہوں نے اس تاریخی پس منظر کے ساتھ تاریخی آثار، سیاسی نقشہ جات اور موقعہ بہ موقعہ اقتباسات بھی احتیاط اور دیانت داری کے ساتھ پیش کیے ہیں۔ ایک صفحہ پر عثمانی حکومت کے کیلینڈر کی بھی تصویر ہے۔

کتاب کے دوسرے حصہ میں جو "سانحۂ بازنیا" سے متعلق ہے قریبی ملکوں میں سیاسی اور انتظامی نظام حکومت پر ایک طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے اور ان کے اثرات بازنیا پر کیا مرتب ہوئے ان کوائف کو روشنی میں لایا گیا ہے بوسینا کے مسلمان اپنی شناخت اور تنظیم الگ چاہتے تھے وہ ایران کے اس انقلاب سے متاثر تھے جس کے رہنما علامہ خمینی تھے۔ لیکن علاقائی حکومتیں اور قومی تنظیمات مسلمان باشندوں کے اس انداز نظر کی حامی نہیں تھیں۔ خود مغربی یورپ بھی نہیں۔ اس داخلی اور خارجی کشمکش کو ہم بوسنیا کے الم ناک فسادات اور مخالف تنظیموں کی جارحانہ کوشش کی شکل میں دیکھ سکتے ہیں۔ یہ دور ایک طرح سے Idealogical اختلافات کا دور ہے جس کے تار پود میں سیاسی مصلحتیں بھی بوسنیا یا بازنیا کے خلاف زیادہ مصروف عمل نظر آتی ہیں۔ یہاں کیا کچھ ہوا کس کس طرح ہوا اس تاریخ کو ایک زندہ حقیقت کے طور پر دیکھنے کے سلسلے میں ان تصاویر پر ایک نظر ڈالنا کافی ہوگا۔ جو مصنف نے کتاب کے آغاز میں پیش کی ہیں۔ ان میں تباہ کاریوں کا وہ منظر نامہ بھی ہے۔ جس میں ایک طرح سے بستیوں کی بستیاں اجاڑ دیں۔ شہر ویران کر دیئے۔ انسانی آبادی تہس نہس ہوگئی بے حرمتی اور عصمت دری کے واقعات صدہا نہیں ہزاروں کی تعداد میں ہوئے۔ یہ موجودہ عہد میں مظالم و مصائب کی وہ اندوہناک روداد ہے جس کے بارے میں تمام ضروری تفصیلات مبصرین کے تبصروں، مورخین کے تذکروں اور اخبار نویسوں کی تحریروں کے ساتھ اس کتاب کے صفحات میں موجود ہیں۔

مشرقی یورپ کی تاریخ، لسانی اور نسلی عصبیت نیز عظیم الشان سلطنت عثمانیہ کی تاریخ

عروج زوال جس طرح اس کتاب میں پیش کی گئی ہے۔ وہ اس کے بیانات اقتباسات اور دستاویزی طریقہ کار کو شامل کرتے ہوئے ایک اہم علمی کام کا درجہ دینے کے لیے کافی دوائی شواہد کی حامل ہے۔ اردو میں ایسی کتابیں کم لکھی جاتی ہیں اور مصنف کا یہ جذبہ قابل صد احترام ہے کہ انہوں نے اردو زبان میں اپنے اس علمی کام کو پیش کرنے کے لیے ایک نہایت اہم فیصلہ کیا۔ یہ صرف ایک علمی گفتگو نہیں بلکہ تاریخ نامہ ہے۔ جس پر مصنف تمام اردو دنیا کی تحسین اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔

اطہر رضوی کی ''تصنیف کون عبث بدنام ہوا'' اپنے موضوع کے اعتبار سے جتنی اہم فکر انگیز اور نتیجہ آفریں ہے۔ اس کا نام اتنا ہی سادہ اور پرکار ہے۔ لفظی اعتبار سے وہ ہماری رہنمائی کسی بڑی تاریخی حقیقت کی طرف نہیں کرتا۔ بلکہ ذہن شاعری اور روحانی افکار کی طرف نکل کھڑا ہوتا ہے۔ لیکن جب ہم اس کے مباحث سے گزرتے ہیں۔ تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے مصنف نے اپنے خیالات وسوالات کو کس وسیع مطالعے اور گہرے مشاہدے سے اخذ کیا ہے۔ تب اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ اور حقائق کو تجسس سے تجزیے تک پہنچانے کی ایک مستحسن کوشش کی ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ انھوں نے سلامت روی کا دامن کہیں نہیں چھوڑا اور پیچیدہ بات کو بھی سلیس اور سادہ انداز میں پیش کیا ہے۔ جس سے یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ وہ اس موضوع پر برابر سوچتے رہے ہیں۔ اس کا اندازہ ان کی تصانیف سے بھی ہوتا ہے۔

ان تصانیف اور اس تصنیف کا موضوع مشرق وسطیٰ اور عرب اسلامی ممالک کی عظیم تاریخ کی ان منزلوں سے ہے جب یہ خطہ مغربی قوموں کے اقتدار کی کشمکش کا میدان بنا۔ ترکی سلطنت پہلے ہی سے کمزور چلی آرہی تھی۔ اور اہل یورپ کے نزدیک اس کی حیثیت مشرق کے ''مرد بیمار'' جیسی تھی۔ مگر اس علاقے کو بہت سی سیاسی سماجی اور اقتصادی کمزوریوں کا محور بنانے میں مغربی قوموں کا گہرا ہاتھ تھا۔ اور اس پر قبضہ کیے بغیر مغربی فوجوں کا جنوب مغربی ایشیا تک پھیلاؤ جس کی سمندری حدیں شمالی افریقہ سے سنگاپور بلکہ آگے بڑھ کر ایک

طرف جنوبی کوریا اور دوسری طرف نیوگنی آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ تک پھیلی ہوتی تھیں۔

دو بڑے براعظموں کی جنوبی حدود پر پھیلے ہوئے سمندروں کی وسعتوں پر کنٹرول اسی صورت میں ہوسکتا تھا کہ خشکی کے اس اہم خطہ پر تصرف اور تسلط حاصل کیا جائے جس کو مشرق وسطی کہتے ہیں۔ مڈل ایسٹ میں اس کے لیے انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں جو کچھ ہوتا رہا۔ ایشیا افریقہ مغربی یورپ اور وہاں کی حکومتوں کی تاریخ اس پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتی ہے۔

تیل کی دریافت کے بعد صورت حال پہلے سے کچھ مختلف ہوگئی۔ اس لیے اس علاقے میں مغربی قوموں کے ساتھ اب امریکہ کا اپنا تجارتی سیاسی اور دوسرے مقاصد کے تحت تسلط اور ضروری ہوگیا۔ یوں بھی دوسری جنگ عظیم کے بعد مغربی یورپ کی شکست و ریخت کے نتیجے میں امریکہ کا ایک نئی طاقت کے طور پر عروج ہوا۔

جاپان کی شکست ناگاساکی اور ہیروشیما پر ایٹم بم گرانے کا عمل اور بحرالکاہل میں چین کو آگے بڑھنے سے روکنے کے سلسلے میں مختلف اقدامات نے امریکہ کو ایک نئی سپر پاور بنا دیا اور اس کی سرگرمیاں اس علاقے کے ماسوا مشرقِ وسطی کی تیل کی دولت کو کنٹرول کرنے کے لیے تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئیں۔ ان ہی کی داستان ہے جو اس کتاب میں مختلف حیثیتوں سے پیش کی گئی اور عراق کی جنگ خصوصیت کے ساتھ اس کے لیے ایک محرک بنی ہے۔ جہاں ایک خواہ مخواہ الزام کے ساتھ زبردست فوجی اقدام کیا گیا اور صدام کی حکومت ختم ہوگئی جس کا کوئی حق امریکہ اور اس کے حواریوں کو نہیں پہنچتا تھا۔ یہ ایک ایسا برہنہ رقص تھا جس پر ہنوز کوئی پردہ واقعتاً نہیں ڈالا جاسکا۔

اطہر رضوی نے اپنے مختصر نگارش نامے میں اپنی حدود کا تعین کیا اور اس کو واضح کردیا ہے کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں اور کیوں کہنا چاہتے ہیں ان کے بیان نامے کا کچھ حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

''کون عبث بدنام ہوا''...... میری دوسری تحقیقی تصنیفات ''ہر ملک ملک ماست'' خدا کے منتخب بندے'' اور تاریخ کا سفر'' سے فکری مماثلت رکھتے ہوئے ان سب سے قدرے جداگانہ ہے...... یہ سب میرے عشروں کو سوچ اور تفکر کی صورت گری ہے۔ جن قارئین کو میری دوسری نگارشات پڑھنے کا موقع ملا ہو انہیں اس کا غالباً علم ہو کہ میں کسی قاری یا مسلک کی خوشنودی یا کسی فرقے یا مکتب فکر کی دل آزاری کی نیت سے قلم نہیں اٹھاتا ہوں'

امریکہ کی موجودہ ''تقریباً'' فسطائی حکومت اب اپنی عراقی استعماری رزم آرائی کے تعلق سے یکے بعد دیگرے دن بدن اندرون ملک اپنی ساکھ Credibility کھو رہی ہے ہلیری کلنٹن "Hillary Clinton" نے اپنی سرگزشت "Living History" میں اور ٹی وی پر انٹرویو پر انٹرویو دیتے ہوئے کہا ''امریکہ سیدھے بازو (Right Wing) گرو قدامت پرست (Ultra Conservative) اور بنیاد پرست (Fundamentalist) مذہبی گروہوں کی ایک سازش ہے اور بش ان کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنا ہوا ہے'' 2004ء میں ہونے والے انتخابات میں ڈیموکریٹک پارٹی کے امیدوار اب کھلم کھلا بش پر جھوٹ، فراڈ اور ریاکاری کا الزام لگا رہے ہیں۔ بش کے رفیق اور ہم نوا اب اس کا اعتراف کرنے لگے ہیں کہ اس نے اور اس کے محاربی ٹولے نے عراق پر جنگ جوئی کے لیے جو جواز پیش کیے تھے وہ دراصل جھوٹ کا پلندہ تھے۔

مغرب اور اسلام کے مابین انحرافیت کی بنیادوں تک پہنچنے کے لیے پس منظر کا اندراج میں ضروری سمجھتا تھا۔ اگر چہ یہ تحریر پورے تناظر کا سیر حاصل احاطہ نہیں کرتی تاہم تاریخ کی شہادت سے ایک مقدمہ ضرور پیش کرتی ہے۔

جواز امریکی، اسرائیلی دہشت گردیوں کی تاریخ ہے، تاہم اس میں کسی انتقامی ردعمل کے Justification کی وکالت پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ محض امریکہ کے "Holier than Thou" (ہم تو فرشتہ صفت ہیں) رویے کو قارئین تک پہنچانے اور ذہن نشین کرانے کی سعی ہے۔

تجزیہ...... ایک آئینہ ہے جسے استعمال کر کے اپنی شخصیت اور فکر و عمل کا جائزہ لینے کی دعوت دی گئی ہے! آخر میں چند اشارتی خطوط جو اس تحریر کا مرکزی نقطۂ نظر یا Thesis Statement ہے۔

اس کتاب میں منظور احمد صاحب کا ایک مقدمہ بھی شامل ہے یہ مقدمہ کئی اعتبار سے اہم ہے خاص طور پر اس میں دوسروں کی زبان اور ذہنی تجزیہ کے مطابق مسلمانوں کی بعض کمزوریوں کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے اور اُن کی تاریخ کے مختلف ادوار اور منقوش اوراق پر گاہ گاہ نگاہِ عکس ریز ڈالی گئی ہے۔ مقدمہ کو ایک ڈرامے کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ مقدمہ کی ایک بالکل نئی صورت ہے۔

بیسویں صدی عیسوی کی ابتداء اور بہت بعد تک مغربی قوموں نے اس علاقے پر قبضے کے لیے کیا کیا جال سازیاں کی ہیں تاریخ کے صفحات اس کے گواہ ہیں۔ آج ایک عام روایت کا سہارا لے کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ پرانا شکاری نیا جال لے کر آیا ہے۔

عراق میں امریکہ کی کارروائی ایک بڑی قہرمانی طاقت کی خودنمائی تو تھی مگر اس کے پیچھے کون سا بڑا مقصد تھا اور کن فتنہ پرداز اور جنگجو عناصر کو ختم کرنے کے لیے یہ قدم اٹھایا گیا تھا ان کی صحیح نشاندہی امریکہ اتنی بڑی جنگی نمائش کے باوجود نہ کر سکا۔ بات اصل دوسری تھی کہ عراق میں مغربی قومیں استحکام نہیں چاہتی تھیں اور صدام کے آنے سے پہلے یہاں ایک زمانے تک عدم استحکام کی صورت رہی بھی تھی۔ تیل کی دولت نے اس علاقے کو ایک بہت ہی حساس اور Critical طور پر سیاست کا مرکز بنا دیا ہے۔ جن چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے پاس تیل کی دولت موجود ہے وہ اپنی ثروت کی نمائش تو کر سکتی ہیں لیکن اپنی قومی صلاحیتوں کا اظہار جیسے ان کے بس کی بات نہیں۔ عراق میں صورتحال مختلف تھی اور یہی بات امریکہ اور برطانیہ کو شدید طور پر ناگوار بھی تھی۔ اس مسئلہ کو Beating about the Bush کے طور پر زیرِ بحث لانا امریکہ کے لیے اپنی سیاسی چال بازیوں کے اعتبار سے ایک بے حد ضروری امر ہے۔

جہاں استبدادی حکومتیں پہلے ہی موجود ہوں اور شخصی آزادی کا کوئی واضح تصور نہ ہو وہاں دہشت گردی پنپ کیسے سکتی ہے جب تک کہ خود مغربی قومیں اس کی حمایت اور در پردہ امداد نہ کریں۔

یہ مسائل جن سے آج مشرقِ وسطیٰ جو نبرد آزما ہے اور ریشم کے سے رشتہ در رشتہ جال میں الجھا ہوا ہے۔ اطہر رضوی کی کتاب سے اِس پر ایک تفصیلی روشنی پڑتی ہے۔ انھوں نے اپنی تاریخی حسیت سے کام لیتے ہوئے اس دہشت گردی کو اس کے پس منظر، جواز اور تجزیہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ ایسے مسئلہ میں ان کی زبان قلم اور ان کا ذہن سلامت روی کے ساتھ سوچ سکا۔ اگر چہ اس کتاب کا موضوع ایک گونہ صحافت نگاری کا موضوع بھی ہے اور اس کے اندازہ نگارش کا خاموش تقاضہ بھی۔ مگر اطہر رضوی اپنے گہرے مطالعے اور وسیع تحریری تجربہ کی رہنمائی میں اس پیچ در پیچ راستے سے بڑی خوبصورتی کے ساتھ گزرے ہیں۔

انھوں نے اپنے طریقِ رسائی اور طرز فکر کی جو حد بندیاں کی ہیں انھیں اس کتاب کی اس نگارش نامہ میں دیکھا جا سکتا ہے جہاں فہرست ابواب موجود ہے۔ اس کے بعض عنوانات کا یہاں اشارۃً ذکر کرنا ہی ممکن ہے۔ مثلاً بورقیبا کا ماڈرن اسلام قذافی اور سبز کتاب، تجدید فکر، اندلس کی سوغات الجزائر کا المیہ' دہشت گردی، صورت معکوس، کالے افریقی اور امریکی انصاف، امریکی صیہونی اور سعودی چشم پوشی اور ایران عراق جنگ، سی آئی اے کی تجزیاتی مہمات، تہذیب اور تیل، 9/11 اور افغانستان اور کون عبث بدنام ہوا۔ جو اس کا خلاصۂ بحث بھی ہے۔ ان سب عنوانات کو ایک دوسرے صوری اور معنوی طور پر Interconnect کرنا اور عالمی سیاسیات سے ان کے رشتوں کو جوڑ کر دیکھنا ایک بڑی نظر داری کا تقاضہ کرتا ہے۔ اور یہ اطہر رضوی جیسے کناڈا میں مقیم کسی مشرقی ذہن کی رسائیوں کا ہی حصہ ہو سکتا ہے۔ فارسی کا ایک شعر یاد آرہا ہے۔

داستانِ عہدِ گل را از نظیری باز پرس
عندلیب آشفتہ تری گوید ایں افسانہ را

(عہدِ گل کی داستان کو نظیری سے پوچھ کہ عندلیب چمن اس کو اپنے نغموں کے بکھراؤ کی صورت میں پیش کرتی ہے)

ہندوستان کے مسلمانوں نے مشرقِ وسطیٰ کی سیاست سے قریب ترین ہر دور میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ اطہر رضوی کو مغرب میں رہتے ہوئے اور وہاں کی فضا میں سانس لینے کے باعث کاروافکار کو دیکھنے اور پرکھنے کا موقعہ ملا ہے۔

"کون عبث بدنام ہوا" جیسی کتاب وقت گزرنے کے ساتھ اپنی اہمیت کا احساس دلائے گی اور یہ بھی محسوس ہوگا کہ ہندوستان کے ایک مسلمان ذہن نے زندگی اور زمانے کے اس مسئلہ کو اس کی پہلوداریوں کے ساتھ کس طرح اور کس حد تک سمجھا۔

اطہر رضوی نے بعض چھوٹے چھوٹے اور وقتی موضوعات کو بھی اپنی قلمی اور علمی کاوشوں کے لیے چنا ہے لیکن بات کرتے وقت اخذ نتائج کے لمحات میں وہ سنجیدہ رہے ہیں اور جو فقرہ بھی اُن کے قلم سے نکلا اور صفحۂ قرطاس پر آیا وہ اُن کی ذہنی پرچھائیوں کا اظہار بھی ہے اور فکر فرمائیوں کا نتیجہ بھی۔ بڑی بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنے خیالات میں الجھاؤ اور اپنے سوالات میں پیچیدگیاں نہیں پیدا کیں۔ انھیں برابر اپنے مطالعے اور مشاہدے کی روشنی میں دیکھتے اور پرکھتے رہے۔ اور سوچنے سمجھنے اور کاغذ پر منتقل کرنے کا عمل کچھ اس طرح فکروخیال سے ہم آہنگ رہا کہ ہم اُن کے یہاں ریشم کے دھاگوں جیسا کوئی الجھاؤ نہیں دیکھتے۔ اطہر رضوی صاحب سادہ زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ مگر الفاظ کی بہتات اور لفظی انشاء پروانہ رنگ و آہنگ کے ساتھ ان کی تحریروں میں کم ہی آتی ہے۔

اطہر رضوی کو پڑھتے وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ اگر چہ انھوں نے مشرقی ادبیات اور نگارشات کا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا ہے لیکن طرز اور اسلوب تحریر میں وہ مغرب سے متاثر ہوئے

ہیں۔ یہ مغرب میں قیام کا ایک قدرتی نتیجہ بھی ہو سکتا ہے اس سے اُن کے یہاں انتخابیت کی روش کا بھی گہرا احساس ملتا ہے وہ بات کو سچائی کے ساتھ کہنا پسند کرتے ہیں مگر اس انداز سے نہیں کہ اس میں سلیقے طریقے کا فقدان محسوس ہونے لگے۔

اطہر رضوی نے انگریزی تہذیب، تاریخ اور زبان و بیان کی کشش و روش کو کبھی اپنی سوچ فکر سے الگ نہیں کیا اور اس پر سوچ کے عمل کو اس شگفتگی اور شادابی انداز سے جاری رکھا۔ کہ اس پر کبھی ترجمے کا دھوکا نہیں ہوتا۔ وہ سیدھے سادھے انداز سے اپنی تحریروں میں ترجمانی کی پرچھائیاں لاتے ہیں مگر ترجمہ نگاری کو اپنے تحریری سلیقے سے الگ رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کا ایک بہت ہی پرکشش اور معنی خیز فقرہ ہے جو برابر ذہن کو Haunt کرتا رہتا ہے۔ "میرے بھائی اگر کوئی بات اس لائق ہے کہ اس کو کہا جائے تو وہ اس لائق بھی ہے کہ اسے کہنے میں سلیقہ اور طریقہ برتا جائے۔" مہذب گفتگو کو بھی الفاظ کی بہتات سے گراں بار نہ ہونا چاہیے۔ اور چاہے وہ تراش خراش کے عمل سے نہ گزرے مگر ناتراشیدہ جملوں کے لیے نہ نثر میں کوئی گنجائش ہوتی ہے نہ نظم میں۔

اطہر رضوی نے اس سفرنامے میں یوں تو اپنے سیر و سفر کے خصوصی رجحان اور طبعی میلان کو جگہ جگہ پر خلوص انداز میں پیش کیا ہے۔ جس میں کوئی لگاوٹ یا بناوٹ نظر نہیں آتی۔ مگر اس ذوق وشوق نے ان کو زبان و بیان کی صفائی اور ستھرائی پر مسلسل زور دیتے رہنے پر آمادہ کیا۔ یہ ان کی تحریر میں لائق دید بھی ہے اور قابل داد بھی۔

ہم جانتے ہیں کہ کبھی کبھی سادہ سلیس انداز بھی ایک طرح کے تکلف کا رنگ اور آہنگ پیدا کر لیتا ہے۔ مگر یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جبکہ لکھنے والے کے پاس الفاظ کا سرمایہ تو ہوتا ہے لیکن وہ علمی گفتگو تاریخی پس منظر اور تہذیبی رنگا رنگی اس کی زبان اور خاص طور پر ذہن کا حصہ نہیں ہوتی۔ جب اسے اپنی زبان میں کچھ کہنا ہوتا ہے رضوی صاحب اپنی تحریروں میں اپنی سوچ کو پیش کرتے ہیں۔ مگر سوچ سوچ کر نہیں لکھتے اس وجہ سے ان کے یہاں اس ٹھہراؤ یا

انجماد کا تصور نہیں پیدا کرتا جب آدمی اپنے خیالات کے پیچ و پیچاک میں خود ہی الجھ کر رہ جاتا ہے۔ غالبؔ نے جب یہ شعر لکھا تھا اور اس کا اعتراف کیا تھا کہ ان کے مخلص احباب ان سے آسان کہنے کی برابر فرمائش کرتے رہتے ہیں تو وہ اس گومگو میں پھنس گئے تھے جسے گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل کہا جاسکتا ہے۔

اطہر رضوی کے یہاں تحریر ہو یا تقریر زبان قلم سے ان کو کوئی بات کہنا ہو یا اپنی زبان میں اپنے خیال اور حال کی لفظی تصویریں پیش کرنا ہوں وہ کہیں بھی الجھ کر نہیں رہ جاتے۔ نہ اپنے سامنے بہت سی دنیاؤں کو دیکھ کر ان کا قلم خلائی سفر کا انداز اختیار کرتا ہے۔

رضوی صاحب کا خصوصی رجحان تاریخ کا مطالعہ ہے وہ مطالعہ جس میں تاریخی واقعات بھی شامل ہوں اور وہ تاثرات اور تصورات بھی جو ایک حساس ذہن اور فعال طبیعت کو متاثر کرتے ہیں اور فکر کی نئی راہوں کی طرف لاتے ہیں۔ تاریخ سے اُن کا رشتہ مطالعہ کی وسیع حدود سے بھی تعلق رکھتا ہے اور اُس تہذیبی تناظر سے بھی جس کے بغیر تاریخ و روایت کی معنی بینی اور معنی یابی ممکن نہیں۔ اُن کا سفرنامہ اپنے طور پر کوئی سادہ تاریخ تو نہیں ہے مگر تاریخ اور تہذیب کے باہمی رشتہ اور ان رشتوں سے وابستہ ادب وآداب اور اسالیب اُن کی نظر میں رہتے ہیں۔ ان کی مطالعاتی حدیں ان ذہنی تجربوں کو بھی اپنے اندر سمیٹ لیتی ہیں جو مسلسل فکر فرمائیوں کا نتیجہ کہے جاسکتے ہیں۔ ایک ذہین آدمی اور مطالعے تیز مشاہدے کا شوقین فرد صرف لکھتے وقت ہی نہیں سوچتا دیکھتے وقت بھی سوچتا ہے اور جب اپنے خیالات میں گم ہوتا ہے تو اس وقت بھی اس کے ذہنی اطراف میں اس کا تجربہ، تجزیہ اور ادبی اصطلاحوں کے زیر اثر تجزیہ اور تعبیر اس عمل میں شامل رہتا ہے۔ بات انکار یا اقرار کی نہیں ہوتی اس طرز رسائی اور طریق فہم کی ہوتی ہے۔ جس سے کسی سوچنے سمجھنے اور لکھنے والے کو اخذ نتائج میں مدد ملتی ہے۔

عام طور پر ہمارے مطالعے میں تاریخی حقائق کی شمولیت مطالعے کی جہات میں وسعت

بھی پیدا کرتی ہے اور دید و دریافت کے عمل سے بہت سی ان سچائیوں تک بھی اس کے وسیلے سے قارئین اور سامعین کی فکر اور فن کی سطح اور جہت یا ایک سے زیادہ اطراف تاثر قبول کرتی ہیں۔ ہم دوسروں کے ساتھ بھی ہوتے ہیں اور دوسروں کو اپنے سفر کے طور پر بھی قبول کرتے ہیں۔ یہ سوچ انفرادی بھی ہوتی ہے اور اجتماعی بھی۔ رضوی صاحب کے یہاں یہ عمل خاص طور پر ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے کہ ان کی رائے اپنی ہوتی ہے۔ وہ اسے جچے تلے انداز میں پیش کرتے ہیں مگر وہ رعایت سے کام نہیں لیتے۔ وہ سوگیری اور جانب داری سے شعوری نیم شعوری یا لاشعوری سطح پر الگ رہتے ہیں۔ انھوں نے امامیہ عقائد رکھنے کے باوصف شیعی روشوں پر جو گفتگو کی ہے اور جس میں انکار و اقرار سے زیادہ تفہیم اور تقدیم سے جو پیمانے اخذ کیے ہیں وہ ان کی گفتگو اور انداز نظر کو ایک غیر معمولی وقار اور وسعت نظر کا آئینہ دار بناتے ہیں۔

کچھ کہنے سے پہلے وہ تبادلۂ خیال اور مطالعہ کے ضروری تقاضوں سے واسطہ پیدا کرنا لازمی خیال کرتے ہیں۔ جگہ جگہ انھوں نے اپنی احتیاط کا ذکر کیا ہے۔ کہ وہ اس موضوع پر ضروری مطالعہ نہیں کر پائے یا ان کو اپنے علمی احباب اور صاحبان نظر سے تبادلۂ خیال کا اتفاق ہوا۔ یہ راقم الحروف کے نزدیک بہت بڑی بات ہے۔ اس آسمان کے نیچے کوئی عالم الکل نہیں ہے۔ ہر ایک کے علم کی حدیں اور معلومات کے دائرے مخصوص اور محدود ہوتے ہیں۔ اور اُن میں سوچ بچار تجربے اور تجزیہ کا عمل نئی وسعتیں اور نئی تہہ داریاں پیش کرتا ہے مختلف تہذیبی حلقوں سے ذہنی ہم رشتگی اور علمی وابستگی کو جو احباب پسند کرتے ہیں اور جو اصحاب اس پر ماضی میں زور دیتے رہے ہیں میں نے اپنی محدود نظر کے مطابق رضوی صاحب کو ایسے اصحاب و اشخاص میں ایک منفرد اور مغتنم آدمی کی صورت میں دیکھا ہے اور جب ان کی تحریروں کی پڑھتا ہوں تو ان کی فکری موجودگی کا احساس بھی برابر ذہن کے ساتھ رہتا ہے۔ اسی لیے ان کا مطالعہ میرے لیے تبادلہ خیال کا سا درجہ رکھتا ہے۔ شاید ایسے کچھ دوسرے اشخاص بھی ہوں جنھوں نے رضوی صاحب کی تحریروں کا مطالعہ یکسوئی اور یکجہتی کے ساتھ کیا

ہو۔ ہونے چاہیے۔ اب یہ ہے کہ اُن پر نتیجتاً کم لکھا گیا ہے ورنہ وہ مستحق تو اس بات کے بھی ہیں کہ ان کی شخصیت کے ذریعہ ہم مغربی اور مشرقی شعور کی خوش آمیزی اور ہم آہنگی کا مطالعہ کریں۔ اقبالؔ نے کہا تھا:

مشرق سے نہ انکار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

مشرق ومغرب کے اقرار میں ایسی شخصیات کا ایک اہم کردار ہوتا ہے جن کے شعور اور شخصیت میں ہم ان اقدار کو ہم رنگ و آہنگ محسوس کرتے ہیں۔

اطہر رضوی کی تصانیف

اے خیام

کچھ تحریریں ایسی ہوتی ہیں جن کے لیے کسی مروجہ صنف کی نشان دہی نہیں کی جاسکتی۔ ایسی تحریروں کے لیے، جن کی صنف کا تعین ہونا ابھی باقی ہے، ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے رسالے ''اوراق'' میں ''امکانات'' کی سرخی متعین کی ہے۔

اس وقت اطہر رضوی کی کتاب ''گر ہم برا نہ مانیں'' میرے زیر مطالعہ ہے۔ خود اطہر رضوی نے اسے ''انشائیہ'' اور مختصر سفر کی روداد کہا ہے۔ لیکن یہ کتاب اس سے سوا ہے۔ اس کتاب کے مندرجات اس انشائیے کے ذیل میں نہیں آتے جس کے لیے یہ صنف یعنی ''انشائیہ'' اب معروف ہے۔ یہ محض ''مختصر سفر کی روداد'' بھی نہیں ہے۔ یہ کسی خاص موضوع پر لکھے گئے محض تاثرات پر بھی مبنی نہیں ہے۔ یہ وہ تحریریں ہیں جن پر ابھی کسی مخصوص صنف کا لیبل نہیں لگایا جاسکتا۔

اطہر رضوی کناڈا میں مقیم ہیں۔ اپنی فعالیت اور اردو زبان و ادب سے اپنے عشق اور شدت خلوص کے لیے یہ پوری ادبی دنیا میں متعارف ہیں۔ انھوں نے بڑی سیاحت کی ہے اور انھیں وہی چیزیں، وہی جگہیں متاثر کرتی ہیں جہاں سے علم کا حصول ممکن ہو، جو معلومات میں اضافہ کرسکے، جو تحقیق و تجسس کی پیاس مٹاسکے، جو ایک دانشورانہ ذہن کو متوجہ کرسکے۔ ''اردو کی نئی بستیاں'' سیمینار کے سلسلے میں دلی مدعو کیے گئے تب بھی ان کے ذہن میں صرف سیمینار میں شمولیت کا خیال نہیں تھا بلکہ اندر ہی اندر ایک منصوبہ بن رہا تھا کہ کن لوگوں سے

ملنا ہے، کن باتوں پر گفتگو کرنی ہے، کن جگہوں کو دیکھنا ہے، کون سی باتیں تحقیق طلب ہیں اور کن کن باتوں کا خاص طور پر مشاہدہ کرنا ہے۔

اطہر رضوی صرف ایک کھلے ذہن کے آدمی نہیں ہیں، بلکہ وہ کسی بھی موضوع پر کوئی بات بہت حتمی انداز میں کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اور حتمی بات وہی کرسکتا ہے جو اپنی ایک رائے رکھتا ہو اور اپنی رائے کے حق میں دلائل فراہم کرسکتا ہو۔

کتاب ''گرہم برانہ مانیں'' میں اطہر رضوی نے صرف سمینار کا حال ہی بیان نہیں کیا بلکہ اس کی کوتاہیوں کی بھی نشان دہی کردی ہے۔ اس میں اپنے سفر کی روداد بھی انھوں نے دلچسپ انداز میں لکھی ہے اور اپنے مشاہدات سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں اور کسی کجی اور کوتاہی کی نشان دہی بھی کرتے جاتے ہیں۔

دلی جا کر وہ دلی ہی کے ہو کر نہیں رہ گئے۔ کم مدت میں انھوں نے خاصی دور تک پیر پھیلائے ہیں۔ اتنی مختصر مدت میں جتنا کچھ ممکن تصور کیا جاسکتا ہے، انھوں نے اس سے بہت زیادہ حاصل کیا اور زیر تحریر لائے۔ خود تحریر کا پھیلاؤ اتنا زیادہ ہے کہ ان کا قیام مختصر محسوس نہیں ہوتا۔ انھوں نے سوچنے، سمجھنے اور غور وفکر کے لیے اتنا مواد فراہم کردیا ہے کہ مختصر سے مضامین کبھی پیاس بجھاتے ہیں اور کبھی تشنگی بڑھاتے ہیں۔

اطہر رضوی کا اٹھا ہوا ہر قدم، تمام مضامین تحریر کے ایک ایک جملے تحقیق و تجسس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ خلوص نیت کے ساتھ انھوں نے کہیں کہیں طنزیہ لہجہ بھی اختیار کیا ہے جو گراں گزرنے کی بجائے قاری کو اپنا ہم نوا بنا لیتے ہیں۔

''گرہم برانہ مانیں'' میں سیاسی مضمون بھی ہے اور ''لکھنو کی ذیلی تہذیب''، ''دینی مدرسے''، ''ہندوستانی جمہوریت اور مسلمان''، ''رام پور کی رضا لائبریری''، ''سرسید اور علی گڑھ'' اور دیگر مضامین متنوع موضوعات پر موجود ہیں ایک ایک جملہ جیسے دانشورانہ شان سے مملو ہے۔ چند مضامین تو کچھ زیادہ ہی مختصر ہیں لیکن پھر بھی سوچنے کے لیے مواد چھوڑ جاتے ہیں۔

اطہر رضوی کی یہ کتاب ''گر ہم برا نہ مانیں'' پڑھ کر ان کی فراخ دلی اور کشادہ ذہنی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ وہ اپنے آپ پر کبھی طنز کے تیر برساتے ہیں اور بعض اوقات اپنی قوم کی پستی، تہذیبی و اخلاقی زوال کا بڑے کرب واندوہ کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ کبھی کبھی جیسے خود کلامی کرتے ہیں لیکن قاری ان کے ساتھ ساتھ رہتا ہے ان کی سوچ میں شریک، ان کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتا ہوا۔

''گر ہم برا نہ مانیں'' ان کی پہلی تصنیف ہے جو میرے زیر مطالعہ آئی۔

اس کے مطالعہ سے میں نے یہ رائے قائم کی کہ اطہر رضوی اپنے خیالات کے اظہار کے لیے کسی مخصوص صنف کا انتخاب نہیں کرتے بلکہ موضوع کو اہمیت دیتے ہیں۔ ان تحریروں پر کسی مخصوص صنف کا لیبل لگایا جانا ابھی باقی ہے۔ اطہر رضوی کئی کتابوں کے مصنف ہیں اس کتاب کو پڑھ کر صدق دل سے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش ان کی اور تحریریں بھی پڑھنے کو ملیں۔

اس کے بعد مجھے ان کی کتاب'' تاریخ کا سفر۔ بلکینیا سے بازنیا تک'' ملی اور اس کے مطالعے کے بعد میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اردو میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ یہ پورے بلقان، سلطنتِ عثمانیہ، یوگوسلاویہ کا انتشار اور بازنیا کے سانحے کی ایسی دردناک کتھا پر مشتمل ہے جسے پڑھنے کے لیے بھی بڑے مضبوط اعصاب کی ضرورت ہے۔ بازنیا کے سلسلے میں ہم سب کو علم ہے کہ وہاں ایک سال کے اندر ایک لاکھ شہریوں کو تہہ تیغ کیا گیا اور تیس ہزار خواتین کی عزت آبرو لوٹی گئی اور اس ''ترقی یافتہ'' اور ''مہذب'' قوم نے، اطہر رضوی کے الفاظ میں، یہ سب کچھ ایک ''قومی اور مذہبی فریضے'' کے طور پر کیا۔ اس سلسلے میں خبریں ہم تک پہنچتی رہیں، اخباروں کے ذریعہ اور میڈیا کے دوسرے ذرائع سے بھی، لیکن ان کی کتاب'' تاریخ کا سفر۔ بلکینیا سے بازنیا تک'' میں جو دل سوز حقائق سامنے آئے ہیں اور جس دل گداز انداز میں بیان کیے گئے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم تک جو خبریں پہنچیں وہ تو

دل گداز انداز میں بیان کیے گئے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم تک جو خبریں پہنچیں وہ تو اصل حقائق کا عشر عشیر بھی نہیں تھیں۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ یہ ایک ایماندار محقق کی متجسسانہ کاوش ہے جس نے تمام متعلقہ جزویات کو مد نظر رکھا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت اور قدر و قیمت میں اس بات سے مزید اضافہ ہوتا ہے کہ اس کتاب کا انتساب ایک امریکی صحافی Roy Gutman کے نام ہے جو یہودی ہے لیکن اطہر رضوی اس کی حق گوئی اور انصاف پسندی سے اتنے متاثر ہوئے کہ کتاب کو اس کے نام معنون کردیا۔ یہ وہی رائے گٹمین ہے جس نے اپنی انفرادی جد وجہد سے بازنیا کی قتل گاہوں اور مظلوم عورتوں کی عصمت دری کے سانحے کا دنیا پر انکشاف کیا۔ یہ انتساب اس صداقت، بے خوفی، سچائی، حق گوئی اور بے باکی کا اعتراف ہے جو کسی بھی جانب سے ہو۔ اطہر رضوی خود ان ہی صفات کے حامل ہیں۔

اطہر رضوی ایک محقق اور تاریخ داں ہی نہیں، شاعر بھی ہیں، ادیب بھی ہیں، زبان و بیان پر دسترس رکھتے ہیں اور سب سے بڑی بات کہ اپنی ایک رائے رکھتے ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں جابجا ایسے فقرے استعمال کرتے ہیں جو ذہن کے در کھولتے جاتے ہیں اور بسا اوقات ایسا لگتا ہے کہ یہ تو کسی بھی بڑے سیمینار کا موضوع بن سکتے تھے۔ مثلاً:

۱۔ جہاں تک اخلاقیات، انصاف، انسان دوستی اور انسانی حقوق کے تحفظ کے اعلیٰ اور بلند اصولوں کا تعلق ہے، روس نے بازنیا کے سانحے میں مغربی طاقتوں کی طرح ایک شرم ناک ریاکاری کا مظاہرہ کیا۔

تیسری دنیا کی اصطلاح دوسری جنگ عظیم کے بعد استعمال میں آئی، بلکندیا حقیقتاً پہلی دراصل تیسری دنیا تھی۔

۳۔ بازنیا کی یک طرفہ جنگ کے دوران اور اس کے بعد پاکستان نے جس طرح بازنیا کی، بغیر کسی معاوضے کے، توقع سے زیادہ مدد کی، وہ غالباً پاکستان کی نصف صدی کی امورِ خارجہ پالیسی کا زریں باب تھا۔

''تاریخ کا سفر۔بلکیپیا سے بازنیا تک'' میں ایسے بہت سے اشارے ہیں جو کسی بڑے پلیٹ فارم پر بھرپور گفتگو کا موضوع بن سکتے ہیں۔

اب مجھے ان کی تازہ ترین تصنیف ''چہرے باتیں یادیں لوگ'' ملی تو اس میں بھی مجھے ایسے جملوں سے سابقہ پڑا جو موضوع بحث ہو سکتے ہیں۔ مثلاً:

ا۔ میرے نزدیک کسی مصنف کے وقت، محنت اور عرق ریزی کے حاصل کام کی ناقدری کلچر کے ادبی معیار کی نشان دہی کرتی ہے۔

۲۔ جب فکر کا کینوس وسیع اور بسیط ہو اور اس کے استعمال پر کسی قسم کی پابندی نہ ہو تو قوت متخیلہ، ذہانت اور صلاحیت کے امتزاج سے تخلیق کی نئی راہیں پیدا ہوتی ہیں۔

ایسی بہت سی مثالیں اس کتاب سے دی جا سکتی ہیں جو سوچ کو مہمیز دیتی ہیں اور تحریر کی پختگی ارتکاز سے ہٹنے نہیں دیتی۔

''چہرے باتیں یادیں لوگ'' میں گیارہ مضامین ہیں جو بارہ شخصیات کے مطالعے پر مبنی ہیں۔ شخصیات پر لکھے گئے یہ مضامین خالصتاً خاکے نہیں ہیں، نہ ہی تجزیہ نگاری کے نمونے، نہ کلیتاً ستائشی ہیں اور نہ محض دل کی بھڑاس نکالنے کی کوشش۔ اکثر مضامین کچھ حد تک ستائشی پہلو لیے ہوئے ضرور ہیں اور کسی حد تک معتقدانہ بھی، لیکن تین مضامین ایسے ہیں جن میں مثبت اور منفی دونوں پہلو موجود ہیں۔ شاید اس طرح اطہر رضوی نے توازن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان مضامین کا پہلا حصہ ان شخصیات کی فنکارانہ کارگزاریوں کا تجزیہ کرتا ہے اور دوسرا حصہ ان شخصیات کے کردار کی کجی پر روشنی ڈالتا ہے۔ ان مضامین کا دوسرا حصہ یقیناً مختصر ہے کیونکہ یہ سب کچھ اطہر رضوی نے اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر لکھا ہے۔ یہ حصہ بھی اتنا ہی طویل ہو سکتا تھا جتنا پہلا حصہ، اگر اطہر رضوی دور دیس میں مقیم نہ ہوتے اور ان شخصیات سے قربت کا دورانیہ زیادہ ہوتا۔ ان تین مضامین میں سے ایک کا عنوان ہے ''عالی جی'' اور دوسرے کا ''حمایت علی شاعر''۔ تیسرا مضمون گیان چند جین سے متعلق ہے جو اپنے بڑے

بڑے کارناموں کی بنا پر، ایک بلند قامت شخصیت کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی ایک کتاب، بلکہ ان کی زندگی کی آخری کتاب ''ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو ادب'' سامنے آئی تو ان کی ساری بلند قامتی ریت کے تو دے کی طرح ڈھیر ہو گئی اور انھوں نے اپنے سارے کارناموں پر گویا خود ہی پانی پھیر دیا۔ اس کتاب کی طباعت اشاعت میں سارا عمل دخل گوپی چند نارنگ کا تھا اور ان کا جین صاحب کے لیے یہ کہنا کہ آپ کو اس کا علم نہیں، وہ شروع سے ایسے ہی ہیں، اُن کی پاک دامنی ثابت نہیں کرتا۔ کتاب تو پہلے صفحے سے جین صاحب کے خیالات کی چغلی کھا رہی ہے یعنی امرت کا انتساب۔ امرت رائے اپنے متعصبانہ خیالات کے سبب اچھی طرح جانے جاتے ہیں اور گوپی چند نارنگ کی مصلحت پسندی سے پوری اردو دنیا واقف ہے۔ لیکن اس انتساب سے قطع نظر، تحریر تو گیان چند جین ہی کی ہے اور ساری ذمہ داری ان پر ہی عائد ہوتی ہے۔ اس کتاب کا نوٹس تو لیا جانا ہی تھا، سو لیا گیا اور بھر پور طریقے سے لیا گیا۔ اطہر رضوی کا کنٹری بیوشن یہ ہے کہ انھوں نے گیان چند جین کے چند خطوط بھی اپنے مضمون میں شامل کر دیئے جو یقیناً گیان چند جین کی شخصیت کے اندرون کو سمجھنے اور ان کے متعلق غیر جانبدارانہ رائے قائم کرنے میں معاون ہو سکتے ہیں۔

''ستیہ پال آنند'' اور ''نسیم سید'' اطہر رضوی کی تنقیدی، تجزیاتی اور نکتہ رسی کی صلاحیت کو اُجاگر کرتے ہیں۔ ''سلطانہ مہر'' محنت اور ذہانت سے کتابیں مرتب کرتی ہیں، ان کے متعلق خاصی تفصیل سے اطہر رضوی نے مضمون لکھا ہے۔ حقی صاحب کی شخصیت بیس صفحات میں نہیں سما سکتی تھی، ان کی شخصیت اور کارناموں کا اُجاگر کرنے کے لیے کتابیں درکار ہیں لیکن اطہر رضوی نے چند الفاظ میں ان کی بہت ساری صفات کو سمو دیا ہے، یہ اقتباس دیکھئے۔

''شخصیت کی شناخت اور اس کی مرتبت کی تقویم میں شان الحق حقی کے نام کو کسی بھی میزانیے پر رکھا جائے تو نتیجتاً صرف ایک ہی حقیقت کی آگاہی ہوگی، وہ یہ کہ حقی صاحب کے ہم پلہ اور مرتبہ کوئی اور ہمہ گیر اور ہمہ داں شخصیت اردو تہذیب میں پیدا نہیں ہوئی۔ حقی

صاحب مجھ ناچیز کی نظر میں اردو تاریخ کی واحد شخصیت ہیں جس نے اردو کی نثر و نظم کی ساری اصناف، اظہار و ابلاغ کے سارے ذرائع، فکر و معنی کی ساری صورتوں پر اپنی جینیس کے نقوش چھوڑے ہیں۔''

''من موہن شرما'' کی عجیب و غریب شخصیت سے بھی انھوں نے متعارف کروایا ہے اور یہ تعارف خاصا دلچسپ ہے۔ الیگزنڈر پشکن سے جس طرح وہ متاثر ہیں، ہم سب بھی اتنے ہی متاثر ہیں اور ان کی رائے کی تائید کرتے ہیں۔

آخر میں ''ثریا اور سونیا'' کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ اس مضمون نے اس کتاب کی وقعت میں اضافہ کیا ہے۔ ثریا اور سونیا دونوں شخصیتیں ہی بے حد متاثر کرتی ہیں۔ یہ مضمون ان دونوں شخصیتوں کا خاکہ یا تعارف ہی نہیں، ایک اچھے فکشن کا سا تاثر بھی دیتا ہے اور یہ تاثر ذہن میں تادیر قائم رہتا ہے۔ یہ ایک جہد مسلسل، مستقل مزاجی، ثابت قدمی، انتھک تگ و دو، بھرپور عزم اور انتہائی نامساعد حالات میں فتح و کامرانی حاصل کرنے کی نادر مثال ہے اور اطہر رضوی کے دلسوز اور دلگداز بیانیے نے اس تاثر کو بہتر گہرا کر دیا ہے۔ مضمون کا اختتام اس طرح ہے:

''حالات کے کینوس پر ایسا لگتا ہے کہ جیسے ایک قفس میں دو پنچھی اداس بیٹھے ہیں۔ قفس کا در کھلا ہے لیکن دونوں چپ چاپ بیٹھے، ایک دوسرے کو تک رہے ہیں۔ دونوں میں سے کسی میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ دوسرے کو اکیلا چھوڑ کر قفس سے باہر اڑ جائے۔ زندگی کے قفس میں بیٹھے ہوئے ان دونوں پنچھیوں سے مجھے دلی قرابت ہے!

خداوندِ عظیم ان کی مشکل حل کرے......''

اطہر رضوی صاحب! ہم سب آپ کی اس دعا میں تہہ دل سے شریک ہیں۔

———oooOOOooo———

ہوائے دشت کا غیظ وغضب پکارتا ہے

پروفیسر محسن احسان، برمنگھم

اطہر رضوی اُن دانشوروں میں ہیں جو رہتے تو مغربی سرزمین پر ہیں لیکن ان کا دھیان مشرقی دنیا اور خاص طور پر عالم اسلام کے مسائل اور پیچیدگیوں میں الجھا رہتا ہے۔ دو جہاں دیدہ بھی ہیں اور جہاں گرد بھی۔ انہوں نے دنیا کے اکثر ممالک کی خاک چھانی ہے اور بڑی جانفشانی اور عرق ریزی سے مسلم امہ کے دکھ درد کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ خدا کے منتخب بندے ہر ملک ملک ماست اور تاریخ کا سفر بلکلنیا سے بازینا تک اُن کی فکر انگیز تحریریں ہیں جو ہماری مشکلات اور مصائب کو سمجھنے کی آئینہ داری کرتی ہیں۔ یہ تازہ تحقیق کون عبث بدنام ہوا اس دہشت گردی کے بارے میں ہے جس نے کرہ ارض کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ اس کا پس منظر جواز اور تجزیہ فاضل مصنف نے بڑے غور وفکر کے بعد کیا ہے۔ عالم اسلام کے ذہنی اخلاقی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تمدنی پسماندگی اور انتشار کا جائزہ لیا ہے اور موجودہ عرصہ میں مختلف تہذیبوں اور اقوام کے درمیان ظلم، تعصب، تشدد، قتل وغارتگری، بربریت اور لوٹ مار کا غیر جانبدارانہ فکری تجزیہ کیا ہے۔ انہوں نے مغرب اور عالم اسلام کے درمیان کشمکش اور تصادم کی بنیادیں تلاش کرنے اور اس پس منظر میں ہونے والے واقعات وحکومت کے تناظر میں تازہ صورتحال پر نظر دوڑائی ہے۔ امریکی اور اسرائیلی دہشت گردیوں کی تاریخ پر ان دونوں ملکوں کی سیاسی اور انتقامی کارروائیوں کا جائزہ پیش کیا ہے اور تجزیہ میں ایک ایسا آئینہ سامنے لگا دیا ہے جس میں شخصیتوں ان کے فکر وعمل اخلاق وکردار اور خواہشات جہاں گیری

اور جہاں بنائی کے متعدد عکس پیش کیے ہیں ان کے خیال میں مذہب عقائد اور طریق جہاں بانی کو قطعی طور پر الگ اور آزاد کیے بغیر کوئی اسلامی ملک مغرب کا ہمسر نہیں ہو سکتا ہر شہری کو اپنے مذہب مسلک اور عقیدے کے مطابق عبادت گزاری میں مکمل آزادی ہونی چاہیے۔ حکومت یا کسی فرقے کو مذہبی درجہ بندی اور تعزیت و ترجیح کا حق نہیں ہونا چاہیے۔ کسی بھی اسلامی ملک میں جمہوریت وہاں کے مطلق العنان اور خود ساختہ بادشاہتوں کے بغیر ممکن نہیں۔ وہ سعودی عرب اور نام نہاد ایرانی اسلامی حکومت پر بھی کڑی تنقید کرتے ہیں۔ مغربی تجزیہ نگاروں کے نزدیک ایران طالبان کی فکر اور رویے کے زیر سایہ چل رہا ہے۔ اسرائیلی جارحیت اس کے روڈ میپ کے باوجود اپنی بربریت اور تشدد سے رکتی نظر نہیں آتی۔ امریکہ نے افغانستان اور عراق میں جس ظلم و دہشت گردی کا مظاہرہ گذشتہ کچھ عرصے میں کیا ہے وہ ساری دنیا پر عیاں ہے۔ مگر اس طاقتور جن کو بوتل کے اندر بند کرنے کے لیے کسی کے پاس کوئی پر اثر نسخہ نہیں۔ اسلامی ملکوں میں دولت کے وسائل اور تیل و دیگر معدنیات کے ہوتے ہوئے بھی سائنس اور ٹیکنالوجی کی عدم موجودگی نے انہیں پسماندہ کمزور اور ناکارہ بنایا ہوا ہے۔ مسلم اُمہ میں اتحاد و اتفاق اور فکر کی یک جہتی کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ تمام اپنی خواہشات کے اسیر اور جاہ و حشمت و جلال کے گرفتار ہیں۔ ایسے لگتا ہے کہ:

خدا سے عالم اسلام کو شکایت ہے　　　کہ ان کے جسم بناتا ہے سر بناتا نہیں

عقل و فہم و ادراک کے بغیر کوئی ملک آج کے دور میں خود ترقی کر سکتا ہے اور نہ ترقی یافتہ اقوام کی صف میں کھڑا ہو سکنے کی جسارت کر سکتا ہے۔

اطہر رضوی کے خیال میں اسرائیل کے حکمرانوں کے چہرے پر دوہری نقابیں ہیں ایک مظلومیت کی نقاب جس کو اس نے بڑی عیاری، مہارت اور دیدہ دلیری سے اوڑھ رکھا ہے اور خود کو انسان دوست، خدا ترس اور مہذب کہلانے کے لیے ہر ممکن وسیلے استعمال کرتا ہے۔ دوسری نقاب کے پیچھے اسلحہ سے لیس، انتہائی طاقتور، سنگ دل، پیشہ ور سیاست دانوں کا

ہے جو پتھروں سے مقابلہ کرنے والے معصوم ومظلوم بچوں کے سینوں پر گولیاں اور سروں پر بموں کی بارش کرتا ہے دنیا ایک عرصہ تک اس کی مکارانہ اور عیار پالیسیوں کی تہوں تک نہ پہنچ سکی۔ مگر اب حقیقت کھل کر سامنے آگئی ہے۔ امریکہ کی اسرائیلی پشت پناہی امریکہ کے میڈیا اور امریکہ کے مال ودولت پر یہودی کی مضبوط گرفت اسے ظلم وستم و بربریت کو روا رکھنے پر اکسارہی ہے۔ امریکہ کی جمہوریت کا مصور زردوزر پرستی کے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ ایسی سیاسی کشمکش اور ذہنی انتشار کے اس دور میں مسلمانوں کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ انہوں نے معاشرتی ساخت اور قوانین کا جو استمزابی پیرانوائم مقدس سمجھ کر قبول کیا ہے۔ اس کا مصرف زیادہ دیر تک چلتا دکھائی نہیں دیتا یہ انتہائی بدنصیبی ہے کہ اجتہاد جو اسلامی معاشروں کا اصول حرکت و ارتقاء تھا اب جمود ورجعت کا اصول بن گیا ہے۔ تمام مسلمان ریاستوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ اخلاق پر مبنی جدید معاشرے، جدید معیشت اور جدید تقاضوں سے بھرپور نظام ہائے حیات کو اپنے ہاں رواج دیں اور خود افروزی کی تحریک اور اقدار کو متعارف کروانے کی ہر ممکن سعی کریں۔ مغربی دنیا مسلمانوں کی جہالت، جذباتیت اور ظاہر پرستی سے پوری طرح باخبر ہے اگر بے خبر ہے تو فرد مسلم اُمہ!

اس کتاب پر ڈاکٹر احمد کا مقدمہ۔ مشرق ومغرب کے دربست فکری تصادم پر بڑا خیال افروز اور تفصیل تبصرہ ہے۔

اٹھو وگرنہ حشر یہ ہوگا نہ پھر کہیں

دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

میں برادرم اطہر رضوی کو دل کی تہوں سے اس فکر انگیز اور خیال افروز تصنیف پر مبارک پیش کرتا ہوں۔

آفریں باد کہ میں ہمت مردانہ انس

—oooOooo—

بلکینیا سے بازنیا تک

اطہر رضوی کی ایک نادر تصنیف

شاہین، اوٹاوا، کناڈا

۳۳۵ صفحات پر مشتمل زیر تبصرہ کتاب موضوعاتی اعتبار سے اردو میں لکھی گئی ایک نادر تصنیف ہے۔ مصنف نے بیسویں صدی کی آخری دہائی میں بپا ہونے والی ایک قیامتِ صغریٰ کا نہ صرف تحریری طور پر احاطہ کیا ہے بلکہ تاریخ اور واقعات کے حوالے سے حالات کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ اس تجزیے میں ذاتی تجسس اور مشاہدے کو بڑا دخل ہے۔ اطہر رضوی کے پاؤں میں ہی چکر نہیں ان کی آنکھوں کی پتلیاں بھی مستقل گردش میں رہتی ہیں۔ نتیجے کے طور پر ان کی تحقیق میں ایک انفرادی زاویۂ نظر ان کی شناخت بن کر سامنے آتا ہے۔

سیاست، مذہب، اور قومیت نے روزِ ازل سے تاریخ کو مسخ کیا ہے۔ چنانچہ اصل سچائی کا سراغ کم ہی مل پاتا ہے۔ ہاں کہانیوں کے سے تانے بانے اس متن کو جنم دیتے ہیں جنہیں ہم درسی نصابوں میں تاریخ جان کر پڑھتے ہیں۔

اطہر رضوی رقم طراز ہیں:

"بلکینیا کی نفرتوں میں علامتیں اور مفروضات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ حقیقتوں کو مداخلت کرنے کی یہاں قطعی اجازت نہیں ہے۔"

بازنیا کے سانحے کی خبریں ایک عرصے تک اخبارات کی شہ سرخیوں کا حصہ بنی رہیں۔ ظلم اور بربریت کا کون سا اسفل ترین کرتوت تھا جس کا وہاں مظاہرہ نہیں ہوا۔ بچوں کے قتل

کے بعد ان کے سروں کو گیند کی طرح استعمال کیا گیا۔ بدفعلی، زناکاری، اور انسانی رشتوں کی تکذیب اور توہین کے ایسے واقعات رونما ہوئے جنہیں سن کر اب بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اطہر رضوی نے ایسے ناقابل بیان جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کی ذہنیت کا پردہ چاک کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بعض پردے کے پیچھے رہنے والوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے جن تک عام ذہن کی بآسانی رسائی نہیں ہوتی۔ اس حمام میں کیسے کیسے ننگے موجود ہیں!

مسلمانوں کے ہاتھوں ۱۴۵۳ء میں فتح قسطنطنیہ کی اہمیت وہی تھی جو ۱۱۸۷ء میں فتح یروشلم کی تھی۔ مغربی حکمراں طبقوں کے ذہن اور تخیل پر یہ اور دوسری فتوحات آسیب کی طرح چھائی رہیں۔ بحیرہ روم میں عثمانیہ فتوحات کا سلسلہ (جنگ لیانتو میں) ۱۵۷۱ء کی شکست کے بعد رک گیا۔ لیکن خشکی کے راستوں کے ذریعے ترکوں کی مہم بازی میں کافی عرصے تک کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی۔ البانیہ، بلغراد، اور روڈز (Rhodes) پر تسلط پانے کے بعد ۱۵۲۶ء میں ترک فوجوں نے ہنگری کو شکست فاش دی۔ یہ معرکہ سلطان سلیمان اول اور ہنگاروی بادشاہ لوئی کے درمیان پیش آیا۔ دو گھنٹے کے اندر لوئی اپنے امراء سمیت مارا گیا۔ سلطان سلیمان نے مقتول بادشاہ کی لاش کی تلاش کرنے کا حکم دیا۔ لاش کو دیکھ کر سلطان نے آبدیدہ ہو کر کہا "اللہ اس پر رحم کرے اور ان لوگوں کو سزا دے جنہوں نے اس کی ناتجربہ کاری کی وجہ سے اس کو گمراہ کیا۔ میں بے شک اس سے لڑنے آیا لیکن میرا مدعا یہ نہ تھا کہ وہ دنیوی اور شاہی لذتوں سے محروم ہو کر اس طرح دنیا سے رخصت ہو جائے۔" یہ وہ سال ہے جب بابر نے پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی کو ہرا کر ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کی داغ بیل ڈالی تھی۔ بابر اور تیمور لنگ کا سلسلہ قپچاق ترک اور چنگیزی منگولوں سے جا ملتا ہے۔ 'تزک بابری' میں ایک جگہ بابر رقم طراز ہے کہ "اگر مغل فرشتے بھی ہوں تب بھی وہ برے ہی رہیں گے۔ نیز یہ کہ اگر مغل کا نام سونے کے حروف میں لکھا جائے تب بھی مغل نام برا ہی رہے گا۔"

آسٹریا پر ترکوں نے تابڑ توڑ حملے کیے لیکن وہاں انہیں منہ کی کھانی پڑی۔ ۱۶۸۳ء میں

پولینڈ کے بادشاہ جان سوبسکی نے بھی ترکوں کو شکست دے دی۔

ایک طرح سے دیکھا جائے تو بلقان اور وسطی یورپ میں ترکوں کی آمد عیسائیوں کی صلیبی جنگ کے خلاف ایک جوابی کاروائی تھی۔ انیسویں صدی کے آخر تک بلقانی ریاستوں کے تمام مسلمانوں کو ترک کہا جاتا تھا۔ بلقان کی چار سلاویائی جماعتیں بلغاریوں، سربوں کروشینوں، اور سلوینیوں پر مشتمل ہیں۔ دراصل حالیہ نام نہاد ''جنگِ آزادی'' اشتراکیت کی پسپائی کے تناظر میں ترک آبادی کے خلاف تھی تاکہ یورپ میں مسلمانوں کے وجود کا خاتمہ ہو جائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ترکوں نے مختلف اوقات میں اندلس کے نکالے ہوئے یہودیوں، روس کے اشکنازیوں، اور یورپ میں بستی بستی پھرنے والے ہندی الاصل خانہ بدوشوں کو اپنے ہاں پناہ دی۔ ۱۴۹۲ء میں اندلسی یہودی ہسپانوی عیسائیوں کے عتاب سے بچنے کے لیے عیسائی بن گئے تھے۔ لیکن مملکت عثمانیہ پہنچتے ہی انہوں نے عیسائی مذہب کو خیر باد کہا۔ دھیرے دھیرے یہودیوں نے سلطنت کے امور میں اثر و رسوخ حاصل کیا اور بڑی ترقی کی۔ دوسری طرف عیسائیوں کے مختلف فرقے آپس میں دست و گریباں رہا کرتے تھے۔ اُن کی باہمی عداوت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ وہ اپنے ہم مذہبوں کے خلاف مسلمانوں کی مدد طلب کرتے۔ لیکن ترکوں کی رواداری سب سے یکساں تھی جو بعد میں انہیں بہت مہنگی پڑی۔ امتیاز محمد خاں ترکوں سے متعلق اپنے سلسلہ مضامین میں لکھتے ہیں کہ ''جس زمانے میں عثمانی درہ دانیال اور باسفورس کو پار کر کے سرزمین یورپ میں پہنچے اس زمانے میں اہل مغرب صلیبی جنگوں میں پٹ پٹا کر ناکام واپس ہو چکے تھے اور مغربی عیسائیوں میں وہ صلیبی ذہنیت قائم ہو چکی تھی جس کی رو سے مسلمان اور اُن کا مذہب دنیا کا بدترین مذہب سمجھا جاتا تھا۔'' ترکوں کی رواداری کے سبب اُن کے زیرِ اثر خطے میں اتنے سارے دھارے ایک ساتھ آن ملے کہ سیاسی طور پر اُن کی یکجائی نے نئی حقیقتوں کو جنم دیا۔ وہ حقیقتیں جو بعد میں وحشت اور بربریت کا روپ اختیار کر گئیں۔

اطہر رضوی نے معتبر حوالوں کو بنیاد بنا کر اعداد و شمار کی روشنی میں جو معلومات فراہم کی ہیں اور جتنے نتائج اخذ کیے ہیں وہ اُن کے تدبر و دروں بینی کا اشاریہ ہیں۔ یہ کتاب ایک کارنامہ ہے۔ تاریخ میرا موضوع نہیں اور نہ اس ضمن میں میرا ذاتی مطالعہ اتنا ہے کہ تاریخ کی موشگافیوں میں الجھ سکوں۔ لیکن شاید اطہر رضوی نے یہ کتاب مجھ جیسے عامیوں کے لیے ہی لکھی ہے۔

کاش کہ اس خوبصورت کتاب میں حروف سازی کی غلطیاں نہ ہوتیں۔ مثلاً صفحہ ۱۳۴ پر عہد عثمانی کے کیلنڈر کا عکس دیا گیا ہے جس کے نیچے "۲۱ ربیع الآخر ۱۳۹۹ھ" کی تاریخ درج ہے۔ اس حساب سے یہ کیلنڈر تین دہائیوں سے بھی کم پرانا ہے جو درست نہیں۔

میں اطہر رضوی کو ان کی قابل قدر تازہ تصنیف پر تہ دل سے مبارک پیش کرتا ہوں۔

بلکینیا سے بازنیا تک

اطہر رضوی کی دستاویزی تصنیف

عتیق جیلانی سالک، رامپور، انڈیا

قوموں کے عروج زوال کی خوں چکاں داستانیں نہایت عبرت انگیز ہیں۔ جب عرب کے ریگ زاروں سے بادہ وحدانیت ورسالت کے متوالے اٹھے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ایشیا افریقہ یورپ کے براعظموں پر چھا گئے۔ اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ ایک دن ان کی حرماں نصیبی کا ایسا بھی آئے گا جب وہ گم نامی اور قعر مذلت میں کھو جائیں گے بلکہ زیادہ تر روس امریکہ اور اسرائیل کے ایجنٹ بن جائیں گے۔ اس سے زیادہ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ مورخ کا قلم حق وصداقت ور انصاف کے بجائے ظلم و ناانصافی کی حمایت کرنے لگے۔ کنیڈا کے مشہور ادیب اور مورخ اطہر رضوی نے تاریخ کے اس جبر کو محسوس کیا۔ اور ان کی تازہ تصنیف، ''بلکینیا سے بازنیا تک'' منظر عام پر آئی۔ خوش قسمتی سے انھیں بیشتر مقامی عصری اخبارات اور بنیادی ماخذات تک رسائی حاصل ہوئی تھی۔ بچشم خود متعلقہ حوادثات کا معائنہ و مشاہدہ کرنے کے مواقع بھی حاصل ہوئے جس کی وجہ سے اس کی ایک تاریخی و دستاویزی حیثیت ہے۔ اطہر رضوی کی یہ تالیف دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں ریاست بلقان کا تاریخی وتہذیبی مطالعہ کیا گیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ ابتدائی تواریخ میں یہ علاقہ یونانی، رومی و بازنطینی بادشاہوں کی ہوس ملک گیری اور ایک دوسرے کو اپنا محکوم بنانے کی کہانیوں کے لیے مشہور ہے۔ ان میں یونان کے آگسٹس اور جرمنی کے گاتھ وغیرہ کے ساتھ ہی منگولیا کے ہنس

قبیلہ کا سردار جو "خان" کہلاتا تھا اور اسے قتل غارت کی وجہ سے قزاق "خدا کا عذاب" سمجھا گیا بھی شامل ہے۔ لیکن یہی قوم جب مسلمان ہوئی تو اس نے اپنی قہر سامانیوں کو کم سے کم کرلیا بلکہ قلب ماہیت کا ایک اور نمونہ پیش کیا۔ منگول اور یونانی و ترکی اقوام کے اشتراک سے جو نئی قوم تاریخ کے سینے پر ابھری اس کی حکایت لذیذ آج بھی ایک معمہ بنی ہوئی ہے۔ یہ قوم چوں کہ مسلمان تھی اور اس کا دبدبہ ایشیا و یورپ اور افریقہ پر بھی قائم تھا۔ اس لیے تاریخ کے ہر دور میں معاندین اسلام اس کے خلاف سازشیں کرتے رہے۔ خصوصاً ترکوں کے خلاف بازنطینی، یونانی، بلکیری، سلادوی قومیں ایک دوسرے سے مل کر حملے کرتی رہیں لیکن عثمان خاں اور اس کے لائق فرزند ارخان نے حکومت کی بنیاد کچھ ایسی ساعتِ سعید میں رکھی تھی کہ تمام دنیا لرزہ براندام رہتی تھی۔ مگر جہاں خوبیاں ہوتی ہیں وہیں کمیاں بھی رہ جاتی ہیں۔ ارخان نے حکومت میں غلاموں کی ایک فوج تیار کی تھی۔ یہ فوجی ٹولہ آگے چل کر اتنا طاقت ور ہوگیا کہ سلطنت کا نظم و نسق ان کی مرضی سے چلنے لگا۔ اور جب اس ٹولے کے نظریات اسلام دشمن ہو گئے تو اس نے اسلام کے نام لیواؤں کو شدید نقصان پہنچایا۔

ترکی سلاطین میں سلطان بایزید کی شخصیت بھی متنازعہ رہی۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کے منگولوں سے پے در پے شکستوں نے ترکی سلطنت میں اضمحلال پیدا کردیا بعد میں سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ کی فتح کے ذریعہ تلافی کی۔ سلطان سلیم اور سلطان سلیمان نے ترکوں کی ہیبت تمام دنیا پر قائم رکھی پھر سلیم دوم کے زمانے میں زوال شروع ہوگیا۔ اور سلطان عبدالمجید کا جانشین عبدالعزیز بالکل ہی نااہل حکمراں ثابت ہوا۔ جس کی وجہ سے اہل یورپ کو نئی سازشوں اور مسلمانوں کو لڑانے کا موقع مل گیا۔ انھوں نے ترک مقبوضات میں شامل عرب ریاستوں کو بغاوت کے لیے اکسایا۔ عربوں کی بغاوت کے نتیجے میں ترکوں کی رہی سہی عزت بھی جاتی رہی۔

دوسری جانب ترکی میں عربوں کے خلاف نفرت کا جذبہ ابھرنے لگا۔ اور ترک سپاہی

انور بیگ مصطفیٰ کمال پاشانے عربی ثقافت کو اپنی بربادی کا سبب قرار دیتے ہوئے عربی خلافت کی نشانی سلطان کو معزول کر دیا اور ایک مغرب پرست حکومت قائم کی جس میں حسب سابق غلام سپاہیوں کی مرضی کے بغیر کوئی کام انجام پذیر نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی لیے اسلام پسند جمہوری طریقوں سے برسر اقتدار آجائیں تب بھی ترکی میں حکومت نہیں چلا سکتے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ روس سے آزاد اسلامی ریاستوں میں ترکی نژاد مسلمانوں پر روس اور یوگوسلاویہ سربوں کے ساتھ مل کر جو قیامت صغریٰ برپا کرتے ہیں اس پر بھی ترکی حکمراں بے حسی میں ڈوبے رہتے ہیں۔

بلقان— جسے فاضل مصنف (اطہر رضوی) نے بلکینیا لکھا ہے۔ وہاں سرب درندوں نے مسلمانوں کی نسل کشی کر کے پورے پورے صوبوں سے مسلم آبادیاں خالی کر دیں۔ یورپ وامریکہ ایشیا وافریقہ کے کروڑوں اربوں غیر مسلم تو خاموش رہے خود نام نہاد مسلم امیر زادے اور ننگ قوم عرب بادشاہ بھی چپ رہے۔،

"بلکینیا سے بازنیا تک" (کے دوسرے حصہ) میں مسلمانوں کی نسل کشی کی روداد پیش کی گئی ہے۔ اور ان لوگوں کی بے حسی کی وجوہات کا تجزیہ کیا گیا ہے کہ جو دنیا میں امن انصاف اور حق گوئی کے نام نہاد علم بردار بھی بنے ہوئے ہیں اور جن کی وجہ سے ظلم و ناانصافی کا بول بالا ہو رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر آسٹریا ہنگری اور سلطنت عثمانیہ نیست و نابود ہو گئیں۔ ایشیائے کوچک کا وہ عظیم علاقہ جو اسلامی ترکستان کہلاتا تھا اس کی جگہ یوگوسلاویہ کی حکومت پیدا ہوئی۔ جس کے صدر اتفاق رائے سے ٹیٹو چنے گئے۔ ان کا رویہ کسی قدر منصفانہ تھا۔ مگر ۱۹۸۰ء میں ان کے انتقال کے بعد حالات بے قابو ہو گئے۔ اور سلابودن ملوشے ودچ جیسا خون خوار درندہ برسر اقتدار آیا۔ ایک اور سرب درندہ راد دین کراجک وکروشی لیڈر فرانیوتج من بھی بنیاد پرست انسانی نما وحشی اٹھے اور مسلم آبادیوں کو خاک وخون میں تبدیل کرنے لگے۔ مسلمانوں نے عالیہ عزت بیگووچ کی قیادت میں آزادی

کی تحریک شروع کی۔ لیکن نسل کشی اور سفاکی پر کوئی روک نہ لگا سکے۔ اطہر رضوی نے سرایو (سرے یو) میں ہالی ڈے کے ایک ہوٹل میں نسل کشی کی ان دستاویزات کا گہرا مطالعہ کیا اور یہ رائے قائم کی کہ مسلم نسل کشی ترکوں کی راسخ العقیدگی کی وجہ سے نہیں تھی۔ بلکہ محض سربوں کی جنگ جویانہ نفرت آمیز قوم پرستی کا نتیجہ تھی۔ چنانچہ انھوں نے کروشیوں کو بھی اپنی بہمیت کا نشانہ بنایا تھا۔

بلاشبہ اطہر رضوی نے ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھایا ہے جس کے بارے میں عام طور پر لوگ کچھ نہیں جانتے۔ حالاں کہ اسلامی ترکستان اور اس کے آس پاس کے علاقوں کی تاریخ کا ہندستان کی مسلم تہذیب وتمدن سے گہرا تعلق رہا ہے، راقم السطور کا یہ بھی خیال ہے کہ بلقان ریاستوں سے مسلم ثقافت ساری دنیا میں پھیلی ہے۔ امام بخاری امام ابوحنیفہ ان ہی علاقوں کے رہنے والے تھے۔ عام طور پر لوگ ہندوستان میں فارسی اثرات ایران کی دین سمجھتے ہیں۔ یہ فارسی اثرات مغلوں اور ترکوں کی معرفت ہندوستان میں آئے ہیں۔ چوں کہ مذکورہ مسئلہ مصنف کے موضوع سے متعلق نہیں تھا اس لیے مصنف نے اسے اجاگر نہیں کیا۔ "بلگیریا سے بازنیا تک" کا مطالعہ تاریخ سے دل چسپی رکھنے والوں اور خصوصاً ادب کے سنجیدہ طالب علموں کے لیے نہایت قیمتی اور کارآمد ثابت ہوگی۔

بلکینیا سے بازنیا تک

ادیب سہیل، کراچی

"بلکینیا سے بازنیا تک" تاریخ بھی ہے روداد سفر بھی ہے، اور سیاحت نامے کا لطف بھی رکھتی ہے۔ اس کے تاریخی پس منظر میں ماضی بعید اور ماضی قریب کی تفصیلات ہیں اور اس میں 'بلکینیا سے بازنیا تک' کے علاقہ جات کے حال کا منظر نامہ بھی ہے۔ بازنیا (بوسنیا) کے تنازع کو سمجھنے کے لیے اطہر رضوی صاحب نے اس قدیم دیار کا بہ نفس نفیس سفر کیا، وہاں کئی روز مقیم رہے اور بہ نظر غائر وہاں کی بربادی کا نظارہ کیا وہاں کے لوگوں سے ملے اور وہاں کے عالموں سے تبادلہ خیال کیا اور پھر اپنے تصورات و تاثرات کی ایک متوازن صورت کتاب مذکور میں پیش کر دی۔ کتاب ایسی دلچسپ ہے کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

اطہر رضوی صاحب نے "بلکینیا سے بازنیا تک" کے علاقہ جات کا چشم دید منظر اس بصیرت سے رقم کیا ہے کہ اس سے ان کے نقطہ نظر کی آفاقیت سامنے آگئی ہے۔ تقریباً 600 سالہ سلطنت عثمانیہ کا دبدبہ، اس دبدبے کے مثبت و منفی اثرات ہٹلر کی نسل کشی تیمور کی غارت گری، اور آخر میں بلقان کا مصائب (Butcher of Balkan) سلوبودن ملوشے وچ جس نے ۱۹۹۲ء میں بازنیا میں نسلی صفایا اور تاراجی کا حکم دیا۔ (حال ہی میں جرائم کے عالمی کورٹ نے اسے ۴۶ سال کی قید کی سزا سنائی ہے)۔

بازنیا (Bosnia) کے سلسلے میں "بازنیا کیوں؟" میں اطہر رضوی صاحب نے بڑی تفصیل سے وہاں کے کوائف کا احاطہ کیا ہے جس میں بوسنیا کے مسلمانوں کی نسل کشی کے لیے ملوشے وچ ٹولے کے ہاتھوں، ہزاروں کی تعداد میں بے یار و مددگار مسلمانوں کا قتل اور انھیں اجتماعی قبر میں دفن کرنے کا ذکر کیا ہے اسی کے ساتھ کتاب کے صفحات میں بوسنیا کے

مسلمانوں کے آڑے وقت میں حکومت پاکستان کے آگے آنے اور انھیں پاکستان کی طرف سے ہر طرح کی امداد پہنچانے کی تفصیل اور امداد کے اعداد و شمار بھی دیے گئے ہیں۔

یہاں بوسنیا کے مسلمانوں کی نسل کشی کے سلسلے میں ڈاکٹر انیس کارک (Enes Karic) کا یہ اقتباس رقم کر دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ اس سے نسل کشی کے اسباب سامنے آتے ہیں۔

The only Crime of the Bosnian Muslim is Islam. They embraced Islam than five hundred years ago and they are attempting to remain muslims in the midst of Europe.

The Bosnian Muslims have Committed another Crime: They do not recognize Europe as a Continent reserved only for Christianity.

اطہر رضوی کا تعارف کراتے ہوئے جناب حمایت علی شاعر نے لکھا ہے:

''شاعر اور ادیب ہماری گم شدہ تاریخ کا محقق جسے کینیڈا نے اپنا لیا اپنی تازہ تحریر کے راستے سے پھر ہمارے درمیان آ گیا ہے اور ایسی ایسی کتابیں لکھ رہا ہے کہ بے ساختہ غالب یہ مصرع یاد آ جاتا ہے۔

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو

اطہر رضوی میدان شعر و ادب کے آزمودہ کھلاڑی ہیں وہ اگرچہ ایک طویل عرصے سے کینیڈا اور یورپ میں مقیم ہیں لیکن ادب و شعر کے حوالے سے کہیں چین سے نہیں بیٹھے۔ قلم تو چلتا ہی رہا قلم کاری سے نکل کر بڑے بڑے بین الاقوامی مشاعرے کرائے جوشؔ، غالبؔ اور میرؔ پر سیمینار کیا برصغیر پاک و ہند کے مشاہیر ادیب اور شعرا کے کینیڈا میں یکجا ہونے کی سبیل پیدا کی اور بقول کسے کہ وہ آج بھی تازہ دم اور ان تھک ہیں!

———oooOooo———

خدا کے منتخب بندے

شان الحق حقی

جناب اطہر رضوی ٹورانٹو میں ایک قطب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا مسکن جو'ایوان غالب' کے نام سے جانا جاتا ہے، شائقین ادب کی زیارت گاہ ہے، ادیبوں اور یادگار ادبی تقریبات کی تصاویر اور کتب ودستاویزات سے سجا ہوا، جہاں باقاعدگی سے غالب کی طرحوں میں مشاعرے منعقد ہوتے رہے ہیں اور ان کے گلدستے چھپتے رہے ہیں۔

مگر اطہر صاحب کا اصل رجحان اسکالرشپ کی طرف ہے۔ انہوں نے دنیا کے بہت سے ممالک کے دورے کیے ہیں اور یہ سیاحت صرف سیروتماشے کے لیے نہ تھی۔ مطالعے اور مشاہدے کے لیے تھی۔ جو موضوعات ان کے مدنظر تھے ان کی بابت ذاتی طور پر معلومات اور حقائق کو دریافت کرنے کی دھن۔ اس کے نتیجے میں کئی پراز معلومات کتابیں ان کے قلم سے نکل چکی ہیں۔ ان میں ''خدا کے منتخب بندے'' ایک تازہ اضافہ ہے۔ انہوں نے قوم یہود کے تاریخی پس منظر کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ، صیہونیت کے آغاز وفروغ اور اس کے عبرت انگیز نتائج کا مورخانہ جائزہ لینے کا بیڑا اٹھایا تھا اور بقدر امکان اس کا حق ادا کرنے کی سعی کی ہے۔ یہ تاریخ انسانی کا ایک ناقابل فراموش باب ہے جس پر اردو میں کم ہی کچھ لکھا گیا ہے۔ اطہر صاحب نے جہاں تک ان کی رسائی تھی مآخذ کی فراہمی میں کسر نہ کی۔ اس لحاظ سے یہ کتاب بہت سے لٹریچر کا خلاصہ کہی جاسکتی ہے جو اردو میں ناپید تھا۔ ان کا مقصد اور شعوری موقف یہی تھا کہ مورخانہ خلوص نظر سے کام لیا جائے۔ لیکن وہ پکے مسلمان بھی ہیں اور ان کی

یہ حیثیت بھی اول سے آخر تک نمایاں رہتی ہے۔ بہر حال جہاں تک صیہونیت کے رویے اور ریشہ دوانیوں کا تعلق ہے، حقائق منہ سے بولتے ہیں جنہیں اطہر صاحب نے صفائی سے بیان کر دیا ہے۔ اس میں ان کی اسلامی دردمندی بھی شامل ہے تو محل تعجب نہیں۔ بعض منصف مزاج یہودی بھی صیہونی عصبیت اور اسرائیلی جارحیت سے نالاں رہے ہیں، جن کا ذکر اطہر صاحب نے کیا ہے۔ ان میں چومسکی کے نسبتاً تازہ بیانات کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ میں خود ایسے یہودیوں سے ملا ہوں جو صیہونیت سے بیزاری کا اظہار کرتے تھے۔

یہاں یہ عرض کر دوں کہ اصل عربی لفظ صہ یونیت ہے نہ کی صیہونیت، یہ اس پہاڑی کے نام سے منسوب ہے جس پر معبد سلیمانی تعمیر کیا گیا تھا۔

قرآن میں اللہ تعالی نے بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے کہا تھا انی فضلت کم علی العالمین۔ وہ قول اس دور میں صادق آرہا ہے۔ اس تمام روداد کے نتیجے میں ایک بات ٹھنڈے دل سے غور طلب ہے وہ ایک مدت دراز تک معرض مذلت میں رہنے کے بعد یہود نے دور جدید میں یہ عروج کیوں کر حاصل کیا۔ یہ عین وہ زمانہ ہے جب یہود نے علوم عقلی کو اپنایا اور ہم نے ان سے اجتناب روا رکھا۔ ہزار برس سے مسلمانوں نے انسانی علم میں کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔ دین کے محافظوں نے علوم عقلی کی بیخ کنی میں کسر نہ کی۔ دوسری طرف خود دین کو ایک بت بنا کر رکھ دیا۔ افزائش و نمو لازمہ زندگی ہے۔ جس شریعت میں ذرا بھی لچک نہ ہو ائمہ ماسبق کے ہزار سال پرانے اقوال سے یک سر مو تجاوز کی گنجائش نہ ہو، وہ بت نہیں تو کیا ہے۔ ائمہ کے قول کو قرآن کے برابر درجہ دینا شرک کے ذیل میں آتا ہے، مگر ہم اکیسویں صدی کے مسائل کا حل آج بھی ماضی میں تلاش کرتے ہیں کہ کوئی سند ہے یا نہیں۔ قانون سازی ایک مستقل انسانی ضرورت ہے۔ قدم قدم پر نیا قانون بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ قانون ساز ادارے اسی لیے قائم ہیں۔ اور صد ہا قسم کے قانونی ضابطے رائج ہیں۔ اسلامی دنیا کو ایک نفسیاتی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ دین بنیادی طور پر ہمارے مابعد الطبیعاتی مسئلے کو حل کرتا ہے۔ جہاں تک

دوسرے امور کا تعلق ہے قرآن میں تقریباً سات سو بار علم، عقل، فہم شعور، تدبر، تفکر کا نام لیا گیا ہے۔ ان کو نظر انداز کر کے لکیر کی فقیری سے اس روز بروز بدلتی ہوئی دنیا میں کیا کام چل سکتا ہے۔

دوسری طرف یہود کے عزم و ہمت کو دیکھئے کہ ایک مردہ زبان کو زندہ کر دکھایا۔ آج ان کے سارے کام عبرانی میں چل رہے ہیں۔ ہمیں آج تک نہ خود پر بھروسا ہے نہ اپنی زبان پر حالاں کہ یہ ایک زندہ اور آزمودہ زبان ہے۔

تاہم اردو سے محبت اور اس کے ساتھ علم سے لگاؤ رکھنے والی مبارک ہستیاں اردو کے علمی سرمائے میں برابر اضافہ کر رہی ہیں جس کی ایک روشن مثال اطہر رضوی صاحب کی گرانقدر تالیفات ہیں۔

ایک نئی دیوارِ گریہ

امجد اسلام امجد، لاہور
پاکستان

صیہونیت (Zionism) کی بنیاد اس مفروضے پر رکھی گئی ہے کہ یہودی خدا کے منتخب بندے ہیں۔ اور یوں انہیں باقی کی خلق خدا پر ایک ایسی فوقیت حاصل ہے جس کا فیصلہ عرشوں پر ہو چکا ہے اور یہ کہ ان کی اس فضیلت کی گواہی تمام آسمانی کتابوں میں موجود ہے، نسلی برتری کا یہ خناس انسانی تاریخ میں نیا نہیں، کبھی یہ آریاؤں کے اس تفاخر کی شکل میں ظاہر ہوا جس نے ہندوستان کے قدیم اور مقامی باشندوں کو "شودر" بنا ڈالا اور کبھی Blue Blood کے اس عظیم خبط کی صورت میں جس کی ایک نمایاں مثال انگلستان کے سٹورٹ بادشاہوں کا Divine right of the kings تھا۔ ماضی قریب میں جنوبی افریقہ کی نسلی تفریق پر مبنی پالیسی Apartheid بھی اسی البم کی ایک تصویر ہے۔

اطہر رضوی صاحب نے بہت محنت تحقیق اور عالمانہ غیر جانبداری سے یہودی قوم کے اس فلسفے کی کارفرمائیوں کا احوال لکھا ہے اور تاریخی پس منظر کے ساتھ ساتھ دور حاضر کے تناظر میں بھی بعض ایسے حقائق سے پردہ اٹھایا ہے جن کی طرف اشارہ کرنا بھی ایک طرح سے سانپ کے بل میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے۔

اس میں شک نہیں کہ گذشتہ دو ہزار برس میں دنیا کے ہر حصے اور تاریخ کے ہر دور میں یہودیوں کو بے گھری، بے دخلی اور مسلسل مہاجرت کا سامنا کرنا پڑا ہے اور یہ بھی ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ گذشتہ تقریباً دو سو برس میں دنیا میں ہونے والی علوم وفنون سائنس،

معاشیات اور تحقیق کی ترقی میں یہودیوں کا حصہ سب سے زیادہ اور اہم ہے۔ اور بلاشبہ اس قوم نے بے شمار ایسے افراد پیدا کیے ہیں جنھیں تاریخ ساز انسانوں کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ مگر ان اچھے اور نیک انسانوں کی اس انسانی خدمت اور اپنی صدیوں سے پھیلی ہوئی بے گھری (جس کے اصل ذمہ دار بھی وہ خود ہیں) کا جو تاوان بیسویں صدی کے آخری پچاس برسوں میں انہوں نے دنیا سے بالعموم اور فلسطینیوں سے بالخصوص لیا ہے اس کی بہمیت انسان کشی اور بربریت نے ان کی تاریخ کے اگلے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ دیئے ہیں اور ان تمام بڑے آدمیوں کی روحوں کو شرمندہ کر دیا ہے جو ان میں سے ہوتے ہوئے بھی تمام عالم انسان کے لیے سوچتے تھے۔

جہاں تک یہودی قوم کی اجتماعی صلاحیت کا تعلق ہے تو ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ انیسویں صدی میں واقعی اس قوم کے لوگوں نے غیر معمولی کارنامے انجام دیئے ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اس کی وجہ ان کا ''خدا کے منتخب بندے'' ہونے کے ناطے سے کچھ خصوصی صلاحیتوں کا پیدائشی طور پر حامل ہونا ہے یا یہ کہ جینیات Genetics کے حوالے سے ان میں کچھ غیر معمولی خواص پائے جاتے ہیں۔ (جس کا شبہ مشہور مورخ ٹائن بی کی کچھ تحریروں میں بھی پایا جاتا ہے) تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان دو صدیوں کو نکال کر گذشتہ دو ہزار سال میں ان کی مجموعی کارکردگی کیا ہے ــــ؟ اور تاریخ عالم میں ان کی اس ''فطری برتری'' کا کوئی واضح ثبوت ملتا ہے یا نہیں ــــ؟

مشہور فلسفی ژاں پال سارترے نے دوسری جنگ عظیم کے دوران ہٹلر کی طرف سے یہودیوں پر ڈھائے گئے مظالم کو ان کے لیے ''نعمت'' قرار دیا ہے یعنی آج یہودی قوم اور اسرائیل جس غیر معمولی قوت کے حامل ہیں اس کا ٹیک آف پوائنٹ وہی جرمن کیمپ بنے، جو بظاہر ان کا مقتل تھے اسی تخریب کے ردعمل، بازگشت اور پروپیگنڈے کی آڑ میں میڈیا کی ابھرتی اور بڑھتی ہوئی طاقت کی مدد سے یہودی لابی نے دنیا بھر میں اپنی مظلومیت کا ایسا

ڈھنڈورا پیٹا اور یورپی ذہن کو ایسی دفاعی اور معذرت خواہانہ پوزیشن میں لا کھڑا کیا کہ وہ لوگ نہ صرف ان کی چیرہ دستیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں بلکہ ہر عالمی پلیٹ فارم پر اسرائیل کے شانہ بشانہ کھڑے ہو کر اس کی دامے، درمے، قدمے، سخنے مکمل مدد اور حمایت بھی کرتے چلے آرہے ہیں۔

یہودی لابی کی کاروائیوں، طریقہ کار اور امریکی حکومت پر گرفت کے حوالے سے اطہر رضوی صاحب نے بڑے اہم، خیال انگیز اور مبنی بر حقائق دلائل و شواہد کے ساتھ ایسی مثالیں پیش کی ہیں جنہیں یہودی میڈیا اور اپنی تمام تر قوت کے باوجود نہیں دبا سکا۔ خود یہودی کمیونٹی کے اندر اہل نظر صاحب دل اور انصاف پسند لوگوں کا ایک گروہ ایسا ہے جو شروع سے اپنی قوم کی ان انسان کش پالیسیوں کے خلاف کھل کر رد عمل کا اظہار کرتا رہا ہے۔ اور آج بھی اسرائیل کے اندر اپنی حکومت کی ان توسیع پسندانہ اور ظالمانہ کاروائیوں کے خلاف احتجاج کی ایک طاقت ور لہر موجود ہے جو شیرون کو "بیروت کا قصائی" اور بیگن اور اس کے ہمنواؤں کو یہودی قوم کے لیے رسوائی کا داغ سمجھتے اور کہتے ہیں۔

اطہر رضوی صاحب کی اس کتاب کے مطالعے سے جہاں ہمیں ان بہت سے حقائق کا علم ہوتا ہے جن کی بنیاد پر یہودی اس وقت ایک بہت محدود اقلیت ہونے کے باوجود دنیا پر چھائے ہوئے ہیں اور اسرائیل ایک چھوٹا سا ملک ہونے کے باوجود عسکری صلاحیت کے حوالے سے دنیا کے پہلے دس ملکوں میں شمار ہوتا ہے بلکہ اسرائیل کے قیام، اس کے پس منظر اور اس عالمی سازش کی تفصیلات کا بھی پتہ چلتا ہے جس کے نتیجہ میں اس کے نزدیکی ہمسایوں، عرب ممالک اور مسلمان برادری کے ملکوں کو ایسے وسائل میں مبتلا کیا گیا ہے کہ وہ اپنے اندرونی تضادات اور علاقائی معاملات میں ہی الجھے رہیں اور یوں مل بیٹھ کر اس خطرے کے سد باب کے لیے کوئی مشترکہ کاروائی نہ کر سکیں جو ان کے دروازوں پر دستک دے رہا ہے اور جس کا ایک درس عبرت اپنے ہی وطن کی زمین سے فلسطینی عوام کی جلا وطنی، بے کسی اور در

بدری ہے جو ان کی اپنی شدت اور پھیلاؤ میں یہودیوں پر ٹوٹنے والے ان مصائب سے کہیں زیادہ ہے۔ جن کی آڑ لے کر گزشتہ نصف صدی سے ساری دنیا کو بلیک میل کیا جا رہا ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے مابین جاری تاریخی جھگڑے Anti Semitism کو کس مہارت اور چالاکی سے ایک استحصالی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اور مغرب کے لبرل اور آزاد ذہن کو ایک مخصوص پروپیگنڈے کے تحت اتنا مفلوج کر دیا گیا ہے کہ صابرہ اور شتیلا کیمپوں کا قتل عام تو اقوام متحدہ کی قرار دادوں کی فوٹو کاپیوں میں بے معنی لفظوں کا ایک مجموعہ بن کر رہ جاتا ہے اور قاتلوں کو عالمی امن کے ٹھیکیدار امریکہ کا صدر ریگن ہار پہنانے اور مبارک باد دینے کے لیے خود چل کر اس مقتل میں جاتا ہے جہاں چاروں طرف بے گناہ مقتولوں کی چیخیں در بدر پھر رہی ہیں اور پھر اس کی بالواسطہ تائید پوپ سے بھی حاصل کر لی جاتی ہے۔ اور ساری یورپی دنیا امریکہ کی سر براہی میں اسرائیلی حکومت اور سیاست پر قابض قاتلوں کے اس گروہ کی مدد اور حمایت کے لیے اس طرح صف آرا ہو جاتی ہے جیسے یہ لوگ کوئی بہت نیک کام کر رہے ہوں اور دوسری طرف یہی لوگ بنیاد پرستی اور دہشت گردی کے عجیب وغریب الزامات عائد کر کے پوری مسلمان دنیا سے اپنی مرضی سے زندہ رہنے کا حق چھیننے پر تلے بیٹھے ہیں۔

اطہر رضوی صاحب، اہل دل بھی ہیں اور صاحب مطالعہ بھی اور پھر انہوں نے اس دنیا کے سو سے زیادہ ممالک کی سیاحت بھی کی ہے، ان کی تحریریں اور رویہ سراسر غیر جانبدار اور علمی ہے ان سب خواص نے مل جل کر اس کتاب کو لائق مطالعہ ہی نہیں بنایا بلکہ ایک ایسی اہم دستاویز کی شکل دے دی ہے جو اہل نظر کے لیے مقام فکر اور صاحبان بصیرت کے لیے ایک اشارہ ہے۔

ہر ملک ملک ماست

چوذوقِ نغمہ کمیابی

پروفیسر سحر انصاری، کراچی، پاکستان

اطہر رضوی ایک ایسی شخصیت ہیں کہ آپ ان سے ایک بار بھی مل لیں تو انھیں کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔ وہ خوش اخلاق، متواضع اور دوست نواز انسان ہیں۔ لیکن ایک روح مضطرب کے مالک بھی ہیں جو ہر وقت اپنے مخصوص انداز اور اسلوب میں اپنا اظہار چاہتی ہے۔

میں ذاتی طور پر اطہر رضوی سے تھوڑا بہت واقف ہوں مزید واقفیت اُن کی تحریروں کے ذریعے ہوئی ہے۔ چند سال پہلے معروف شاعر اشفاق حسین نے کنیڈا کے مشاعروں اور سیمناروں میں شرکت کے لیے ہمیں بھی مدعو کیا تھا۔ اس وقت کی صحبتیں یادگار رہیں۔ احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر قمر رئیس، شہزاد احمد، جون ایلیا، محسن احسان، فتح محمد ملک جیسے حضرات ان محفلوں کی جان تھے۔ اشفاق حسین کے علاوہ ڈاکٹر خالد سہیل، اکرام بریلوی ڈاکٹر من موہن شرما، ہمارے دیرینہ دوست ظفر اور ان کی شریک حیات غزالہ— مسی ساگا کے اس علاقے میں ایک خوبصورت دنیا نظر آئی۔

اطہر رضوی مسی ساگا (اونٹیریو، کنیڈا) ہی میں رہتے ہیں۔ یہاں انھوں نے غالب اکیڈمی قائم کی ہے ہر سال اس کے زیر اہتمام غالب کی یاد میں مذاکرے اور طرحی مشاعرے منعقد ہوتے ہیں۔ ایک مشاعرے اور مذاکرے میں شرکت کا مجھے بھی موقع ملا۔ اطہر رضوی

اپنی جرمن نژاد شریک حیات ریٹا اور تین بچوں علی گوہر، انور اور نیلوفر کے ساتھ وہاں ایک خوش حال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انھوں نے ایک محفل اس موضوع پر بھی منعقد کر ڈالی کہ جدید تغیرات کی روشنی میں ترقی پسندی کا مستقبل کیا ہے اور آیا اب کسی نظریئے کی ضرورت ادب اور ادیبوں کو ہے بھی یا نہیں؟ بہت دلچسپ اور گرما گرم بحث رہی۔ ان ہی محفلوں میں معلوم ہوا کہ اطہر رضوی کا تعلق اورنگ آباد سے ہے۔

ای گل بتو خورسندم، تو بوی کسی داری؟

ایک فطری کشش محسوس ہوئی۔ اطہر رضوی نے خود ہی بتایا کہ وہ اورنگ آباد میں طالب علمی کے زمانے سے ایک جوشیلے اور انقلابی نظریئے پر ایقان رکھتے تھے۔ ابتدا میں اُن کا تخلص باغی تھا لیکن کسی نے یہ فقرہ چست کر دیا ہے کہ یہ بغاوت سے باغی نہیں بلکہ باغ سے باغی ہیں۔ بس اسی دن سے تخلص کا لاحقہ ختم کیا۔

اطہر رضوی نے کراچی یونیورسٹی سے سیاسیات میں ایم۔اے کیا ہے۔ مغربی یونیورسٹیوں میں بھی تعلیم حاصل کی ہے۔ مطالعے، مشاہدے، نظریئے اور سیر وسفر کی بدولت اُن کا ذہن ایک خاص انداز سے تشکیل پا چکا ہے جس میں بے باکی، حوصلہ بندی اور حقائق تک رسائی کا غیر معمولی شغف پایا جاتا ہے۔ اسی لیے وہ محفلوں میں اور اپنی تحریروں میں بھی سوالات اُٹھاتے ہیں۔ خود بھی سوچتے ہیں اور دوسروں کو بھی سوچنے پر مائل کرتے ہیں۔

زیر نظر کتاب جو "ہر ملک ملک ماست" کے عنوان سے منظر عام پر آ رہی ہے اطہر رضوی کی شخصیت، نظریات اور اضطراب باطنی کا ایک جیتا جاگتا مرقع ہے۔ انھوں نے مشرق ومغرب میں رہ کر جو کچھ سیکھا اور دیکھا ہے اس کو تاریخ اور شعور آگہی کے تناظر میں پرکھنے اور بیان کرنے کا عمل اس کتاب میں نظر آتا ہے۔

"ہر ملک ملک ماست" میں سیر وسیاحت کے حوالے سے بھی انسانی معاشروں خصوصاً مسلمانوں کی تاریخ پر نظر ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ موضوعات ہیں جن پر اطہر رضوی

نے سوچا ہے اور دوسروں کو بھی سوچنے کی دعوت دی ہے۔ یہ بہت اہم موضوعات ہیں۔ ۱۔ اشتراکیت کی موت ۲۔ اسلامی دہشت گردی ۳۔ اسلام اور بربریت ۴۔ ہم درمیانے ۵۔ عدم تناسب ۶۔ جہالت اور تعصب۔

غیر ممالک میں رہنے والوں کو مذکورہ موضوعات یقیناً ستاتے ہوں گے کیوں کہ وہاں کا پریس اور ذرائع ابلاغ اپنے حساب سے جس طرح حقائق کو کبھی بالکل برہنگی کی حد تک درست پیش کرتے ہیں اور کبھی انتہائی بددیانتی کی حد تک مسخ کر دیتے ہیں وہ حساس اور درد مند انسان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔

اطہر رضوی نے ایران، ترکی، مصر، سمرقند و بخارا کی سیر کے دوران وہاں کی تاریخ، معاشرے، نظام اقدار اور سیاست ومعیشت کو غائر نظر سے دیکھا ہے۔ اسی طرح اسپین کے حوالے سے بہت عمدہ تحریر قلمبند کی ہے۔

شخصیات میں علی سردار جعفری۔ ڈاکٹر فران فتح پوری، جمیل الدین عالی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، سید ضمیر جعفری، حمایت علی شاعر، ڈاکٹر من موہن شرما پر اطہر رضوی کے مضامین بھی کتاب کی زینت ہیں۔

معاملہ شخصیات کا ہو یا نظریات کا۔ ہر جگہ اطہر رضوی سے مکمل اتفاق کرنا ممکن نہیں۔ لیکن یہ بات بھی درست ہے کہ جس شخص میں دنیا کو بہتر بنانے، انسانوں کو خوش حال دیکھنے اور ایک ہمہ گیر انقلاب برپا کرنے کی لگن ہو اس کا ردعمل شدید ہوسکتا ہے کہ اور کسی بحر مواج کی طرح ساحلوں کی حدود سے بھی باہر نکل سکتا ہے۔

اطہر رضوی مدت دراز سے دیار مغرب میں آباد ہیں اور ایک باعزت زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انھیں ہر طرح کی آرائش میسر ہے۔ لیکن وہ خود کیا ہیں اس کا اندازہ اُن کے اس فقرے سے ہوسکتا ہے جو انھوں نے ازبکستان والے باب میں لکھا ہے:

''میری عمر مغرب کے بازاروں میں کٹی مگر میری روح بہت سادہ

بہت مشرقی اور بہت اسلامی ہے۔''

یہ گویا اطہر رضوی کے مزاج شخصیت اور نظریات کا کلیدی نکتہ ہے۔ وہ ایران گئے ہوں یا عرب ممالک میں مقیم رہے ہوں۔ وسط ایشیا سے گزرے ہوں یا خود اپنے پاکستان کو دیکھ رہے ہوں، ہر جگہ یہی روح کارفرما نظر آتی ہے۔

اطہر رضوی کے تجزیے بعض اوقات انتہائی بے باک اور سفاک ہو جاتے ہیں جو آج کی بے حس دنیا کے لیے ضروری ہیں ۔

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کمیابی

وہ باب جس سے کتاب کا نام ماخوذ ہے، اطہر رضوی کی اس خواہش کی علامت ہے کہ وہ ایک طرف تو ایک عالمی شہری (World Citizen) بننا چاہتے ہیں اور دوسری طرف پاکستان کو ایک اعلا اور ترقی یافتہ ملک دیکھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے بڑی دردمندی اور دقت نظر سے پاکستان کے موجودہ حالات پر تبصرہ کیا ہے اور اس کے رستے ہوئے ناسوروں پر نشتر زنی کی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جذبہ پاکستان سے اُن کی بے پناہ محبت اور وابستگی کی دلیل ہے۔

اس تحریر سے اہلِ پاکستان بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

اطہر رضوی نے یادوں، واقعات، تاریخی حوالوں، ذاتی مشاہدوں اور تجربوں سے اس کتاب کو قابلِ مطالعہ بنا دیا ہے اس میں محسوس کرنے اور غور و فکر سے کام لینے کا خاصا سامان موجود ہے۔ اطہر رضوی کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ''احساس زیاں'' کو بیدار کیا جائے۔ تاہم ان کی تحریریں محض شکایات، دنیا کی ناقابل برداشت صورت حال اور نکتہ چینی پر ہی مشتمل نہیں ہیں بلکہ ان کی تحریریں شگفتہ ہیں، حوصلہ دیتی ہیں اور ایک بہتر انسانی مستقبل کے لیے کام کرنے پر اکساتی بھی ہیں۔

ہر ایسی کتاب جیسی کہ ''ہر ملک ملک ماست'' ہے اپنے بطن میں ایک دعوت جدل رکھتی

ہے۔ اور ''جدلیات'' ایک ایسا طریقہ کار ہے کہ اس کے بغیر منفی مثبت کے ٹکراؤ اور اس سے
حاصل ہونے والے نتیجے کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ اطہر رضوی کی کتاب اس اعتبار سے بہت اہم
ہے کہ وہ ذہنوں کو جھنجھوڑتی ہے اور غور وفکر، خبر واحساس کی طرف مائل کرتی ہے۔ یہ کتاب
خیالات، نظریات، اقتباسات کا مجموعہ نہیں ایک روح مضطرب ایک زندہ انسان کے تجربات
حیات کا نچوڑ ہے جس سے افراد اور ادارے، بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔

اطہر رضوی ''ہر ملک ملک ماست'' کے آئینے میں

پروفیسر منظر ایوبی، کراچی، پاکستان

گزشتہ کئی دہائیوں سے اردو کے سیاحتی ادب میں تواتر کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔ اب سفری کوائف نویسی ایک مستقل فن بن گئی ہے۔ کوئی سال ایسا نہیں گزرتا کہ شاعری کے مجموعوں کی طرح کسی اہم سیاح، ادیب کا سفرنامہ شائع نہ ہوتا ہو۔ اس رجحان کے فروغ نے انشائیہ افسانہ اور ناول کی طرح سفرنامہ کو بھی اردو نثر کی ایک اور مقبول صنف بنا دیا ہے۔ ویسے سفرنامہ کی صنف اردو میں نئی نہیں۔ بہت پہلے ابن بطوطہ اپنے سفرناموں کے ذریعہ شائقین سیاحت کو دنیا بھر کی سیر کرا چکے ہیں۔ اس کے بعد سیاح ادیبوں نے اپنے سیاحتی کوائف، مشاہدات اور تجربات کو ضابطہ تحریر میں لاکر اردو ادب کے خزانے میں گراں قدر اضافہ کیا۔ البتہ دیگر اصناف ادب کی طرح بیسویں صدی کی فضاء سفرنامہ نویسی کو بہت راس آئی۔ اس صدی میں دنیا کے نقشے میں کافی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ کچھ نئے ممالک کی جغرافیائی سرحدیں استوار ہوئیں تو چند ملک سکڑ گئے یا خطہ ارض پر ان کا تاریخی وجود برقرار ہی نہ رہا۔ پھر سائنس کی ایجادات و انکشافات پوری عالم انسانیت کا استفادہ کرنا، ذرائع آمد ورفت، ابلاغ عامہ، پریس اور برقی میڈیا کے فروغ سے انسانی برادری کا بدرجہ اتم فائدہ اٹھانا، دنیا کے وسیع وعریض علاقوں کے درمیانی فاصلوں کا سکڑ کر مختصر ہونا، روشن مستقبل اور تلاش رزق میں پس

ماندہ ممالک کے افراد کا ترقی یافتہ ملکوں کی طرف ہجرت اور نقل مکانی کرنا، پوری کائنات کا Voice media کی گرفت میں آنا وہ تمام حقائق ہیں جو فن سیاحت نویسی کے فروغ میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔ پاکستان میں کچھ نے ضرورتاً اور بعضوں نے ذوق نظارگی کی تکمیل پر اپنے سیاحتی حالات و واقعات کو سفرناموں کا روپ عطا کیا۔ ابنِ انشا (مرحوم) ایک مدت تک ''چلتے ہو تو چین کو چلیے'' اور دنیا گول ہے'' کے عنوان سے دنیا بھر کی سیر و سیاحت کے کوائف شائقین علم و فن کی نذر کرتے رہے۔ عالمی اقوام کی مختلف تہذیبی و ثقافتی جہتوں کا جائزہ ان کے تقریباً تمام سفرناموں کی جان ہے۔ ان کے علاوہ معروف ادیب و شاعر جمیل الدین عالی ''تماشہ میرے آگے'' کی سکرین پر اپنے عالمی سفری کوائف کے مناظر پیش کرتے رہے۔ اور ایک طویل مدت تک فن سیاحت نگاری کا جادو جگاتے رہے۔ ان کے علاوہ جن کے سفرناموں کو اردو دنیا میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی ان میں اختر ریاض الدین کرنل محمد خان، اشفاق احمد، مستنصر حسین تارڑ، غلام رسول مہر، محسن علی شاہ اور گیارہ سفرناموں کے معروف و ہردلعزیز مصنف قمر علی عباسی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان سب میں افادیت اور اہمیت کے اعتبار سے قمر علی عباسی کے سفرنامے سرفہرست ہیں۔ عباسی صاحب نے اپنی زود نویسی کے باوصف سفری کوائف نویسی میں تقریباً تمام جدید فنی لوازمات کا خیال رکھا ہے۔ انہوں نے سفرنامہ نگاری کی روایت کو نہ صرف استحکام عطا کیا ہے بلکہ اپنے منفرد طنزیہ اسلوب بیان کی مدد سے اس کے کینوس میں وسعت بھی پیدا کی ہے۔ سیاحتی ادب کا مورخ قمر علی عباسی کو کسی طور پر بھی فراموش نہیں کرسکتا۔ ہم اگر انہیں اپنے عہد کا بطوطہ کہیں تو شاید بے جا نہ ہو۔

حال ہی میں دو کتابیں ہماری نظر سے گزری ہیں۔ ''ہر ملک ملک ماست'' اور ''خدا کے منتخب بندے'' پہلی تصنیف کا موضوع سیر و سیاحت ہے جب کہ دوسری عالمی کتاب صیہونی تحریک کے بارے میں ہے۔ دونوں کے مصنف معروف دانشور اور سیاح جناب اطہر رضوی

ہیں۔ اطہر رضوی کے ذہن کی ابتدائی نشو ونما ان کے آبائی شہر اورنگ آباد دکن میں ضرور ہوئی مگر ان کی عمر عزیز کا گراں قدر حصہ کراچی اور لندن میں گزرا ہے۔ مدت دراز سے مسی ساگا (اونٹوریو) (کنیڈا) میں سکونت پذیر ہیں۔ مگر اشتیاق سیاحت اور ان کے روحانی اضطراب نے انھیں عمر بھر کسی جگہ جم کر نہیں بیٹھنے دیا ہے پھر قدرت نے چشم بینا و ذوق لطیف، تحقیقی و تنقیدی شعور اور شگفتہ مزاجی سے بھی انھیں نوازا ہے اور سونے پہ سہاگہ ان کی معاشی آسودگی اور خوشحالی ہے۔ گویا وہ صاحب استطاعت بھی ہیں اور ذہنی و جسمانی دونوں اعتبار سے چاق چوبند بھی۔ ان شخصی اوصاف اور ذاتی سہولتوں کی بنا پر انھوں نے دنیا بھر کی سیر وسیاحت اور انسانیت کے مطالعے کے لیے خود کو وقف کر رکھا ہے۔ ہر ملک ملک ماست کے سفرنامے صحیح معنوں میں ان کے بیقرار روح، حساس دل، تاریخی بصیرت، تنقیدی شعور اور علمی صلاحیتوں کے آئنہ دار ہیں۔

اطہر رضوی صاحب کی شخصیت کا یہ پہلو اس اعتبار سے دلچسپ ہے کہ خطہ ارض پر بکھرے ہوئے قدرت کے حسن و جمال، کائنات کی نیرنگیوں رعنائیوں موسموں کی رنگارنگیوں عطیات الٰہی کے فیوض و برکات ذہن انسانی کے کرشموں اور دست ہنر منداں کے کارناموں کا صرف اپنی چشم حیراں سے نظارہ کرنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ باطنی و روحانی طور پر ان سے وہ خود بھی لطف اندوز ہوتے ہیں اور اپنے مشاہدات و تجربات سیاحت اور تجزیاتی نتائج سے دوسروں کو بھی آگاہ کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ ہر ملک ملک ماست کا بالا استیجاب مطالعہ جہاں ان کی علمی استعداد اور ذوق سیر وسیاحت کی نشان دہی کرتا ہے وہاں ان کی شخصیت کے بعض دل آویز پہلوؤں کو بھی بے نقاب کرتا ہے اسی سبب ان کے بارے میں صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ مختلف عالمی انسانی برادریوں کے تہذیبی تمدنی اور ثقافتی قدروں کے بارے میں وہ اپنا ایک علاحدہ تنقیدی زاویہ نظر رکھتے ہیں جو دوسرے سفرنامہ نگاروں کے مقابلے میں زیادہ افادیت واہمیت کا حامل ہے۔ بلکہ ہماری نظر میں مشرق ہو یا مغرب انہوں نے ہر خطے اور

علاقے کو تاریخی آگہی کے تناظر میں دیکھا اور تنقیدی شعور کی روشنی میں پرکھا ہے۔ ان کے رویے سے قاری پہلی ہی نظر میں انھیں ایک غیر جانب دار تجزیہ نگاری کی حیثیت سے پہچان لیتا ہے۔

رضوی صاحب نے ''سودائے جہاں گردی'' کے باب میں اپنے طرزِ نگارش زاویہ فکر او مطمحِ نظر کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ ''ہر سفر میں میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ (Natives) مقامی لوگوں سے تبادلہ خیال کروں۔ ہر سیاحتی مضمون میں عالی شان عمارات، ملنسار لوگوں اور خوبصورت عورتوں کی حاشیہ آرائی نہیں ہوتی۔ دورانِ سیاحت متنازعہ نظریات اور شخصیات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ میں کسی شخص یا خیال رواج یا کلچر کی آنکھیں بند کر کے تعریف نہ کروں اور نہ تعصب کی عینک پہن کر کسی کا دل دکھاؤں۔'' اس اقتباس سے ہماری اس رائے کی تائید ہوتی ہے کہ اطہر رضوی نے سیاحتی کوائف نگاری میں ایک غیر جانب دار ادیب کا کردار ادا کیا ہے اور وہ اپنے سینے میں دل درد مند بھی رکھتے ہیں۔

عقیدت اور حقیقت کے باب میں رضوی صاحب نے کہیں بھی اپنے مسلک کو اظہار حقیقت پر غالب نہیں آنے دیا ہے۔ دنیا کے مسلمانوں کی اکثریت نے ایران سے بادشاہت کے خاتمہ کو سراہا ہے اور جمہوری حکومت کے قیام کو حقیقی اسلامی نظام کی پہلی کڑی قرار دیا ہے مگر ایران کے سفرنامہ میں ان کی جراءت و بے باکی قابل ستائش ہے ''موجودہ ایران ایک آئیڈیل اسلامی حکومت نہیں ہے'' اس ضمن میں انہوں نے قدرے تفصیل سے موجودہ ارباب اقتدار کے درمیان نظریاتی اختلافات کے سبب ایرانی قوم کو پہنچنے والے نقصانات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں ان کی یہ حقیقت بیانی کہ ''ایران کا اگر انتہائی غیر جانب دارانہ طور پر مشاہدہ اور معائنہ کیا جائے تو وہاں ریاکاری کے عناصر بھی جگہ جگہ ملتے ہیں'' قاری کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیتی ہے۔ یہ صاف گوئی اس امر کی مظہر ہے کہ رضوی صاحب نے

موجودہ ایرانی معاشرے کو فرشتوں کی سوسائٹی قرار نہیں دیا ہے بلکہ کھلے ذہن اور تاریخی شعور کے حامل ہر فرد کی طرح انھوں نے اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا کہ خطہ ارض کے دیگر معاشروں کی طرح ایران بھی بشری کمزوریوں سے مبرّا نہیں۔ عقیدت اور حقیقت کے اسی باب کی آخری سطور میں انہوں نے صاف لفظوں میں واضح کر دیا ہے کہ وہ اپنے ذاتی نظریہ حیات اور انکشاف حقائق میں کسی نوع کی مصلحت پسندی کے قائل نہیں ہیں مثلاً ''ایران سے میرا نسبی اور روحانی رشتہ ہے۔ میری ساری معقول اور جائز ہمدردیاں اس کے ساتھ ہیں۔ میں اس کی سلامتی اور ترقی کا خواہاں ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایران جیسے ملنسار اور مہمان نواز لوگ دنیا کے دوسرے ملکوں میں شاذ ہی نظر آتے ہیں لیکن گستاخی معاف! ایران نہ جنت کا کونہ ہے اور نہ وہاں فرشتے اور حوریں رہتی ہیں نہ شہر میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں اور نہ وہاں کچھ دیر بعد معجزے ہوتے ہیں۔'' رضوی صاحب کا یہ انداز فکر و نظر عرب مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ ''مرحوم'' سلطنت اندلس (اسپین) کی سیاحت پر مبنی تحریروں میں ملاحظہ کیجیے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد فرانسیسی جنرل جیراڈ (geraud) جب صلاح الدین ایوبی کی قبر پر پہنچا تو اس نے قبر پر ایک لات ماری اور کہا۔ سن اے صلاح الدین ہم واپس آگئے ہیں۔ تاریخ اپنے آپ کو دہرانے میں کبھی کبھی بڑی ستم ظریفی سے کام لیتی ہے'' اطہر رضوی نے تاریخی عمل پر اپنے تیقن کا اظہار کرتے ہوئے جنرل جیراڈ کے مذکورہ مذموم اقدام کے جواب میں جو کچھ رقم کیا ہے اس کا ایک ایک حرف ان کے تاریخی شعور کی منہ بولتی تصویر ہے۔ فرماتے ہیں کہ ''کیا یہ بات قطعاً بعید از قیاس ہے کہ ایک دن غرناطہ کے مسلمانوں کی کوئی اولاد فرڈی فنڈ کی قبر پر جائے ارو اس پر تھوک کر کہے سن! اے فرڈی فنڈ! ہمارے آبا و اجداد نے تیرے ملک کے ساتھ جو سلوک کیا تھا دنیا کے کسی فاتح نے مفتوح کے ساتھ نہیں کیا اور تو نے اور تیری قوم نے اس کا شکریہ یوں ادا کیا کہ ہماری آٹھ سو سالہ تہذیب اور میراث (Legacy) کو نیست و نابود کر دیا سن! کہ ہم واپس آگئے ہیں۔'' اطہر رضوی کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی آواز کیا

علامہ اقبالؔ کے اس جذبہ ملی کی ترجمان نہیں جس نے ہسپانیہ کی سرزمین پر ''مسجد قرطبہ'' جیسی عظیم نظم لکھوائی؟ سلسلہ روز وشب نقش گر حادثات۔ سلسلہ روز وشب اصل حیات وممات یا رضوی صاحب کا احساس عظمت رفتہ کیا علامہ کے فلسفہ عشق سے مماثلت نہیں رکھتا؟ اے حرم قرطبہ عشق سے تیرا وجود۔ عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت وبود۔ جہاں تک سفرنامہ نویسی کے جدید، اصولوں کا تعلق ہے ہمیں اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہر ملک ملک ماسٹ کے تمام سفرنامے فن کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ سفری کوائف نویسی کی جدید تکنیک میں سیاح ادیب کے عام فہم اسلوب بیان کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے رضوی صاحب کا طرز نگارش اتنا سلیس، آسان مگر پرکار ہے کہ وہ قاری کی دلچسپی اور تجسس کو سفرناموں کی آخری سطور تک قائم رکھتا ہے۔

علاوہ ازیں دوسرے سفرنامہ نگاروں کے مقابلے میں رضوی صاحب کے یہاں قاری کو جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ ہے ان کی دیانت داری حقیقت پسندی عمیق النظری اور ژرف نگاہی۔ واقعوں مشاہدوں اور تجربوں کی تصویر کشی میں انھوں نے کسی جگہ بھی مبالغہ آرائی غلو یا اغراق کا سہارا نہیں لیا ہے۔ عبارت آرائی کے لیے فضول اور بے سروپا باتوں سے احتراز برتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے سفرنامے اس نوع کے اسقام سے پاک ہیں۔ اپنا علاقہ ہو یا غیر کا وہ جو دیکھتے ہیں وہی لکھتے ہیں۔ لگی لپٹی کے قائل نہیں او جوش کو ہوش پر غالب نہیں آنے دیتے۔ قاہرہ اور استنبول کے جائزے میں ایک جگہ فرماتے ہیں'' کہا جاتا ہے کہ اگر مصر میں ڈھائی لاکھ ملینئرز (millionairs) ہیں تو کم از کم دو لاکھ قاہرہ میں رہتے ہیں۔ پاکستان کی طرح یہاں بھی چالیس (۴۰) خاندان ہیں جن کا ملک کی دولت اور معیشت پر قبضہ اور کنٹرول ہے قاہرہ کے باسیوں کا تکیہ کلام'' انشاء اللہ'' ہے۔ ان کو خداوند کریم کی رحمت پر اتنا اعتقاد ہے کہ قناعت اور انکساری ان کی دوسری فطرت بن چکی ہے یا پھر یہ کہ یہودیوں کے ہاتھوں ان کو اتنی زکیں پہنچی ہیں کہ ان میں شاید احساس کمتری پیدا ہوگیا ہے''

حقیقت یہ ہے کہ یہ جرات و بے باکی جو اطہر رضوی کے سفرنامے کی روح ہے شاذ ہی کسی سفرنامہ نگار کے سیاحتی تحریروں میں پائی جاتی ہو۔

اطہر رضوی کے سفرناموں کا ایک اور وصف ان کا محاکاتی انداز ہے۔ انھوں نے ہر واقعہ اور ہر مقام کی تصویر کشی میں گردوپیش کا مکمل نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ قاری کو خود پر قلم بنی کا گماں گزرتا ہے۔ وہ اپنی ذات کو عالم محویت میں محسوس کرتا ہے۔ یوں تو ہر سفرنامہ نویس کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ قاری کو ہر پل اور ہر لمحہ اپنے ہمراہ رکھتا ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ قمر علی عباسی کے علاوہ اگر کسی کی ہمراہی میں قاری پر سرشاری کی کیفیت طاری ہوتی ہے یا وہ حیرت واستعجاب کے عالم میں مستغرق رہتا ہے تو وہ اطہر رضوی کی ذات ہے جو قاری کو محاکاتی طلسم سے باہر نہیں نکلنے دیتی ان کے سفرناموں کا یہی سحر قاری کو بہت کچھ سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کرتا ہے۔

"ہر ملک ملک ماست" پر اپنے تاثرات کا اختتام اگر ان آراء کے ساتھ نہ کیا جائے تو ادیب اور اس کی تصنیف دونوں کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوگی کہ اطہر رضوی نے قارئین کی آگاہی کے لیے بعض آثار قدیمہ یا عجائبات کا تاریخی تناظر میں جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ ان کے ماضی اور حال پر اس طرح روشنی ڈالی ہے کہ مختلف ادوار میں قوموں کے باہمی روابط کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوتا گویا ان کے سفرنامے بعض قوموں کے عروج زوال کی عبرتناک داستانیں بھی ہیں اور کئی قدیم انسانی تہذیبوں اور ثقافتوں کے تقابلی جائزے بھی۔ ان فنی محاسن کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اطہر رضوی صاحب کے سفرنامے اردو کے سیاحتی ادب میں یقیناً گراں قدر اضافہ ہیں۔ اس صنف کی خوش قسمتی ہے کہ اسے اطہر رضوی کی شکل میں ایک ایسی قد آور پہلو دار اور ہمہ جہت شخصیت مل گئی ہے جو صاحب اسلوب بھی ہے اور دل دردمندی کی حامل بھی نیز وہ ایک ایسا قلمکار ہے جو مناظر فطرت کا شیدائی بھی ہے اور حسن وجمال قدرت کا عاشق بھی تاریخ کا مدرک بھی ہے اور اقوام عالم کے عروج و زوال کا رمز

شناس بھی، اسلام کی نشاۃ ثانیہ سے باطنی ربط کا حامل بھی ہے اور مسلمانوں کی گم شدہ عظمت کا نوحہ خواں بھی۔ جو خود بھی سوچتا ہے اور دوسروں کو بھی سوچنے کی ترغیب دیتا ہے۔ جس نے اپنے سفری کوائف نگاری کے دوران نہ کوئی (Controversial) بات کی اور نہ کسی کا دل دکھایا۔ یہاں تک تو اظہار خیال کیا گیا "ہر ملک ملک ماست" کے بارے میں۔ اب ذرا مصنف کی دوسری تصنیف پر نظر ڈالئے:

اطہر رضوی نے "خدا کے منتخب بندے" کا انتساب بھی سوچنے اور سمجھنے والے اذہان کے نام کیا ہے۔ بے شک! عہد رواں کا اس سے زیادہ نازک موضوع کوئی نہیں اور وہ بھی ایک جہاں گرد مسلمان ادیب کے لیے۔ مگر اطہر رضوی اس باب میں بھی قابل صد مبارکباد ہیں کہ پوری کتاب کے مطالعے کے دوران کسی جگہ پر بھی ان کی حب الوطنی، مسلک پسندی اور دین داری ان کی حقیقی تجزیہ نگاری پر غالب نہیں آئی ہے "ہر ملک ملک ماست" کی طرح اس تصنیف میں بھی انہوں نے اپنا نظریہ فکروفن اور مقصد تحریر واضح کر دیا ہے کہ "ہر شخص کے پوشیدہ نجی تعصبات (Private Biases) ہوتے ہیں یہ انسانی فطرت ہے میں نے اپنی تحریروں میں حتی الامکان کوشش کی ہے کہ میں نے اپنے تاثرات کو تاریخ کی صحت پر ترجیح نہ دوں، ہر ممکنہ تلخ یا خوشگوار واقعہ کے تعلق سے جو میرے علم میں آیا میں نے اپنی ذہنی تربیت سوجھ بوجھ اور فلسفے کی روشنی میں سوچا اور ایک رائے قائم کی" مزید وضاحت کے لیے ان کی یہ چند سطور بھی بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ کہ مجھے اگر صیہونیوں سے (عام یہودیوں سے نہیں) کوئی بغض یا شکایت ہے تو وہ صرف اس لیے نہیں ہے کہ انہوں نے ایک اجنبی زمین پر دنیا کے چار کونوں سے آکر اس پر قبضہ کرلیا اور وہاں کے صدیوں کے رہنے والے باشندوں کو باہر نکال پھینک دیا۔ مجھے زیادہ گلہ اس بات کا ہے کہ انہوں نے اپنی اس شاطرانہ فراست سے مغرب کے دماغ اور ذہن کو ایسا مفلوج یا منجمد کر دیا ہے کہ اس میں اس سلسلے پر عاقلانہ تدبر (Rationally) کی صلاحیت تقریباً ختم ہو چکی ہے" اطہر رضوی نے اپنی اور خدا کے منتخب

بندے کے بارے میں خود جس ناقدانہ رائے کا اظہار کیا ہے کسی ناقد کا اس سے بہتر اظہار رائے ممکن نہیں۔

میں دل کی گہرائیوں سے اطہر رضوی صاحب کو ان کی دونوں تصانیف کی طباعت و اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امجد اسلام امجد کی درج ذیل آرا سے سوفیصد اتفاق کرتے ہوئے سلسلہ قلم منقطع کرتا ہوں: کہ" اطہر رضوی صاحب نے بہت محنت، تحقیق اور عالمانہ غیر جانبداری سے یہودی قوم کے اس فلسفہ کی کارفرمائیوں کا احوال لکھا ہے اور تاریخی پس منظر کے ساتھ ساتھ دور حاضر کے تناظر میں جن بعض ایسے حقائق سے پردہ اٹھایا ہے جن کی طرف اشارہ کرنا بھی ایک طرح سے سانپ کے بل میں ہاتھ ڈالنے کی مترادف ہے۔"

اطہر رضوی کی ''گر ہم برا نہ مانیں......''
اور چہرے باتیں، یادیں، لوگ

ستیہ پال آنند، کناڈا

کچھ اصناف نثر ایسی ہیں، جن کی حدود فاصل متعین نہیں ہیں، اور کئی بار ایک صنف اپنی حدود کو چھلانگ کر دوسری میں وارد ہو جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ حد تک مشابہت رکھنے والی اس دوسری صنف میں گل افشانی کرنے کے بعد یہ اپنے حصار میں واپس آجاتی ہے۔ یہ چند تمہیدی جملے لکھنے کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ جناب اطہر رضوی کی کتاب ''گر ہم برا نہ مانیں......'' پڑھنے کے بعد اسے کسی ایک صنف کے زیر تحویل محبوس کرنے میں مجھے دقت پیش آئی۔ یہ کتاب بیک وقت سفر نامہ بھی ہے، رپورتاژ بھی ہے، تاریخ، ثقافت اور سیاسیات کے میدانوں میں کھوج اور تحقیق کی بیانیہ تفصیل پر مبنی مضامین کا مجموعہ بھی ہے، اور ذاتی، بلکہ وارداتی واقعات کا لیکھا جوکھا بھی ہے۔ اگر نہیں ہے تو یہ کتاب فکشن نہیں ہے اور یہ کمی وہ تاریخی واقعات پوری کر دیتے ہیں، جنہیں مصنف نے ایک کہانی کار کی طرح قلمبند کیا ہے، اور جنہیں پڑھنے میں قاری کو وہی لطف ملتا ہے جو کسی الف لیلوی داستان کو پڑھنے میں ملتا ہے۔

اطہر رضوی صاحب کے کچھ دیگر سفر ناموں میں بھی یہ اوصاف موجود ہیں، لیکن ''گر ہم برا نہ مانیں......'' میں ان خوبیوں کا بدرجہ اتم ہونا ان کی فعال اور ہمہ جہت شخصیت کے اس

رخ کو ظاہر کرتا ہے، جو اس کتاب کا خاصہ ہے کہ سفر نامہ صرف سفر نامہ نہ ہو کر اور بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ شرط اس باریک بینی کی ہے، جو سیاح اپنے ذہنی کیمکارڈر میں محفوظ رکھتا ہے۔

''گر ہم برا نہ مانیں......'' اطہر رضوی صاحب کے حالیہ سفر ہندوستان کی داستان ہے۔ اس داستان کے درجنوں پہلو ہیں، کیوں کہ مصنف کا قلم اپنی تیز روی میں اس سرعت کے ساتھ قدم زن ہے کہ کسی پہلے سے طے شدہ مقالے کی سی ''آؤٹ لائن'' یا دائرے کے اندر کسی مدار و حصار کا تصور ہی غیر ممکن ہے۔ البتہ ان ابواب میں ایک اسٹرکچرل مضبوطی ہے، جو تاریخی شہروں یا شہروں کی تاریخ کے بارے میں ہیں۔ دہلی، بھوپال، لکھنو، علی گڑھ، رامپور کے شہروں کی مسلم تہذیب ان کے اسلامی معاشرے، مختصر تاریخ، عمارات، مساجد، خانقاہوں، باغات، جھیلوں اور تالابوں یا بلدیاتی منظر ناموں کو ان کا ذہنی کیمکارڈر نہ صرف ''لوکل کلر'' کی نگاہ سے دیکھتا ہے بلکہ تاریخی پس منظر بھی مدنظر رکھتا ہے۔ کچھ دیگر ابواب میں البتہ مصنف کا قلم ایک طرح کی شعوری رو کا وطیرہ اپناتا ہے، اور شخصیات سے تاریخ، تاریخ سے سیاست، سیاست سے ادب اور اس سے متعلقہ مسائل ، ادب سے اردو کی صورتحال، اردو سے ہندوستان اور پاکستان کی باہمی رنجش یا دوبارہ دوستی کے اقدام، اس منظر نامے سے پاکستان میں وہابیت کے زیر اثر، طالبان کا سا دل و دماغ رکھنے والے مسلمانوں کا عورتوں کے ساتھ نازیبا سلوک تک بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک گلچین کی طرح مصنف مختلف کیاریوں سے مختلف رنگوں کے پھولوں کو چنتا چلا جا رہا ہے، اور ان سب کو گوندھنے اور گلدستے کی صورت میں باندھنے کے عمل میں وہ انہیں Organic Unity دے رہا ہے۔ کسی مبتدی کے ہاتھوں میں اتنی سکت شاید نہ ہوتی کہ وہ ان مختلف النوع موضوعات کو یکجا کر سکتا، مگر اطہر رضوی صاحب ایک منجھے ہوئے قلمکار ہیں اور وہ ایک لمحے کے لیے بھی قاری کے ذہن کو بھٹکنے نہیں دیتے، انگلی پکڑے ہوئے ساتھ لیے چلتے ہیں اور ایک ٹورسٹ گائڈ کی طرح کسی

عمارت،، منظر، تاریخی شخصیت کے اوصاف گنواتے چلے جاتے ہیں۔

راست گوئی اطہر رضوی صاحب کا اصول اول ہے۔ اگر وہ ''لکھنو کی ذیلی تہذیب'' میں محرم اور اس سے متعلقہ تعزیہ داری کے اصولوں، ضابطوں اور گزشتہ کچھ صدیوں میں بدلتے ہوئے رواجوں کا ذکر کرتے ہیں۔ وہاں وہ یہ کہنے سے بھی نہیں چوکتے۔'' بہ حیثیت مجموعی، مجھ ناچیز کی نظر میں عصر حاضر کی مجالس محرم امام حسین کی عظیم قربانی اور ان کے پیغام کی کما حقہ صورت گری نہیں کرتی ہیں۔''

اب ایک طائرانہ نظر ان بھی ابواب پر ضروری ہو جاتی ہے، جو اردو زبان و ادب اور اس سے متعلقہ مسائل سے منسلک ہیں۔ اس کی شروعات'' اردو کی نئی بستیاں'' سیمینار سے ہے۔ یہ سیمینار دہلی میں زیر نگرانی ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، چیئر مین ساہتیہ اکادمی منعقد ہوا۔ (راقم الحروف کچھ انکسار کے ساتھ اس بات کا داعی ہے کہ'' اردو کی نئی بستیاں'' اس کی اختراع ہے، اور پہلی بار مکتبہ جامعہ دہلی کے رسالے'' کتاب نما'' میں ایک مہمان اداریہ کے عنوان کے طور پر راقم الحروف نے استعمال کی، جو سات برس پہلے شائع ہوا۔ بعد میں یہ سکہ رائج الوقت ہوگئی) سیمنار کی اس رپورٹ میں جہاں دو یا تین دلچسپ واقعات یا نوک جھونک کے نمونے ملتے ہیں وہاں ہمیں مصنف کے اپنے مقالے'' کناڈا میں اردو'' کی تفصیل ملتی ہے، کو بشمولیت ایک درجن سے زائد ناموں کے تاریخی حیثیت کی حامل ہے۔ بہر حال اس کا'' فوکل پوائنٹ'' ٹورونٹو یا اس کے گردونواح میں شائقین اردو کی سرگرمیاں ہیں۔ اطہر رضوی صاحب کا دولت کدہ اپنے آپ میں ان سرگرمیوں کا منبع اور محور ہے اور اس کی تفصیل کما حقہ طور پر موجود ہے کاش اس بات میں ان دیگر مقالوں کے بارے میں بھی کچھ واقفیت مہیا کی جاتی ہے جو وہاں پڑھے گئے۔ یا کم از کم ان کی ایک فہرست ہی پیش کر دی جاتی، مگر فاضل مصنف نے یہ مناسب نہیں سمجھا۔

''بھوپال ، شہر اقبال، جہاں اقبال کے بھوپال سے تعلق اور اس سے وابستہ

کڑیاں آپس میں جوڑتا ہے، وہاں بھوپال کی مختصر تاریخ، عمارات، تالابوں، مسجدوں، مدرسوں کی واقفیت بھی دیتا ہے۔ مصنف کا یہ کہنا بجا ہے کہ اسلام اور ہندوستان کے تناظر میں اقبال بیسویں صدی کی سب سے بڑی شخصیت ہے، لیکن یہ کم افسوس کی بات نہیں ہے کہ ان کے پیدائشی وطن پاکستان میں انہیں وہ درجہ یا رتبہ نہیں دیا گیا جو ایران میں خمینی کو یا ترکی میں اتاترک کو دیا گیا۔ یہ درست ہے کہ غالبیات کے بعد اقبالیات پر سب سے زیادہ تحقیقی کام ہوا ہے، لیکن راقم الحروف کی رائے میں اگر اس کام کے ذخیرے میں سے غالب پر مالک رام اور کالیداس گپتا رضاؔ اور اقبال پر کام میں سے جگن ناتھ آزاد کا نام منفی کر دیا جائے، تو باقی جو کچھ بچتا ہے، وہ ناکافی ہے اور یہ تینوں محقق غیر مسلم ہیں اور ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں— بھوپال کے حوالے سے بشیر بدر کے بارے میں بھی دو جملے ہیں۔ یہ راقم الحروف کی کانوں سنی بات ہے کہ بشیر بدر نے کہا تھا کہ دور حاضر میں ان کے قد کا کوئی شاعر نہیں ہے۔ ان کے ادنی قد کا موازنہ تو میرؔ اور غالبؔ سے کیا جانا چاہیے۔ ایک ''بونے'' شاعر کی اپنے ادبی قد کے بارے میں یہ ڈینگ سن کر، مرحوم مشفق خواجہ نے اپنے ایک مضمون میں طنزیہ لہجے میں کہا تھا۔ ''میر اور غالبؔ تو کیا اگر شیکسپیئر بھی بشیر بدر کے ادبی قد کے بالمقابل کھڑا ہو جاتا، تو بونا کہلاتا!''

''سر سید اور علی گڑھ'' بے حد معلوماتی مضمون ہے۔ اس میں سر سید کی زندگی اور ہمہ گیر وہمہ جہت شخصیت کو نفاست سے ابھارا گیا ہے۔ یہ درست ہے کہ بہت سے لوگ انہیں صرف ماہر تعلیم ہونے یا مسلمانوں میں جدید تعلیم کا جذبہ پیدا کرنے کی وجہ سے جانتے ہیں۔ یا برٹش سرکار کو یہ باور کروانے کہ مسلمان بھی ہندوستان کے ایسے ہی شہری ہیں، جیسے کہ دوسرے مذاہب کے لوگ ہیں۔ کے تاریخی رول سے پہچانتے ہیں اور یہ فراموش کر جاتے ہیں کہ امت کی اس خدمت کے علاوہ بطور اسکالر وہ ایک ماہر تاریخ داں اور فلسفی بھی تھے۔ اطہر رضوی صاحب نے سر سید کی ابتدائی تصنیفات ''جام جم'' اور ''آثار الجدید'' کا جائزہ لیا ہے۔ تحقیق

کے میدان میں ''آئین اکبری کی تصحیح''، ''تہذیب الاخلاق''، ''تصحیح تاریخ فیروز شاہی'' وغیرہ تاریخی اور تحقیقی مقالوں کو لوگ اب بھلا چکے ہیں۔ لیکن ان کی اپنی اہمیت ہے۔ سر ولیم میور کی بدنام زمانہ کتاب The life of Mohammad کا جو دندان شکن جواب سر سید نے دیا اس کا ذکر مصنف نے جلی حروف میں کیا ہے۔۔اطہر رضوی صاحب مولانا حالی سے اس بارے میں اختلاف رکھتے ہیں کہ ''سر سید کو انگریزی نہیں آتی تھی'' اور ثبوت کے طور پر وہ درجنوں انگریزی الفاظ پیش کرتے ہیں جو سر سید نے اپنی تصانیف میں اردو رسم الخط میں یا کہیں کہیں انگریزی ہجوں کے ساتھ استعمال کیے ہیں اس سلسلے میں مصنف نے دو انگریز مصنفین G.F.I. Graham اور David Leveld کے حوالہ جات دیے ہیں، جن کی تصنیفات میں اس امر کا کوئی ذکر نہیں کہ سر سید کو انگریزی نہیں آتی تھی۔ انگریزی کا مقولہ ہے Exception is not the rule۔ یہ امر واقع ہے کہ سر سید کی انگریزی سے واقفیت اس سطح کی نہیں تھی کہ وہ بی اے کے کورس کی تاریخ یا معاشیات کی کتابیں انگریزی میں پڑھ سکتے، لیکن کچھ شُد بُد ضرور تھی اور وہ انگلستان میں رہ کر آئے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہاں انہیں انگریزی سن کر سمجھنے کے مواقع پیش آئے ہوں گے۔

اس مجموعے کا سب سے زیادہ فکر آمیز مضمون ''ہندوستان جمہوریت اور مسلمان'' ہے۔ کوئی لاگ لپیٹ رکھے بغیر اطہر رضوی صاحب نے تقسیم وطن سے پہلے کے سیاسی حالات کا جائزہ لیا ہے۔ اس مضمون میں ایک مربوط اور مدلل حوالہ مولانا ابو الکلام آزاد سے ہے۔ مولانا آزاد، آخری دن تک اپنے ہم وطنوں کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً اس خطرے سے آگاہ کرتے رہے جو دو قومی نظریئے کی بنیاد پر تقسیم وطن کے بعد انہیں در پیش ہوگا۔ اور جب مورخ عصر حاضر کے ہندوستان کو دیکھتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان کو معرض وجود میں لانے کے لیے بھی سب سے بڑی قربانی ان ہندوستانی مسلمانوں نے دی، جو پاکستان میں شامل کئے گئے علاقوں میں نہیں رہتے تھے، اور قیام پاکستان کے بعد گزشتہ ساٹھ برسوں

سے اس کردہ یا ناکردہ غلطی کی قیمت چکا رہے ہیں۔ کراچی میں مہاجرین کا حال کسی سے چھپا ڈھکا ہوا نہیں ہے، لیکن لاکھوں کی تعداد میں ہندوستانی مسلمان، جو آج بنگلہ دیش میں "بہاری" کہلاتے ہیں۔ 1971ء کے بعد ناگفتہ بہ حالات میں زندگی کاٹ رہے ہیں۔ اطہر رضوی صاحب کے یہ الفاظ کانوں میں گونجتے ہیں کہ "ہندوستان کے مسلمانوں نے محض ایک ایثار عظیم ہی نہیں، اپنی آنے والی نسلوں کے مستقبل کو پاکستان کی بنیاد اور بقا کی توقع پر نچھاور کر دیا۔

"پاکستان، ایک ناکام ریاست؟" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ استفہامیہ نشان کے باوجود ذی فہم قاری اس مضمون کو پڑھنے کے بعد یہ سوالیہ نشان حذف کر دینا چاہتا ہے تاریخ پاکستان میں اطہر رضوی صاحب موجودہ حالات کے لیے پاکستان کے فوجی ڈکٹیٹر جنرل ضیاء الحق کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ جس نے "ملک کی بنیادوں میں رخنے پیدا کیے۔" دینی مدارس کی تعداد نو سو سے بڑھ کر پچیس ہزار تک پہنچ گئی۔ اس کے عہد حکومت میں ہی یہ اضافہ ہوا۔ ان مدارس کے لاکھوں نوخیز اذہان کو جارحیت، رزم آرائی اور مزاحمت کی تعلیم سے بھر دیا جاتا رہا ہے۔ ان میں سے وہ جواب نوجوان ہیں۔ زندگی بھر اس Conditioning کو فراموش نہیں کر سکتے۔ اطہر رضوی کہتے ہیں۔ "ان مدرسوں کے تعلیم یافتہ طلبا جب تعلیم مکمل کر کے عملی زندگی کے میدان میں قدم رکھتے ہیں تو ان کا رجحان ڈاکٹری، انجینرنگ، کمپیوٹر سائنس، ریاضی، قانون، فلسفہ، منطق یا فلکیات کی جانب نہیں ہوتا ہے۔ وہ اپنے خام اور ناپختہ اذہان میں نفرت کے بیج اور جہاد کا جذبہ لے کر باہر نکلتے ہیں۔"

"آدمی انسانیت" آنکھیں کھول دینے والا باب ہے۔ مجھے لگا جیسے اطہر رضوی یہ باب لکھتے ہوئے خود روتے رہے ہوں۔ افریقی اسلامی ملکوں میں باکرہ لڑکیوں کے اعضا تناسل کی قطع و برید، دوسرے ملکوں، بشمولیت پاکستان، خاندان کی نیک نامی کے لیے لڑکیوں، بہنوں اور بیویوں کی Honour Killing سزا کے طور پر اجتماعی آبروریزی اور خواتین کو برہنہ کر کے

جلوس کی شکل میں چلنے پر مجبور کرنا۔ وغیرہ کچھ محرکات ہیں، جنہوں نے مصنف کو یہ لکھنے پر مجبور کیا ''اسلام اور عورت کے تناظر میں پاکستان کا ریکارڈ اتنا شرمناک، اتنا تکلیف دہ اور اتنا ناقابل یقین ہے کہ کم از کم اس کے لیے پاکستان کو ایک ناکام ریاست (Failed State) ناکام سیاست اور ناکام معاشرہ کہنے میں مجھے کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی۔''

یہ نہیں کہ وہ صرف پاکستان میں وہابی کلچر کے تیزی سے پھیلنے کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ ہندوستان کے دیوبند میں واقعہ اسلامی مدرسہ، فکر کو بھی نہیں بخشتے۔ شرعی احکام کی جتنی سخت ترین تشریح اس وہابی مدرسہ، فکر نے کی ہے، اتنی شدید دنیا میں کہیں نہیں کی گئی ہوگی۔ اطہر رضوی مثال کے طور پر اس بدبخت خاتون کا حوالہ دیتے ہیں، جو پانچ بچوں کی ماں ہوتے ہوئے بھی اپنے ہی سسر کی ہوس کا نشانہ بن گئی اور چہ آنکہ یہ زنا بالجبر کا مقدمہ تھا، ہندوستان میں نافذ مسلم پرنسل لاء، کے مطابق شرعی کورٹ نے یہ فیصلہ دیا کہ وہ اب اپنے شوہر پر حرام ہوگئی ہے اس لیے اسے اپنے سسر کی منکوحہ بیوی بن کر رہنا پڑے گا۔

آخری ابواب میں ایک مختصر ترین باب ڈاکٹر رفیق زکریا کے بارے میں ہے۔ اس میں ان کی ہمہ گیر شخصیت کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ ایک باب سعودی عرب کے بارے میں ہے۔ جس کے حکمران، بشمولیت بادشاہ اور لگ بھگ سات ہزار شہزادے امریکا کے زرخرید غلام ہیں اور تیل کی دولت پر قبضہ جمائے رکھنے کے لیے اس غلامی پر پھولے نہیں سماتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے، کہ ''سعودی عرب کی ایک بڑی اقلیت، نوجوان طلبا، اساتذہ، صحافی اور دانشور، وہابی بادشاہت کی آمریت، اس کے پروردہ سات ہزار طفیلی شہزادوں اور مذہبی پیشواؤں کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے بے تاب ہیں۔''

''تناسب تقصیر'' نامی باب میں اطہر رضوی صاحب نے اپنی کج کلاہی کا اعتراف کیا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے۔ ''میں نے جہاں جہاں تلخ حقیقتوں کو قلمبند کیا ہے، وہ میرے ذہن کے غاروں میں چھپے ہوئے نجی تعصب کی پیداوار نہیں ہے۔'' آخر میں ایک بار پھر ''دینی

مدرسے'' کے زیرِ عنوان ایک مختصر باب میں پاکستان میں بچوں کے اذہان کو زہر آلود کرنے والے ان مدرسوں کو محدّب شیشے والی عینک سے دیکھا گیا ہے۔ اس باب کی آخری سطور یہ ہیں۔ ''نوجوانوں کی کھلی کتاب جیسے دماغوں میں دوسرے فرقے کے افراد کو قتل کر کے جنت کے مستحق ہونے کی تربیت اب بھی دی جاتی ہے......سنا ہے کہ اب ان برگشتہ اذہان کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی ہے۔''

اطہر رضوی میرے پسندیدہ اہل قلم میں سے ہیں۔ ان کی سبھی کتابیں ''خدا کے منتخب بندے''، ''ہر ملک ملک ماست''، ''تاریخ کا سفر''، ''کون عبث بدنام ہوا؟'' میرے زیر مطالعہ رہی ہیں۔ کچھ ایسے حقائق کی توثیق و تصدیق کے لیے میں ان کتابوں سے اکثر استفادہ کرتا ہوں، جو درس کو تدریس یا مضمون نویسی میں میرے لیے کارآمد ہوتے ہیں۔ وہ ایک دانشور محقق ہیں جو تاریخ، فلسفہ، اسلامیات، سبھی شعبوں میں یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ راست گوئی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ لاگ لپیٹ کے بغیر حقائق کو پیش کرتے ہیں۔ اور ان حقائق کی روشنی میں اندرون ملک یا بین الاقوامی واقعات پر ان کا تبصرہ سچا ہوتا ہے۔ سفرناموں میں ان کا ذوق تجسس ذوق علمی سے مملو ہے اور اسی لیے وہ نہ تو کنکر کو ہیرا سمجھتے ہیں۔ اور نہ ہی ہیرے کو کنکر۔ یہی ایک ایماندار جوہری کی پہچان ہے۔

مسائل کے جنگل میں اطہر رضوی کی نئی کتاب

سلطانہ مہر، لندن، برطانیہ

''گر ہم برا نہ مانیں......'' اطہر رضوی صاحب کی پانچویں تصنیف ہے۔ علاوہ ان کے شعری مجموعے ''یاد کے موتی'' اور چار عدد تالیفات کے..........۔

دو سو اکیس (۲۲۱) صفحات کی اس کتاب میں مختلف عنوانات کے تحت اٹھارہ عدد مضامین ہیں۔ اور اگر اطہر رضوی دہلی کے سیمینار ''اردو کی نئی بستیاں'' میں شرکت نہ کرتے تو غالباً یہ مضامین اتنی جلد وجود میں نہ آتے۔

وہ جو کہتے ہیں ''حرکت میں برکت ہے'' تو یہ محاورہ اطہر رضوی کے لیے تو سو فیصد درست ہے۔ دوران سفر لکھنے کی ترغیب و تحریک ملتی ہے اور پھر ہندوستان اور پاکستان میں منعقدہ تقریبات میں اہل علم سے ملاقاتیں ہی انگلیوں میں قلم تھمانے اور نت نئے موضوعات کو سوچ و فکر کی عطا کرنے میں مہمیز کا کام کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ لکھنے والا اطہر رضوی جیسا بے باک دانشور ہو تو موضوع خود بولنے لگتا ہے۔

اطہر رضوی کو اس خوف نے کبھی نہیں ستایا کہ وہ جو سچ لکھ رہے ہیں اس ''سچ'' کی راہ میں کہکشاں نہیں بچھی۔ یہ حقیقت جانتے ہوئے بھی انہوں نے وہ سب لکھا جو آج اردو ادب میں ایک دستاویزی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہے چاہے وہ ان کی کتاب ''خدا کے منتخب بندے'' ہر ملک ملک ماست ہو یا کون عبث بدنام ہوا؟''

تاریخ کا سفر کرتے ہوئے انہوں نے بلکیدیا سے بازنیا تک لکھی اور دیگر لکھے گئے

تاریخ ناموں کے جواہرات میں ایک گوہر خاص کا اضافہ کردیا۔ یہ کتابیں اب ادب اور تاریخ کا حوالہ ہیں اور ہر تعلیم یافتہ شخص کا مطالعہ کر کے اپنے علم پر بلاشبہ نازاں ہوگا۔

زیر نظر کتاب ''گر ہم برا نہ مانیں'' کے بعض موضوعات دور حاضر کے اہم اور سلگتے موضوعات ہیں۔ ان میں سے صفحہ ۱۷۱ پر ایک مضمون ہے ''آدھی انسانیت''۔ اس مضمون میں عورتوں کے حقوق کے ذکر سے ابتدا کرتے ہوئے فاضل مصنف نے خودکش بم باری اور افریقہ کے تاریک براعظم کے بعض تاریک علاقوں میں باکرہ لڑکیوں کے اعضا تناسل کی دین اسلام کے فرائض کی ادائیگی میں قطع برید کا حوالہ دیتے ہوئے اسلامی سوسائٹیوں کے دہرے معیار کے مذہبی لبادوں کو چاک چاک کر کے جن حقائق کی تصاویر دکھائی ہیں وہ نہ صرف لائق مطالعہ ہیں بلکہ ان تصاویر کے آئینے میں ارباب اقتدار کو ہوش کے ناخن لینا چاہئیں۔ اور ایسی قانون سازی ہونی چاہیے کہ معاشرے سے ان قبیح رسوم کا جڑ سے خاتمہ ہوسکے۔ اسی کتاب میں صفحہ ۱۸۷ پر ایک مضمون بعنوان ''شیشے کی دیوار'' ہے۔ مضمون کی ابتدا اس جملے سے ہوتی ہے۔

''حال میں ٹائمز آف انڈیا'' کے ایک کالم نگار کے ایک دلچسپ کالم کو پڑھنے کا موقع ملا۔ اس کی سرخی تھی۔

"Why there are no Indian muslims in Al-Qaeda?"

کالم نگار نے اس کی کئی وجوہ بتائیں جو بظاہر غیر جانب دارانہ مثبت اور حقیقت پر مبنی محسوس ہوتی تھیں۔ اس نکتے پر گفتگو کرتے ہوئے اطہر رضوی نے اور کئی معاشرتی مظالم کے بنیادی نکات پر بحث کی ہے۔ اس ضمن میں ہندوستان کی دلت قوم پر ہونے والے مظالم اور معاشرتی ناہمواریوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے حقوق کے لیے جہاد کرنے والوں میں ایک اہم نام سمیتا نرولا سے متعارف کرایا ہے۔ ایسے حقیقی جہادی لوگوں کے متعلق پڑھ کر انہیں سلام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اطہر رضوی بھی انہی میں سے ایک ہیں جو قلم کے ذریعے جہاد کررہے ہیں اور بے کھٹکے کہتے ہیں۔

''میں جانتا ہوں کہ خامشی میں ہی مصلحت ہے۔ مگر یہ مصلحت اب میرے دل کو کھل رہی ہے اسی کتاب میں اطہر رضوی کا ایک اور مضمون ہے۔ ''مجروح عقیدت'' صفحہ ۱۹۵۔ اطہر رضوی برٹش میوزیم کی سیر کررہے تھے۔ وہاں انہیں ایک وسیع اور بلند دیوار پر دین اسلام کی تاریخ اور قرآن مجید کی ترتیب و تدوین کی تفصیلات کے مطالعہ کا موقع ملا۔ اس تحقیق سے اطہر رضوی متفق نہیں اور وہ بہت بددل ہوکر برٹش میوزیم سے باہر نکل آئے۔ وجہ جو بھی رہی اطہر رضوی نے اسے کھل کر بیان کردیا۔ اور یہ ان کا حق بھی ہے۔ اس حق کے پیش نظر جن کا اختلافی نکتہ نظر ہے وہ اس پر اپنا مؤقف پیش کرسکتے ہیں۔ یوں بحث کے دروازے بند نہیں ہوتے اور ہمارے علم میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔

یہی نہیں اطہر رضوی نے ''دینی مدرسوں' کے حوالے سے بھی ایک مضمون لکھا ہے۔ انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ دینی مدرسوں کے بارے میں ان کی معلومات بہت وسیع نہیں اور نہ ہی انہیں ان کی نصاب تعلیم کی تفصیل معلوم ہے۔ مگر ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے جو معلومات ان تک پہنچی ہیں وہ بہت خوشگوار نہیں۔

اس کے باوجود اطہر رضوی نے اہل علم کو دعوت فکر دی ہے کہ اسلامی تعلیمات کے خلاف محض اسلام کے نام پر عصبیت کی تعلیم اور غیر شرعی جہاد کے لیے ہمارے بچوں کے ذہنوں کو اگر مسموم کیا جارہا ہے تو اس کا فوری تدارک ضروری ہے۔

چار صفحات پر محیط یہ مختصر مضمون لکھ کر اطہر رضوی نے بلاشبہ ایک اہم عصری ضرورت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایسا ہی ایک فکری مضمون بعنوان ''ہماری چشم پوشی'' بھی ہے۔ اس مضمون کے دوسرے پیراگراف میں اطہر رضوی کا انکشاف ہے کہ ۹/۱۱ کے دھماکوں کے بعد جب پورے امریکہ میں قیامت صغریٰ کا منظر تھا، سارے ملک کے ایئرپورٹ بند اور پروازیں معطل تھیں۔ تاہم امریکہ کے ان کٹھن ترین چند گھنٹوں میں نہایت پراسرار اور ناقابل یقین واقعہ یہ تھا کہ واشنگٹن کے ایک ہوائی جہاز کو ملک سے باہر نکلنے کا موقع دیا گیا۔ اور اس جہاز

کے مسافر سعودی سلطنت کے نمائندے اور اسامہ بن لادن کے رشتہ دار تھے۔ گیارہ ستمبر کے ۱۹ دہشت گردوں میں چودہ سعودی شہری تھے۔ اصولاً امریکہ کو افغانستان کی جگہ سعودی عرب سے رزم آرائی یا انتقام لینا چاہیے تھا لیکن نیرنگی سیاست کہ امریکہ کی تاریخ کے اس عظیم ترین سانحے کے بعد سعودی عرب اور امریکہ کے تعلقات مزید استوار ہو گئے۔

غرض کہ اطہر رضوی نے اپنے مضامین میں ''پاکستان ایک ناکام ریاست'' سے لے کر شیشے کی دیوار مقدس گائیں، ہماری چشم پوشی، تناسب تقصیر اور دینی مدرسے تک تمام حقائق اپنے قارئین تک پہنچا کر ایک حقیقت پسند ادیب کا فرض ادا کر دیا ہے۔ ظلم و جبر کا قائم کردہ نظام ہمیشہ ہی ریت کی دیوار ثابت ہوا ہے۔ کیوں کہ جو نظام عوام سے دور ہوگا اور ہر وہ فکر جو عوام کے استحصال کا باعث ہوگی وہ پائیدار نہ ہوگی۔ دکھ بھوگتی انسانیت کے مسائل سسکتے عوام کی کراہیں بے روزگاری اور جہالت سے مضطرب و لاچار انسان ہمارے معاشرے کے اندر جس کرب کا شکار ہیں ان مسائل کو مسندِ اقتدار پر بیٹھنے والوں نے دور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ نہ ہی اسلام کے نعرے لگانے والوں نے عوام کی آرزوؤں اور تمناؤں کو آسودہ کرنے کے لیے راہیں ہموار کی ہیں۔ یہ کام تو پہلے بھی ادب کے وارثوں نے کیا ہے اور اب بھی وہی فکری قوت اور نئی تخلیقی توانائیوں کے ساتھ انجام دیں گے۔ آج بھی تبدیلی کے عمل کو نیا شعور دینے کا فریضہ ادب اور ادیب ہی انجام دے گا۔

مسائل کے اس جنگل میں آج بھی سینکڑوں کہانیاں، نظمیں، غزلیں، مضامین منتظر ہیں کہ انہیں صفحہ قرطاس پر اجاگر کیا جائے اور سسکتے روتے انسانوں کی آواز کو خواص تک پہنچایا جائے۔ اور جو ادیب یہ فریضہ انجام دے رہے ہیں بے شک وہ سنگ زنی کا شکار بھی ہوں گے لیکن بقول احمد ندیم قاسمی (مرحوم) تھوڑے سے تصرف کے ساتھ۔ عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہل ادب (وطن) کے ساتھ یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ۔

ـــــoooOOOooـــــ

اطہر رضوی ایک باریک بیں مورخ

تسلیم الٰہی زلفی، ٹورانٹو
کناڈا

کسی بھی قوم یا عہد کے فکری، سماجی اور سیاسی رجحانات کا شعوری تجزیہ کرنا، ہر ذی شعور کے بس کی بات نہیں۔ کہ اس کے لیے شعور و دانش کے ساتھ کشادہ دلی، غیر منافقانہ رویے اور جرأت اظہار درکار ہوتی ہے۔ جوفی زمانہ خال خال ہی پائی جاتی ہے۔ خاص کر بر صغیر میں 'مصلحتاً اور مغربی دنیا میں احتیاطاً اس کے استعمال سے گریز کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ برصغیر یا مغربی دنیا میں، جرأت اظہار کے دروازے قطعی طور پر بند ہی ہوگئے ہیں...... جس کی مثال ہمارے عہد کے بے باک اور باریک بین مورخ، اطہر رضوی صاحب ہیں، جو نہایت جرأت اور ثابت قدمی کے ساتھ اس محاذ پر ڈٹے ہوئے ہیں۔

ہوا کے خوف سے اکثر، گھروں میں بند ہو بیٹھے
میں کھڑکی کھول کے سرکش ہوا سے دو بہ دو رکھوں

ہم شعور کو تاریخ اور ماحول سے الگ نہیں کرسکتے کہ اس کا تاریخی ارتقاء ہوا ہے، اور وہ تغیر کی بہت سی منزلوں سے گزرا ہے اور گزر رہا ہے۔ ہر چیز کی طرح انسانی سماج کے ساتھ ساتھ شعور بھی بدلتا ہے اور جذبات بھی۔ انسانی فطرت ازلی اور ابدی نہیں ہے۔ شعور اور جذبات بھی ازلی اور ابدی نہیں ہیں۔ تغیر اور تبدیلی ناگزیر ہے۔ یہ ارتقاء کا عمل ہے جس نے غاروں میں بسنے والے درندے کو انسان بنایا ہے۔ اس لیے شعور کی تبدیلی انسانی فطرت کا تقاضہ ہے۔ اگر شعور ناپختہ ہے تو اسے تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ سماجی کشمکش اور زندگی کی

جدوجہد کے ساتھ اس کا تاریخی ارتقاء ہوا ہے۔ اور یہ شعور کی بیداری ہی ہے جس کے زیر اثر اطہر رضوی صاحب نے معرکتہ الآراء کتاب تصنیف فرما کر، دنیا کی ۷۵ فیصد مظلوم آبادی کا قرطاسِ ابیض پیش کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ 'جنوبی افریقہ' جنوبی امریکہ اور مشرق وسطیٰ میں مغربی ممالک کی سنگ دلی اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ اور یہ کہ اشتراکی ملکوں کی چادریں بھی داغ دھبوں سے خالی نہیں۔ رضوی صاحب نے مظالم کے خلاف آواز اٹھائی ہے، اور یہ بڑے جگرے کی بات ہے۔

اطہر رضوی نے "گر ہم برا نہ مانیں" کے عنوان سے مرتب کیے گئے اپنے مضامین میں برصغیر کے تاریخی تناظر میں مسلم ملوکیت کے عہدِ زوال اور برطانوی سامراجی غلامی کے زیرِ اثر، مرتب ہونے والے سیاسی، سماجی اور فکری رجحانات کی نشاندہی کی ہے۔ اور اس سلسلے میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کے معروف مفکروں دانشوروں، سماج سدھار سیاسی بیداری اور آزادی کی پھسپھسی تحریکوں، کم علم ملایت، اردو تہذیب و ثقافت کے عروج و زوال، علمی اداروں، درسگاہوں اور مکتبوں کی کارکردگی کا نہایت باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔ اور اس جائزے میں عہدِ زوال اور عہد غلامی اور بعد کے دور کی عمومی صورت حال پیش نظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ہمارا زوال ابھی مکمل نہیں ہوا اور شاید ہم نے زوال میں ایک لذت تلاش کرلی ہے۔ انہوں نے ہمارے زوال پر، اس کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی اسباب کے ساتھ نظر ڈالی ہے اور اس کے اسباب کو زیر بحث لائے ہیں۔ وہ تو استعماری حاکمیت و محکومیت کے مابین تعلقات کی نوعیت سے پوری طرح آشنا ہیں، جس میں ان کی دانشورانہ فکر کارفرما نظر آتی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ انسانوں کی بہتری کے لیے کام کرنے والوں کا انجام ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ عموماً استحصال کرنے والے فریب کاروں کو آنکھوں میں جگہ دی جاتی ہے۔ کھلے لوٹنے والوں کو اپنا رہبر مانا جاتا ہے، اس لیے کہ ان کے پاس روپیہ ہے طاقت ہے اور استحصال کرنے والے سارے ذرائع اور ادارے ہیں۔ رضوی صاحب نے مقامی لسانی

اثرات، مسلم فکری پہچان اور علاقائی تہذیبوں اور اجتماعی امنگوں اور خوابوں سے ہم آہنگی کو اپنی تہذیب کی شناخت ٹھہرایا ہے۔ اسی تناظر میں، میں نے ایک بات جو خاص طور پر محسوس کی وہ یہ ہے کہ اطہر رضوی صاحب کی تاریخی اور تحقیقی حوالوں سے آنے والی اب تک کی چاروں کتابوں، یعنی: ہر ملک ملک ماست، خدا کے منتخب بندے، تاریخ کا سفر۔ بلکینیا سے بازنیا تک اور کون عبث بدنام ہوا، میں برصغیر کے رہنے والوں کی نفسیات کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی گئی۔ لیکن اپنی نئی کتاب، گر ہم برا نہ مانیں...... میں، انہوں نے اس حقیقت کو پیش نظر رکھا ہے کہ کسی بھی قوم یا معاشرے کو سمجھنے یا سمجھانے کے لیے اس کی نفسیات کو سمجھنا اور سمجھانا بہت ضروری ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی اس نئی کتاب میں، رضوی صاحب نے، جب جب اور جہاں جہاں، ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیبی اور معاشرتی قدروں اور رویوں کی بات کی ہے، ان قوموں کی نفسیات کو پیش نظر رکھا ہے، اور اپنی تمام تر خود اعتمادی و بے باکی کا مظاہرہ کیا ہے۔ جو ایک کامیاب قلم کار کی پہچان ہے۔ اس ضمن میں ایک بات کی نشاندہی کرتے ہوئے مجھے اچھا محسوس ہو رہا ہے، اور وہ یہ کہ رضوی صاحب نے جہاں سیاسی، سماجی، نظریاتی اور مذہبی تناظر میں ان شعبوں کے نام نہاد اور کم علم رہنماؤں کے پوری دلیری کے ساتھ بخیے ادھیڑے ہیں، وہاں اہلِ علم و فضل ہستیوں کو تمام تر کشادہ دلی کے ساتھ خراج تحسین بھی پیش کیا ہے۔

اب آتے ہیں کتاب کے مشتملات کی طرف...... بادی النظر سے دیکھنے پر تو، اطہر رضوی کی کتاب ''گر ہم برا نہ مانیں'' محض ہندوستان کی یاترا کا سفر نامہ یا رپورتاژ لگتی ہے۔ لیکن اگر آپ اسے اپنی فہم و ادراک کی رسائیوں کے ساتھ پڑھیں اور جائزہ لیں تو، رضوی صاحب نے، کھلے لفظوں اور بین السطور اشاروں میں، جن تاریخی حقائق، عالمی سیاسی اور سامراجی استحصال کا تجزیہ کیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ آج کے اس دور میں اور وہ بھی شمالی امریکہ میں بیٹھ کر، یہ سب کچھ کرنا، بڑی ہمت کی بات ہے۔ جس کی سب سے بڑی اور قریبی مثال

خود رضوی صاحب کی پچھلی کتاب ''کون عبث بدنام ہوا؟'' ہے۔ جو بشمول امریکہ دنیا کے کئی ممالک میں نہ جا سکی!!

اور شاید یہی صورت حال ان کی تازہ تصنیف کے ساتھ پیش آئے...... اور پاک و ہند کے ساتھ ساتھ مغربی دنیا کے کچھ تنگ دل اور تنگ نظر لوگ، اسے ہضم نہ کر پائیں۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ، یہی کسی تجزیاتی یا اصلاحی تخلیق یا تحریک کی کامیابی کی سند ہوتی ہے کہ جس جانب مصنف یا رہنما کا روئے سخن ہوتا ہے، اس جانب کے لوگ بدکنے لگتے ہیں۔ اور شاید یہی وجہ رہی ہوگی کہ، رضوی صاحب نے اپنی اس کتاب کا عنوان ''گر ہم برا نہ مانیں'' رکھا ہے۔ اب رضوی صاحب کی درخواست ''گر ہم برا نہ مانیں......'' کے باوجود لوگ برا مان جائیں! تو بھئی سچی بات تو کڑوی ہوتی ہی ہے۔ اور اس کڑوی گولی کو حلق سے اتارنا، منافقوں اور ہٹ دھرموں کے بس کی بات نہیں!!

اور ہمارے فاضل مصنف اطہر رضوی صاحب اس بات کو بخوبی جانتے اور سمجھتے ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی ہر تصنیف کی اشاعت کے بعد کچھ تنگ دل اور تنگ ذہن لوگوں کے منہ بنانے کے باوجود، ایک ثابت قدم ریفارمر کی طرح، ہر سال دو سال بعد اپنے مشن کی شاہراہ پر، اپنی نئی تصنیف کا سنگ میل نصب کر دیتے ہیں۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

———oooOOooo———

اطہر رضوی بحیثیت خاکہ نگار

ڈاکٹر سیفی سرونجی انڈیا

اطہر رضوی کنیڈا میں مقیم مشہور شاعر، ادیب، نقاد کی حیثیت سے اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں اور برسوں سے کنیڈا میں اردو زبان و ادب کے فروغ میں ایک نمایاں رول ادا کررہے ہیں۔ غالب اکیڈمی کے زیر اہتمام کئی عالمی مشاعرے اور طرحی نشستوں کا اہتمام ان کے تخلیقی کاموں میں کبھی رکاوٹ نہیں بنتے، ایک طرف اردو زبان و ادب کی خدمات تو دوسری طرف اپنے تخلیقی کاموں سے ادبی دنیا میں شہرت رکھنے والی شخصیت کا نام اطہر رضوی ہے، یوں تو انھوں نے ادب کی مختلف اصناف میں بہت کچھ لکھا ہے، ان کے تخلیقی کاموں کو ہر جگہ نہ صرف سراہا گیا ہے، بلکہ ان تحقیقی کتابوں کی اہمیت تسلیم کیا گیا ہے، اعتراف کیا گیا ہے، مثلاً! ''گرہم برانہ مانیں'' ''کون عبث بدنام ہوا'' ''خدا کے منتخب بندے'' جیسی کتابیں دنیا کے ادب میں اعلیٰ معیاری تحقیقی کتابیں تسلیم کی جاتی ہیں۔

گرہم برانہ مانیں، اطہر رضوی کا ایک ایسا سفر نامہ ہے جس میں ہندوستانی تہذیب کے ایسے نادر نمونے پیش کیے ہیں کہ ہر پڑھنے والے کو اپنی تہذیب پر فخر محسوس ہونے لگتا ہے یہ ایک سفر نامہ ہی نہیں بلکہ مختلف شہروں وہاں کے ادیبوں شاعروں اور کلچر کی تاریخ بھی ہے بلا شبہ اطہر رضوی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ہندوستان اور پاکستان کے سفر کی روداد کو ایک یادگار تاریخی حیثیت دے دی ہے جس سے ان کی قابلیت اور معلومات تو اجاگر ہوتی ہی ہے ساتھ ہی تمام پڑھنے والوں کے لیے بھی یہ ایک یادگار تحفہ ہوگیا ہے اطہر رضوی کی ادبی

خدمات کینیڈا میں بھی کم نہیں رہیں انہوں نے اردو کی نئی بستیوں میں جو علم و ادب کی شمع جلا رکھی ہے اب اس کی روشنی اطراف میں پھیلنے لگی ہے کینیڈا میں اکثر مشاعروں اور سیمیناروں کا انعقاد اور لوگوں کو اردو کی طرف توجہ دلانے ایک ساتھ مل بیٹھ کر اردو کی ترقی اور ترویج کے بارے میں اظہار خیال کرنے کے لیے اپنی ذاتی کوششوں سے ایک ایسا پلیٹ فارم تیار کرنا جس میں اردو زبان کی بقا اور اس کی ترقی کے تمام راستے ہموار کرتے ہیں۔ اطہر رضوی کی خدمات کا اعتراف ساری دنیا میں کیا جا رہا ہے۔ شان الحق حقی صاحب نے ان کے بارے میں صحیح لکھا ہے کہ:

''جناب اطہر رضوی ٹورانٹو میں ایک قطب کی حیثیت رکھتے ہیں ان کا مسکن جو غالب کدہ کے نام سے جانا جاتا ہے شایقین ادب کی زیارت گاہ ہے مگر ان کا اصلی رجحان اسکالرشپ کی طرف ہے انہوں نے دنیا کی بیشتر ممالک کے دورے کئے ہیں اور یہ سیر وسیاحت محض سیر و تماشا کے لیے نہیں مطالعہ اور مشاہدے کی غایت سے کی گئی نتیجہ کے طور پر ایسی پر از معلومات اور خرد افروز کتابیں ان کے قلم سے نکل چکی ہیں جنہوں نے اردو کے علمی سرمایہ میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔''

بلاشبہ اطہر رضوی صاحب کی کتاب گر ہم برا نہ مانیں بھی ایک ایسی ہی علمی معلوماتی کتاب ہے جو اردو ادب میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے یوں تو انہوں نے بے شمار سفر کیے ہیں اور ہر سفر کے نقوش یادداشتیں قلم بند کی ہیں لیکن یہ کتاب ان کے ایسے سفر کی داستان ہے جس میں پورے ایک عہد کی جھلکیاں نظر آئیں گی اردو کی نئی بستیوں کی مختصر اردو سے ابتدا کرنے کے بعد بھوپال شہر اقبال کی تہذیب اور ادبی پس منظر کو بیان کرتے ہوئے لکھنو، علی گڑھ، رام پور کی رضا لائبریری معمار پاکستان کے علاوہ ایک بہت ہی دلچسپ معلوماتی مضمون ہندوستانی جمہوریت اور مسلمان کے نام سے جس میں ہندوستانی مسلمانوں میں ترقی کے میدان میں پیچھے رہنے کی بہت سی وجوہات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بیچ بیچ میں کچھ یادگار رنگین

تصاویر بھی دی گئی ہیں جن سے کتاب کو اور بھی دلچسپ بنا دیا ہے عام طور پر ایسے سفر نامے یاد داشتیں معلومات کا خزانہ ضرور ہوتی ہیں لیکن بہت کم مصنف ایسے ہیں جو اپنی کتابوں میں دلچسپی برقرار رکھ سکیں لیکن اطہر رضوی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے پوری کتاب کو اتنا دلچسپ بنا دیا ہے کہ پڑھنے والے کی دلچسپی بھی برقرار رہتی ہے۔ اسے معلومات بھی ہوتی رہتی ہے اور وہ پورے سفر کا لطف اٹھانے کے ساتھ ساتھ اس میں آگے بڑھنے کی جستجو بڑھتی رہتی ہے دراصل یہ سب اس لیے ہے کہ اطہر رضوی ایک بہترین انشائیہ نگار بھی ہیں اس لیے ان کی نثر میں کہیں بوجھل الفاظ یا گنجلک تحریر کا شائبہ تک نہیں ہوتا بلکہ معلوماتی مضامین کو بھی وہ اپنی شگفتہ تحریر میں بیان کرتے ہیں کہ قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ اس کتاب میں کچھ شخصیت پر مضامین بھی ہیں جو اطہر رضوی کی علمی اور تحقیقی نظر کے غماز ہیں اور ان کے سیاسی تنقیدی شعور کا ثبوت ہیں۔

اطہر رضوی کی تازہ کتاب ''چہرے باتیں یادیں لوگ'' ان کی دیگر کتابوں سے نہ صرف مختلف ہے، بلکہ اس کتاب میں اطہر رضوی ایک ایسے زبردست محقق نقاد اور خاکہ نگار کی حیثیت سے اپنی پوری تخلیقی توانائیوں کے ساتھ سامنے آئے ہیں، اس کتاب میں خاکہ ہی نہیں ایک بڑے محقق ناقد کی پوری صلاحیتیں اجاگر ہوگئی ہیں، ''چہرے باتیں یادیں لوگ'' پڑھتے وقت اور پڑھنے کے بعد اپنے آپ میں ایک ایسی تبدیلی محسوس کرتا ہوں اور ایسا لگتا ہے کہ مجھے گھر بیٹھے دنیا بھر کی معلومات حاصل ہوگئی ہیں، اور ذہن پر ایک نہ ختم ہونیوالا خیالات کا سلسلہ جاری ہے، کہ اس میں ایسی شخصیات ہیں کہ جن سے میری بھی خط وکتابت رہی ہے، اور کچھ سے ملاقات بھی مثلاً گیان چند جین، سلطانہ مہر، ستیہ پال آنند، حقی صاحب، جب میں نے اطہر رضوی کے یہ خاکے نمایاں مضامین پڑھے تو ان شخصیات سے متعلق معلومات ہی نہیں ہوئی بلکہ اس کی شخصیت کا ایک ایک پہلو سامنے آگیا۔ مثلاً گیان چند پر بے شمار مضامین پڑھے ہیں اور جب سے ان متنازع کتاب ''ایک بھاشا دو لکھاوٹ دو ادب''

آئی ہے، ہر بڑے نقاد نے ان پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن جس نوعیت کا مضمون اطہر رضوی صاحب نے لکھا ہے ایسا مضمون آج تک پڑھنے میں نہیں آیا، سب سے پہلے یہ مضمون میں نے انتساب میں شائع کیا تو بے شمار خطوط اس مضمون سے متعلق آئے اور سب ہی نے اطہر رضوی کے اس مضمون کو نہ صرف بے حد پسند کیا، بلکہ اس بات کا اعتراف کیا کہ اس نوعیت کا مضمون ابھی تک گیان چند جین سے متعلق نہیں پڑھا تھا اس لیے کہ دوسرے نقادوں یا محقق حضرات نے یا تو جذبات میں آکر لکھا، یا غصہ میں یا تاریخی حوالوں سے گفتگو کی، مثلاً شمس الرحمٰن فاروقی کے مضمون سب سے زیادہ گونج ہے، کہ انھوں نے مدلل طور پر گیان چند جین کے جوابات دئے لیکن یہ بات بھی سب جانتے ہیں کہ یہ ردعمل کے طور پر وجود میں آیا ہے، خلیل بیگ صاحب نے دوسرے ڈھنگ سے، لیکن اطہر رضوی صاحب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے کہیں بھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ یہ مضمون ان کی بدنام زمانہ کتاب کا ردعمل ہے، یا یہ کہ وہ زبان سے متعلق کوئی بحث چھیڑنا چاہتے ہیں۔ بلکہ اطہر رضوی نے گیان چند کے ان خطوں اور ان سے ذاتی ملاقاتوں کے حوالے سے گیان چند جین کی پوری سوچ ان کی پوری ذہنیت اور خیالات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی نفسیات اور سوچ کی پوری گرہ کھول دی ہے، اور تعریف کی بات یہ ہے کہ اطہر رضوی صاحب نے کہیں بھی مضمون میں نہ تو ان پر تعصب کا الزام لگایا، نہ ان کی اردو دشمنی سے متعلق کوئی بات کہی، بلکہ انھیں کے خیالات کی روشنی میں فیصلہ قاری پر چھوڑ دیا ہے، اور سب کچھ بیان بھی کردیا ہے، اس مضمون میں جہاں ایک طرف گیان چند جین کی قابلیت علمیت اور زبان پر عبور حاصل ہونے کا ثبوت مہیا ہوتا ہے، وہیں دوسری طرف ان کی متعصبانہ ذہنیت بھی سامنے آجاتی ہے، ان کے ایک ایک لفظ سے ان کے اندر کا آدمی باہر آجاتا ہے، مضمون کی سب سے بڑی انفرادیت یہ ہے کہ اس معاملے میں مصنف نے کوئی رائے قائم نہیں کی لیکن الزام عائد نہیں کیا اور سارا معاملہ قاری کی عدالت میں پیش کردیا ہے، گیان چند جین کے وہ نجی اور ادبی خط جو اطہر رضوی کے نام ہیں صرف ان

خطوں کے حوالے سے ان خطوں کی روشنی میں اطہر رضوی صاحب نے گیان چند جین کی پوری شخصیت کو اس طرح اجاگر کر دیا ہے کہ کوئی پہلو تشنہ نہیں رہا، وہ اردو زبان سے کتنی محبت کرتے تھے لیکن مسلمانوں کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے، یہاں ساری بحث کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس مضمون کا آخری پیراگراف پیش کرتا ہوں جو ان کے آخری خط کے حوالے سے:

''یہ گیان چند صاحب کا آخری خط تھا جو انھوں نے اپنے ہندوستان اور پاکستان کے آخری دورے سے پہلے مجھے بھیجا تھا، اس کے بعد مہینوں بعد ان سے بذریعہ ٹیلی فون رابطہ رہا لیکن انھوں نے کبھی کسی گفتگو میں ''ایک بھاشا دو لکھاوٹ دو ادب'' کا ذکر نہیں کیا، یہ بات مجھے حتمی محسوس ہوئی ہے کہ اگر یہ کتاب واقعتاً ان کی اپنی تحریر ہے تو جس دوران مجھ سے ان کا برتاؤ انتہائی مخلصانہ تھا اور وہ مجھے بزرگانہ مشورے دیتے تھے، اس زمانے میں وہ اپنی کتاب کی تصنیف میں مشغول تھے، اس لیے کہ ۲۰۰۳ء تک میرا ان سے رابطہ رہا، پھر بھی مجھے بتایا گیا کہ وہ ٹیلی فون پر گفتگو کرنے کے قابل نہیں رہے، یہ مضمون میں ختم کر چکا تھا، کہ دفعتاً فون کی گھنٹی بجی، ٹیلی فون پر محترم گوپی چند نارنگ تھے میں نے انھیں مطلع کیا کہ میری نئی کتاب میں گیان چند جین صاحب پر ایک مضمون ہے جس میں ان کا ذکر بار بار آیا ہے، نارنگ صاحب نطق کے بادشاہ ہیں، کم از کم پینتالیس منٹ تک انھوں نے گیان چند اور ان کی کتاب کے تناظر میں معلومات فراہم کیں، بات کا خلاصہ یہ تھا کہ گیان چند کی ساری تخلیق مصنوعی ہیں، اور یہ کہ ان کی کتاب ان کی فکر کی صحیح صورت گری کرتی ہے۔''

اس کتاب کا پورا نچوڑ اطہر رضوی صاحب نے بیان کر دیا کہ گیان چند کی شخصیت واقعی ایک مصنوعی شخصیت رہی ہے، ان کے اکثر بیانات میں بھی تضاد پایا جاتا ہے، اطہر رضوی نے اپنی طرف سے کوئی فیصلہ صادر نہیں کیا بلکہ گیان چند کے خطوط کی روشنی میں ان کی شخصیت اور ان کی سوچ ان کی فکر تک رسائی حاصل کر کے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا یہ اطہر رضوی

کا ایک بہت بڑا کمال ہے، کہ انھوں نے کہیں بھی کوئی جذباتی جملہ نہیں لکھا، بلاشبہ اطہر رضوی ایک بڑے محقق خاکہ نگار ہیں، کہ انھوں نے اپنی تحریر میں مکمل ثبوت اور دلائل سے گفتگو کی ہے، کہیں بھی کسی بھی تحریر میں ہوا میں تیر نہیں چلایا، جیسا کہ آج کل اکثر ہمارے محقق حضرات کا رویہ رہا ہے، اطہر رضوی کا ایک بڑا کمال یہ ہے کہ تحقیقی مضامین بھی جو دلچسپ نہیں ہوتے، لیکن اطہر رضوی نے اس نازک اور مشکل موضوعات میں بھی اپنی منفرد نثر سے دلچسپی پیدا کردی ہے، تحقیق اور تخلیق میں زمین و آسمان کا فرق ہے، ایک اچھا محقق بڑا تخلیق کار بہت مشکل سے ہوتا ہے، لیکن دنیائے ادب میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جن کی نثر تخلیقی نثر ہوتی ہے، ان میں ایک نمایاں نام اطہر رضوی کا ہے، ادب میں ہمیشہ وہی تخلیق کار بڑا ہوا ہے، جس میں رسک اٹھانے کی ہمت ہو، جس میں نیا کچھ کرنے اور خود پر اعتماد کا جذبہ ہو، اور یہ ہمت، جذبہ اور خود اعتمادی اطہر رضوی میں بدرجہ اتم موجود ہے، کہ انھوں نے اپنی تازہ کتاب ''چہرے باتیں یادیں لوگ'' میں جو خاکے پیش کئے ہیں، وہ بھرپور اعتماد سے ساتھ یہ کہہ کر کہ:

''یہ کتاب میری شخصی یادوں ذاتی تجربوں اور میرے حافظے کی ساغاتوں کا مجموعہ ہے، اس میں پیش کی ہوئی میری نگارشات خاکے ہیں یا تذکرے مضامین ہیں، یا کوائف میرے نزدیک اس کی تقویم غیر ضروری ہے۔''

اطہر رضوی صاحب کے اس بیان سے ان کی تحریروں یا خاکوں سے متعلق ایک بات ذہن میں آتی ہے، کہ رشید احمد صدیقی ایک بہترین انشائیہ نگار تسلیم کیے جاتے ہیں، محمد حسن آزاد تذکرہ نگاری اور حالی کی مقدمہ شعر و شاعری تنقیدی اہم کتاب ہے جب کہ مذکورہ تینوں کتابیں فنی اعتبار سے کمزور ہیں، اب تنقید کا معیار دیکھئے انشائیہ کے فن پر نظر ڈالئے یا تذکرہ نویسی کو دیکھئے، لیکن ان تمام باتوں اور فنی عروج کے بعد بھی ان کی مقبولیت میں ذرا بھی کمی نہیں آئی، بلکہ ہمیشہ ادب کے لیے سنگ میل کی حیثیت سے ہی جانی جاتی رہیں گی، یہ صرف اس لیے کہ انھوں نے اپنی ہر تحریر میں بقول ان کے یہ خاکے ہیں، مضامین ہیں یا انشائیے ہیں

اس کا فیصلہ تو وقت کرے گا، لیکن سچائی یہ ہے کہ یہ انفرادیت تو ان کی تحریروں کی جان ہے، عام طور پر انشائیوں یا خاکوں میں تحقیقی یا معلوماتی باتیں کم ہوتی ہیں۔ لیکن اطہر رضوی صاحب نے اپنے ہر مضمون میں نہ صرف دلچسپی برقرار رکھی ہے، بلکہ معلومات بھی فراہم کی ہیں، مثلاً جب وہ برطانیہ میں مقیم سلطانہ مہر کی شخصیت پر لکھتے ہیں، تو دنیا کی تمام مشہور خواتین کے نہ صرف نام گنوادیتے ہیں، بلکہ ان کے کارنامے بھی بیان کردیتے ہیں:

"سلطانہ مہر کے ضمن میں جب میں نے ایک تحریر قلم بند کرنے کا ارادہ کیا تو پہلے بڑی دیر تک سوچتا رہا، اور یہ میری دراصل ایک عادت ہے، اکرام بھائی کہتے ہیں، جو آدمی پڑھتا نہیں ہے وہ لکھ نہیں سکتا، اور میں جب تک مضمون کے تعلق سے از تحریر سلطانہ سوچوں اپنے قلم کو قرطاس تک پہنچنے کی زحمت نہیں دیتا۔

سب سے پہلے متحرک فعال اور باکمال خواتین میرے ذہن میں آئیں، ایران کی جہادی خاتون شیریں عبادی جنھوں نے اپنے ملک میں بیٹھ کر انتہا پسند ملاؤں سے جنگ کی اور ایشیا کی پہلی مسلمان خاتون کی حیثیت سے امن کا نوبل پرائز حاصل کیا، ترکی کی عظیم محققہ الف شفق، جنھوں نے استنبول کا حرامی بچہ The Bestered of Istanbol لکھ کر ترکی میں سوچنے اور سمجھنے والے اذہان میں اسلام کے تعلق سے ایک نئی لہر پیدا کردی ہے۔ اور پاکستان کی ڈاکٹر عائشہ صدیقہ جن کی معرکتہ الآرا تحقیقی تصنیف Military. inc جس کی آٹھ الفاظ پر مشتمل ایک سطر Every Country has Army, Arm has a Country پاکستان کی تاریخ پر لکھی جانے والی سینکڑوں کتابوں سے بلند اور اہم تر ہے۔"

اطہر رضوی کے اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اطہر رضوی صرف ایک اچھے خاکہ نگار نہیں بلکہ محقق تاریخ داں بھی ہیں، کہ وہ جب بھی کسی کی شخصیت پر لکھتے ہیں، تو نہ صرف اس کی پوری شخصیت کا خاکہ کھینچتے ہیں، بلکہ کئی اور نامور شخصیات کے بارے میں بھی ڈھیر ساری معلومات فراہم کردیتے ہیں، یہی انھوں نے سلطانہ مہر کی شخصیت پر لکھتے ہوئے

کیا اور ہمیں دنیا کی ان تمام اہم نامور خواتین کی تفصیلات فراہم کردیں اور ان کے کارنامے بھی بتادیئے کہ پاکستان کی مشہور خاتون ڈاکٹر عائشہ صدیقہ کون تھیں، انھوں نے کون سی کتاب لکھی تھی، اور ترکی کی خاتون الف شفق ایران کی شیریں عبادی وغیرہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خاکہ نگار تو بہت سے ہیں، لیکن ایسے کتنے خاکہ نگار ہیں جو اپنی تحریروں میں معلومات کا خزانہ بھی بھر دیں، اور پھر تحریر میں اتنی دلچسپی بھی برقرار رکھیں، یہ کمال اطہر رضوی صاحب کو حاصل ہے کہ ان کی ہر تحریر کو قاری نہ صرف ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھتا ہے، بلکہ اپنی معلومات میں اضافہ بھی کرتا ہے، اور اس سے محظوظ بھی ہوتا ہے، دنیا کی سیر بھی کرتا ہے اپنے ذہن کو جلا بھی بخشتا ہے، ''چہرے باتیں یادیں لوگ'' ایک ایسی ہی کتاب ہے، جس میں مختلف شخصیات کے بہت ہی دلچسپ اور معلومات سے بھرپور خاکے موجود ہیں، عالی صاحب ستیہ پال آنند، سلطانہ مہر، حمایت علی شاعر، موہن شرما، الیکزنڈر پشکن، وغیرہ، یوں تو سارے مضامین ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ لیکن جس طرح ایک خاکہ نگار ان شخصیات سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے، ان خاکوں میں تب ہی زیادہ لطف آتا ہے، جب وہ بھی ان شخصیات کے ادبی مرتبے ان کی عادات و اطوار سے واقف ہو، دوسری صورت میں اس کی معلومات میں اضافہ ضرور ہوتا ہے، لیکن اس کا لطف دوبالا جب ہوجاتا ہے جب وہ بھی ان سے اچھی طرح واقف ہو، کیوں کہ کچھ شخصیات سے میرا بھی نہ صرف واسطہ رہا ہے، بلکہ ملاقاتیں بھی ہوئی ہیں، خط وکتابت بھی رہی ہے، سلطانہ مہر حقی صاحب، ستیہ پال آنند، گیان چند جین وغیرہ اس لیے میں ان شخصیات سے پہلے ہی نہ صرف متعارف تھا بلکہ اچھی طرح ان کے نظریات ان کے علمی مرتبے کا بھی معترف تھا، اطہر رضوی صاحب کے مضامین پڑھ کر اور بھی متاثر ہوا، آج سلطانہ مہر، ستیہ پال آنند، گیان چند، عالی صاحب، حقی صاحب کے علمی مرتبہ سے کون واقف نہیں ہے، لیکن اطہر رضوی نے ان کے ذاتی گوشوں پر روشنی ڈال کر انہیں اتنے قریب کردیا کہ اب دل ودماغ سے یہ شخصیات کبھی محو نہیں ہوسکتیں، اس کے علاوہ اس کتاب میں ایک

بہت ہی منفرد اور معلوماتی مضمون منموہن شرما صاحب کی شخصیت پر ہے، جسے پڑھ کر کوئی بھی شخص جس نے اردو کے عشق میں اپنی مصروف ترین زندگی سے ایک ایک پل کا استعمال ایسا کیا کہ فارسی زبان تک سیکھ لی، منموہن شرما صاحب کی زندگی کے بارے میں پڑھ کر ہم اردو والوں کو بہت عبرت حاصل ہوتی ہے، اس مضمون میں انھوں نے جہاں ایک طرف من موہن شرما صاحب کی علم دوستی ،ادب دوستی اور ان کی شخصیت کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے وہیں دوسری طرف اس مضمون میں ان سے گفتگو کی گئی ہے وہ بہت معلوماتی ہے سیاست ادب مسلم معاشرہ فرقہ واریت جیسے موضوع پر جب منموہن شرما گفتگو کرتے ہیں تو گویا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علم کا ایک دریا بہہ رہا ہے، اس مضمون میں کیا نہیں ہے، یہ لکھنے والے کا کمال ہے کہ وہ لکھتے لکھتے شخصیت سے ہٹ کر گفتگو کرتے ہیں۔

''لندن کا گارجین (Gardian) اخبار میری نظر میں دنیا کا اہم ترین اخبار ہے۔ حال ہی میں میں نے اٹلی جرمنی اور آسٹریلیا کا سفر کیا، میں دنیا کے کسی شہر میں رات گزاروں بغیر کچھ پڑھے سو نہیں سکتا۔ رام برلن ویانا اور سالرگ میں میں نے ہر روز گارجین یا ہیرالڈ ٹریبون خریدا، ہمارے ڈالر کے حساب سے ایک اخبار ساڑھے پانچ ڈالر کا خریدا، یورپ کے یورو نے شمالی امریکہ کے سیاحوں کی جیبوں کو بہت متاثر کیا ہے، بہر حال گارجین میں اس مختصر عرصے میں وہ چیزیں پڑھنے کو ملیں، جو ٹورانٹو کے اخباروں میں کبھی کبھی نظر آتی ہیں، اس میں راما چند گویا کی دنای کی عظیم ترین جمہوریت کی تاریخ The history of wrold largest democracy کے اہم اور بنیادی مقدمات اور تفصیلات پڑھنے کا موقع ملا، گویا نے اپنی کتاب میں مسلمانوں کی ساٹھ سالہ مظلومیت کا ذمے دار جواہر لال نہرو کو بتایا، جنھوں نے ہندوستان کے منشور میں اقلیتوں کے تحفظ اور مساوی حقوق کے دفعات کو شامل نہ کر کے ان کے ساتھ مستقل بے انصافی کی بنیاد ڈالی۔''

اس اقتباس سے ہمیں دو اہم باتیں معلوم ہوئیں ، ایک یہ کہ دنیا کا عظیم ترین اخبار

گارڈین ہے دوسرے یہ کہ گویا نے اپنی کتاب میں مسلمانوں کی ساٹھ سالہ مظلومیت کا ذمہ دار جواہر لال نہرو کو ٹھہرایا کہ جنھوں نے ہندوستان کے منشور میں اقلیتوں کے تحفظ کے لیے کوئی قانون نہیں بنایا، کسی بھی خاکے یا انشائیے نما مضمون میں ایسی علمی معلومات کو باتوں باتوں میں قاری کے ذہن میں سمو دینا کوئی آسان کام نہیں ہے، اطہر رضوی کا یہی سب سے بڑا کمال ہے کہ انھوں نے ایک ایسی لطیف نثر کی بنیاد ڈالی کہ پڑھنے والے اس سحر میں نہ صرف کھوتے گئے بلکہ اپنی معلومات میں اضافہ بھی کرتے رہے، ایسی خوبصورت نثر میں پڑھ کر اس کی داد نہ دینا اور اعتراف نہ کرنا بہت بڑی بے ایمانی ہوگی، بقول حضرت علیؓ کے کہ "شخص توصیف کا مستحق ہے اس کی پذیرائی نہ کرنا، اس کے ساتھ زیادتی کرنے کے مترادف ہے۔"

بلاشبہ اطہر رضوی ساری ادبی دنیا کی پذیرائی کے نہ صرف مستحق ہیں، بلکہ بحیثیت خاکہ نگار وہ ایک بلند مرتبہ پر فائز ہیں، جس کا اعتراف کیا جا رہا ہے اور ہونا چاہیے۔

اطہر رضوی کی باتیں یادیں......

پروفیسر علی احمد فاطمی، الہ آباد، انڈیا

اطہر رضوی کے نام اور کام سے میں پوری طرح سے واقف تو نہیں تاہم ٹورنٹو (کینیڈا) میں کئی ملاقاتوں اور کئی کتابوں کے ذریعہ اتنا ضرور علم ہوا کہ بڑے کام کے آدمی ہیں۔ عالم باعمل ہیں، دیارِ غیر میں ایسے لوگ جو اپنی زبان و تہذیب سے فکری ہی نہیں جذباتی رشتہ رکھتے ہیں اور اس کے لیے علم اور عمل دونوں حوالوں سے جی توڑ کام کرتے ہیں ان میں اطہر رضوی کا نام بیحد اہم ہے۔ کئی گراں قدر کتابیں تو تصنیف کی ہی ہیں کئی بڑے پروگرام سیمینار مشاعرے وغیرہ بھی منعقد کیے اور کروائے ہیں جن کی مغرب میں بڑی دھوم ہے اور ضرورت بھی۔ اطہر رضوی اصلاً ہندوستان کے شہر اورنگ آباد کے ہیں اور ہم سب جانتے ہیں کہ اردو زبان، تہذیب اور تاریخ کے تعلق سے اورنگ آباد کی کیا اہمیت وحیثیت ہے۔ اورنگ آباد کی شعری وادبی محفلوں میں ان کا خمیر وضمیر بیدار ہوا اور وہ رضوی سے باغی ہوئے لیکن پھر جلد ہی پاکستان وطن ثانی ٹھہرا۔ اس کے بعد مغرب یعنی لندن اور اب کینیڈا اس درمیان اور بھی نہ جانے کہاں کہاں اور مغرب بقول مصنف۔ ”میری عمر مغرب کے بازاروں میں کٹی ہے مگر روح بہت سادہ اور بہت مشرقی ہے اور بہت اسلامی ہے۔“

اور یہ سچ ہے کہ اب تک کہ راقم الحروف نے ان کی صرف دو کتابیں پڑھی ہیں (باقی صرف دیکھی ہیں) چہرے باتیں یادیں لوگ اور گر ہم برا نہ مانیں ___ ان دونوں کتابوں میں صاف ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مغرب میں دہائیاں گذارنے اور تمام طرح کی مادی آسائشوں

کے باوجود وطن اور تہذیب اُن سے جدا نہیں ہوئے ہیں اور وہی انھیں کام کرنے پر مجبور کیے ہوئے ہیں۔ ویسے کام کرنے کا ان کا اپنا جذبہ بھی ہے فطری اور طبعی ورنہ اور لوگ بھی ہیں جو اپنے وطن کو بھولے نہیں ہیں لیکن اطہر رضوی کی طرح یادگار کام کرنے کی نہ سکت رکھتے ہیں نہ جذبہ۔

اطہر رضوی کے غیر معمولی و یادگار کاموں کے پیش نظر ضروری تو یہ ہو گیا ہے کہ اب ان کے مکمل کاموں اور تحریروں کا جائزہ لیا جائے لیکن وقت کی تنگی اور مواد کی کمی کی وجہ سے میں اس وقت ان کی صرف ایک کتاب چہرے باتیں یادیں لوگ پڑھی چند باتیں عرض کرسکوں گا۔

یہ کتاب بقول مصنف — ''میری شخصی یادوں۔ ذاتی تجربوں اور میرے حافظے کی سوغات کا مجموعہ ہے۔ اس میں پیش کی ہوئی میری نگارشات خاکے ہیں یا تذکرے۔ مضامین ہیں یا کوائف۔ میرے نزدیک اس کی تقویم ضروری نہیں ہے۔''

یہ بالکل سچ کہا ہے کہ کسی کتاب یا موضوع کی خانہ بندی یا درجہ بندی بہت مناسب نہیں ہوا کرتی۔ اردو میں نہ جانے کتنی عمدہ اور یادگار کتابیں ایسی ہیں جو بیحد اہم ہیں اور تاریخی حیثیت کی حامل ہیں لیکن انھیں کس خانے میں رکھا جائے یہ طے کرپانا مشکل ہے مثلاً آب حیات۔ روشنائی۔ لکھنؤ کی پانچ راتیں وغیرہ اب اسی صف میں یہ کتاب بھی شامل ہوگئی ہے کہ اس کا کوئی مخصوص و مشروط نام دے پانا مشکل ہے کیوں کہ اس میں چہرے ہیں باتیں بھی اور یادیں بھی اس لیے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے کہ کتاب تو قرات اور شرکت کا نام ہے۔

اتفاق سے میں خود بھی علمی سے زیادہ عملی (Acti vist) انسان ہوا اور کارل مارکس کے اس خیال کا قائل کہ عمل کے بغیر علم ایک بانجھ عورت ہوا کرتا ہے جس سے تخلیق کی امید نہیں کی جاسکتی۔ میں نے تنقیدی کتابوں کے علاوہ سفرنامے اور رپورتاژ بھی لکھے ہیں۔ کچھ خاکے بھی۔ کہیں کہیں رپورتاژ اور سفرنامے گڈمڈ ہوگئے ہیں لیکن میں نے اس کی کبھی پروا نہیں کی اور دلچسپ بات ہے کہ میری تنقیدی کتابوں سے زیادہ میرے سفرنامے اور رپورتاژ مقبول

ہوئے ہیں۔ اپنے بارے میں یہ غیر ضروری بات اس لیے چھیڑنی پڑی کہ ظاہر کرسکوں اور سمجھ سکوں کہ اصلاً اطہر رضوی کا درد کیا ہے اور مقصد تحریر کیا ہے۔ ان مضامین میں یہ درد مختلف روپ میں نظر آتے ہیں۔ وطن چھوٹنے کا درد۔ اردو زبان وتہذیب کے منتقل ہونے کا درد۔ مغرب میں اردو کا چراغ روشن کرنے کا درد اور سب سے بڑا درد اردو والوں کی بے رحمی اور کہیں کہیں بے ضمیری اور بے غیرتی کا ہے۔

اس کتاب کا پہلا مضمون ممتاز شاعر اور کالم نویس جمیل الدین عالی سے متعلق ہے۔ عالی صاحب کی شاعری۔ دوہے وغیرہ پر تو باتیں کی ہیں اس سے زیادہ ان کی شاعرانہ شخصیت اور اس سے زیادہ وہ باتیں جو گفتنی سے زیادہ ناگفتنی ہیں لیکن ایسے مضامین میں ناگفتنی کی گنجائش ہوا کرتی ہے لیکن یہ کتاب مصنف کی نیت اور ہنر پر مبنی ہے کہ وہ ناگفتنی کو فنکارانہ و مفکرانہ دونوں سطح پر گفتنی بنادے اور اطہر رضوی جا بجا ایسا کر گئے ہیں اس سے زیادہ یہ بات متاثر کرتی ہے کہ اس میں ان کے اپنے مشاہدات و تجربات، درد اور کسک ہیں جو معلوم ودلنشیں حقیقت بن کر صفحہ قرطاس پر بکھر گئے ہیں اور ایسے خوبصورت اور معنی خیز جملے قلمبند ہو گئے ہیں۔

> ''ایسا لگتا ہے کہ جیسے عالی صاحب کی نمائشی شاعری اور اعلیٰ شخصیت
> کے مابین جو جنگ ہے وہ سخن سنجے ہوتے ہوئے بھی کبھی کبھی Surrealistic
> ہوجاتا ہے۔''

یہ درد ان کے ایک اور مضمون جس کا تعلق حمایت علی شاعر سے ہے اس میں بھی نظر آتا ہے۔ حمایت علی شاعر ان کے ہم وطن بھی ہیں اور وہ انھیں بچپن سے جانتے ہیں ان کے بارے میں دو متضاد رائیں ہیں۔ ایک رائے تو یہ ہے۔

> ''حقیقت یہ ہے کہ حمایت سے زیادہ محنتی۔ خود محرک، خود ساز، کثیر زا
> اور Rolific فنکار مجھے برصغیر کی ادبی دنیا میں بہت کم نظر آتے ہیں۔''

اور ایک رائے یہ بھی۔

''حمایت علی شاعر ''ہر فن مولا'' ضرور کہلائے لیکن دانشور نہیں بن سکے۔''

حمایت صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے مداحوں یا Proteges کو نہایت خوبی سے استعمال کرتے ہیں۔ وہ صوری اور معنوی ہر لحاظ سے ابن الوقت ہیں۔''

بظاہر یہ جملے سخت اور ناروا ہیں لیکن ان کے اندر جھانکئے تو ان میں ایک مجروح قسم کا درد نظر آئے گا جو اکثر ذاتی نوعیت کا ہے لیکن اس سے زیادہ اجتماعی اور تہذیبی ہے۔ ہر دور میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں ہر دور میں ایسے لوگ گذرے ہیں جنھوں نے کساد بازاری اور ابن الوقتی کے ماحول کو پروان چڑھایا ہے اور لوگوں کو صرف استعمال ہی نہیں گمراہ بھی کیا ہے اور یہ آج بھی ہو رہا ہے۔ آج رضوی صاحب جن کے مداحوں میں ہیں ان میں سے بعض کی بھی یہی کیفیت ہے۔ جب ان کو یہ نظر آئے گا اور ذاتی تجربہ کا حصہ بنے گا تو وہ ان پر بھی لکھیں گے کیوں کہ رضوی کو آج ہر ایک بڑا معصوم سا نظر آتا ہے اور یہ مسئلہ صرف رضوی صاحب کا نہیں ہے بلکہ ہر اس معصوم اور سچے انسان کا ہوا کرتا ہے جو ہر چیز کو پہلی نظر میں خلوص اور سچائی سے لیا کرتا ہے لیکن جیسے جیسے پرتیں کھلتی ہیں جہتیں سامنے آتی ہیں۔ مطلع صاف ہوتا جاتا ہے اور پھر قلم اور ذہن یوں سچائیاں اُگلتا ہے جیسے دن کے سورج کی دھار دار کرنیں۔ ان کی شدت اور حدت۔ اچھی بات یہی ہے کہ ان مضامین کی صداقت اور جرأت ایک نئے وژن کا پتہ دیتی ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ مجھے ان مضامین سے زیادہ وہ مضامین پسند آتے ہیں جن میں اطہر رضوی ذات کے دائرے سے نکل کر حیات و کائنات کے دائرے میں آگئے ہیں۔ ستیہ پال آنند، شان الحق حقی اور نسیم سید کی علمی اور شاعرانہ شخصیت کے بارے میں لکھے ہوئے ان کے مضامین غیر معمولی ہیں۔ ان کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ میری نظر میں ستیہ پال آنند

ایک مشکل اور پیچیدہ شاعر ہیں۔ پہلے ان کی شخصیت کو سمجھنا پھر ان کی شاعری کو سمجھنا اس کے بعد یہ رائے قائم کرنا آسان نہیں۔

"ستیہ پال آنند کے دل میں آفاقیت سمائی ہوئی ہے ان کے ذہن میں ارض وسما کی ساری کیفیت کارفرما ہیں۔ان کی فکر میں ایک طرف دیومالائی اساطیر سے پیوستگی اجاگر ہے۔ پھر ساتھ ساتھ یونانی اطالوی، بازنطینی،(Epice Legensis) داستانوں کی صورت گری ہے۔"

رضوی صاحب نے تفصیل میں جاکر جس طرح سے ان کی شاعری کی شرح وبسط کی ہے وہ قابل قبول ہی نہیں بلکہ منطقی اُمس سے زیادہ دلکشی سے پُر ہے۔ اسی طرح نسیم سید کی شاعری اور اس سے زیادہ ان کی تانیثت کو قریب سے سمجھ کر جس طرح سے ان کی شاعری کا تجزیہ کیا ہے وہ لطف دیتا ہے۔ نسیم سید کے ساتھ فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید وغیرہ کا تجزیہ کیا ہے وہ بھی بیحد معنی خیز ہے۔ البتہ حقی صاحب اور اکرام صاحب کے بارے میں لکھتے ہوئے کبھی کبھی معروضیت سے زیادہ عقیدت کام کرتی دکھائی دیتی ہے کچھ تو یہ اکابرین ہی نہایت قابل احترام ہیں کچھ رضوی صاحب کی تہذیب نفس کی مجبوریاں ہیں۔ ان حضرات کا علم۔ عمر اور بے نیازی وقلندری بڑے بڑوں کو عقیدت سے پُر ہونے پر مجبور کردیتا ہے۔ تاہم ایسے جملے غور طلب ہیں اور شاید بحث طلب بھی۔

"حقی صاحب کے ہم پلہ اور ہم مرتبہ کوئی اور ہمہ گیر اور ہمہ دان شخصیت اردو تہذیب میں پیدا نہیں ہوئی۔"

گفتگو کا ایک رخ اور — سلطانہ مہر کا حقی صاحب سے یہ سوال۔

"اردو شاعری کی تاریخ میں بے شمار ہندوؤں اور سکھوں نے حمد نعتیں، سلام، قصیدے اور مرثیے تک لکھے کیا مجھے آپ اس بات کی وجہ بتاسکتے ہیں کہ ہمارے مسلمان شعراء نے چند مثنویات کے ماسوا ہندو پیغمبروں

، بدھا کرشن رام وغیرہ کے لیے کبھی کچھ کیوں نہیں لکھا؟'' حقی صاحب مسکرائے اور کہا۔۔۔ مسلمان ہمیشہ سے عصبیت کا شکار رہے ہیں۔ کسی اور مذہب کے لیے اچھے کلمے استعمال کرنا ان کے دائرہ فکر سے باہر ہے۔''

حقی صاحب کی بات تلخ ضرور ہے اور شاید مبنی بر حقیقت لیکن مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ عام مسلمان کی سوچ اور مسلم شعراء بالخصوص صوفی شعراء کی سوچ خاصی مختلف ہے۔ میرا ناقص خیال ہے کہ قدیم اور کلاسیکی شعراء سے لے کر ترقی پسند شعراء تک جتنی شاعری ہندو دیوی دیوتاؤں، عمارتوں اور تیوہاروں پر اردو زبان میں ہوئی ہے۔ شاید ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں نہیں۔ خود نظیر اکبرآبادی کا کلیات ملاحظہ کیجیے صرف گیارہ نظمیں تو ہولی پر ہیں اس کے علاوہ دیوالی، جنم اشٹمی۔ کرشن کنہیا۔ رام۔ نانک اور نہ جانے کیا کیا اس کے برعکس نظیر کے یہاں عید شب برات وغیرہ پر نظمیں کم ہیں۔ حالی، آزاد، چکبست، اقبال تک چلے آیئے امام ہند کے عنوان سے اقبال کی نظم غیر معمولی شہرت رکھتی ہے جب کہ وہ شاعر اسلام یا مفکر اسلام کہلاتے ہیں۔ ترقی پسند شعراء نے ہندو و ہندوستان پر جتنی نظمیں کہی ہیں ان کا شمار و وقطار ممکن نہیں۔ جان نثار اختر نے دو جلدوں میں ایسی نظموں کو ترتیب دیا ہے پھر بھی وہ انتخاب ہے کلیات نہیں۔ نیا ادب اور سبط حسن نے بھی ایک بڑا انتخاب کیا تھا۔ پاکستان میں بھی ایسے انتخابات اور کتابیں منظر عام پر آئی ہیں جو اس بات کو غلط ثابت کرتی ہیں۔ اس کے برعکس ہندی ادب یا دیگر غیر اردو ادب کو ملاحظہ کیجیے کہ وہاں عید یا حضرت محمد وغیرہ پر کتنی اہم نظمیں ملتی ہیں۔ ان سب باتوں کے ذکر کا مطلب کسی کو متعصب یا تنگ نظر ثابت کرنا نہیں ہے بلکہ صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اردو کا کردار سیکولر رہا ہے مشترکہ تہذیب سے پر رہا ہے اور یہ ایک زندہ اور بڑی حقیقت ہے۔

ایسے میں سلطانہ مہر کا یہ سوال ہی بے معنی اور غیر ضروری سا لگتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ سوال ہوگا تو جواب بھی ہوگا لیکن حقی صاحب کے جواب میں بہر حال ایک سچائی تو ہے خوکا

زاویہ مختلف ہی کیوں نہ ہو۔ تاہم حقی صاحب کی جرأت اور استقامت داد تو دینی ہی چاہیے اور رضوی صاحب نے دی اور ان کا اصل مقصد بھی یہی ہے۔

اسی طرح ایک گفتگو تاریخ اور ناول یعنی تاریخی فکشن کو لے کر ہے جو عمدہ ہے اور غور طلب بھی چونکہ میں نے عبدالحلیم شرر کے تاریخی ناولوں پر ہی ڈی فل کیا ہے اس لیے بحث کو آگے تک بڑھا سکتا ہوں جس کی یہاں چنداں ضرورت نہیں پھر بھی یہ ساری باتیں علمی ہیں ور اطلاعاتی بھی۔

گیان چند جین اور دوسرے مضامین بھی دلچسپ ہیں جو لطف دیتے ہیں۔ جین صاحب کی متنازعہ فیہ کتاب کو انھوں نے جس طرح دنیا کی بدنام ترین کتابوں میں شامل کیا ہے وہ بھی دلچسپ ہے۔ اس پوری بحث جس انداز سے رائے زنی کی ہے اور مختلف واقعات اور خطوط کے ذریعہ ان کے مزاج۔ سادگی اور نادانی کو ملا جلا کر جو تصویر بنائی ہے وہ سادی سی تو ہے لیکن مضحکہ خیز بھی ایک جگہ اطہر رضوی لکھتے ہیں — ''دو پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ کشمیر، حیدرآباد لکھنؤ اور بھوپال کی جامعات میں بہ حیثیت پروفیسر خدمات انجام دیتے ہیں۔'' جین صاحب پی ایچ ڈی اور ڈلٹ تھے اس کے علاوہ انھوں نے لکھنؤ میں کبھی نہیں پڑھایا۔ بلکہ احمد آباد میں وہ پروفیسر اور صدر شعبہ اردو رہے۔ وہ احمد آباد یونیورسٹی کے ہی طالبعلم تھے۔ یہ باتیں بہت اہم نہیں ہیں۔ بر سبیل تذکرہ آ گئیں۔

ان مضامین کو لکھتے ہوئے بعض مقامات پر بڑے دلچسپ، معنی خیز اور فکر انگیز فقرے نکل گئے ہیں جو اطہر رضوی کی خلاقیت و فنکاریت کا پتہ دیتے ہیں۔ مثلاً۔

> ''مشاعرہ ہماری ثقافتی جمالیات اور لسانی سوغات کا تاج محل ہے۔''
>
> ''اردو شاعری کی غزل میں جو ندرت اور انفرادیت ہے اس کا نعم البدل مغربی زبان میں نہیں ہے۔'' ''مجھے شیعیت اور مظلومیت ایک ہی تصور کے دو نام محسوس ہوتے ہیں۔''

''مطلب پرستی لابی ازم کی پروردہ ہوتی ہے اور برصغیر ادبی لابیوں کی آماجگاہ ہے۔''

علی سردار جعفری کے بارے میں یہ رائے دیکھئے۔

''علی سردار جعفری جنہیں اقبال کے بعد برصغیر کا حقیقی دانشور مانتا ہوں۔''

اور حقی صاحب کا یہ جملہ ـــ ''سستی چیزیں آواز لگا کر بیچی جاتی ہیں۔ ہیرے جواہرات کو پھیری والے نہیں بیچتے۔'' غرضیکہ دوسروں کے کم اور اپنے کے زیادہ دلچسپ و تخلیقی جملوں اور تنقیدی رویوں و نظریوں سے سجی یہ کتاب اپنے آپ میں پڑھی جانے والی غیر معمولی کیفیت رکھتی ہے۔ اکثر دوستوں کا محبتوں سے ذکر ہے اور خوب ہے اور کہیں کہیں تلخیوں اور حقیقتوں کا ــــ صاف گوئی کے ساتھ۔ معنی خیز پیرایے میں۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں اورنگ آباد ہے۔ تو اسلام آباد بھی۔ لندن ہے تو ٹورنٹو بھی۔ ہندوپاک کے ادیب ہیں تو شاعر بھی اور شاعرات بھی۔ سبک سی وطن دوستی ہے تو گراں سی اردو دوستی، جو بیحد قیمتی ہے اور جس کی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے ــــ ان سب کے پیچھے اطہر رضوی کے اپنے جذبات مشاہدات اور تجربات تو ہیں ہی لیکن مطالعہ بھی ہے اور نظریہ بھی ــــ لیکن ان سب پر حاوی ہے ان کا اپنا مخصوص۔ دلچسپ اور دلکش پیرایہ بیان ــــ جو کتاب کو شروع سے لے کر آخر تک پڑھا لے جاتا ہے ــــ اس دور میں جہاں ثقیل قسم کی بوجھل تنقید اور غیر معیاری اور غیر دلچسپ مضامین نے قرات کی دلکشی و دلچسپی کو بری طرح متاثر کیا ہے ایسے میں اس نوع کی کتابوں کی اشاعت اور قرأت ہمیں ایک ایسے دور میں لے جاتی ہے جہاں ہم ہوں اور ایسی کتابیں ہوں کہ قاری بس پڑھتا رہے اور لطف لیتا رہے۔ اس دلچسپ و بے باک کتاب لکھنے پر میں اطہر رضوی کو مبارک باد دیتا ہوں۔

ــــ oooOooo ــــ

چہرے باتیں یادیں لوگ

جمیل الدین عالی، کراچی، پاکستان

یہ کتاب نہ صرف مذکورہ شخصیات کے بارے میں معلومات کے حوالے سے ایک بھرپور کتاب ہے بلکہ اندازِ تحریر کی دل کشی اور اس میں قدم قدم پر منہ سے بولتی ہوئی سچائی یعنی مصنف کا اپنے موضوع، شخصیت کے بارے میں موقف کا کسی غیر ضروری احتیاط یا منافقت میں مبتلا نہ ہونا دو بڑی اہم اضافی خصوصیات ہیں۔ عموماً اچھے سے اچھے لکھنے والے اتنی ہمت نہیں کر پاتے۔

مصنف نے بعض ایسے مشاہیر بھی چنے ہیں جن کی عام شہرت تو بہت ہے لیکن جن کی بعض اہم ترین خصوصیات سے بھی لوگوں کی اتنی بڑی تعداد واقف نہیں۔ مثلاً ڈاکٹر شان الحق حقی مرحوم جنھیں زیادہ تر لوگ زبان کے مختلف پہلوؤں پر ان کے درجۂ استناد کے حوالے سے جانتے ہیں جو واقعی بہت بڑا ہے۔ لیکن زبان ہی کے حوالے سے حقی صاحب مرحوم میں جو صفات تھیں وہ کم لوگوں کو معلوم ہیں۔ اور وہ کھلتی اس وقت تھیں جب پڑھے لکھوں کی محفل میں خود حقی صاحب کی زبانی ان پہلوؤں پر بہت کچھ سننے میں آتا تھا۔ یہی کیفیت کئی اور شخصیات کی ہے جن پر مصنف نے اس کتاب میں کام کیا ہے۔

میں ذاتی طور پر ممنون ہوں کہ مصنف نے مجھے بھی اپنی توجہات کے دائرے میں شامل رکھا اور مجموعی طور پر ان کے لہجے اور الفاظ سے ان کی عنایت اور محبت مظہر ہوتی ہے۔ لیکن میرے کہنے کا یہ حق بھی ہے کہ ان کی غیر معمولی حساسیت نے بہت چھوٹی چھوٹی باتوں کو

زندگی میں ان کے تناسب سے کہیں زیادہ اہمیت دے دی۔ بہر حال معذرت مجھ ہی کو پیش کرنی چاہیے۔ لیکن میرا معاملہ چھوڑیے، دیگر شخصیات پر جو معلومات انھوں نے بہم پہنچائیں اور جس طرح بہم پہنچائیں وہ مسلسل آنکھیں روشن کرتی ہیں۔ کہیں وہ کسی بات پر معترض بھی نظر آتے ہیں تو ایک چھپی ہوئی محبت کے ساتھ اور یہ کہیں پتہ نہیں چلتا کہ وہ غیر ضروری طور پر ذاتیات کا شکار ہو گئے ہیں۔

اس کتاب میں ایک نئی اور بڑی صفت یہ بھی ہے کہ انھوں نے ایک بڑے ادیب کو اپنے اذکار میں کسی خاص ذاتی واقفیت یا تعلق کی بنا پر مرکز توجہ بنایا۔ یقیناً پشکن نہ صرف ان کے لیے بلکہ اپنے کروڑوں پڑھنے والوں کے لیے آج بھی زندہ ہے لیکن بہت سے لوگ جوش کا ذکر بھی کرتے ہیں اس تاثر کو اپنی تحریر سے الگ نہیں کر پاتے کہ وہ تقریباً دو صدی پہلے گزرنے والے ایک غیر ملکی ادیب کا ذکر کر رہے ہیں، یعنی ان کے یہاں پشکن کا ادب (ہمہ اقسام) تو یقیناً زندہ لگتا ہے لیکن یہ مسلسل واضح رہتا ہے کہ پشکن جتنا بھی بڑا ہو، مر چکا ہے، پشکن پر ہمارے اطہر رضوی صاحب کے مضمون میں یہ بات نہیں ہے بلکہ انھوں نے پشکن اور اس کے ادب دونوں کو زندہ محسوس کیا اور کرایا ہے۔ پشکن ہی کے تذکرے سے ایک اور بڑا نکتہ سامنے آتا ہے جس پر ہمارے اہلِ قلم کی توجہ ادبی تنقید میں کافی اضافہ کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ جس طرح رضوی صاحب نے پشکن پر لکھا، ہم میں سے تنقیدی نثر لکھنے والے دوسرے بہت سے ان ادیبوں اور شاعروں پر خصوصی مضامین لکھ سکتے ہیں جنھوں نے ایسی تخلیقی عظمتیں چھوڑ رکھی ہیں۔

—ooOOOoo—

چہرے باتیں یادیں لوگ اور اطہر رضوی

پروفیسر محمد زماں آزردہ سری نگر، انڈیا

جناب اطہر رضوی سے میری جان پہچان واجبی سی ہے۔ دو ایک سیمناروں میں ہم دلی میں ملے۔ اُن کی مرتب کردہ کتاب عالمی میر تقی میر سیمنار میں نے خود پڑھی دوسروں سے پڑھوائی مختلف کالجوں میں بھیجی اور اس میں اطہر رضوی صاحب کا کوئی تصور نہیں۔ ڈاکٹر شاہد حسین اور ڈاکٹر ظل ہما نے اس سیمنار کی تعریف کی، میں نے ان مقالات کو پڑھا، اچھے لگے، کچھ نئے زاویے مطالعہ کے سامنے آئے اور اس سبب سے میں نے چاہا کہ اردو شعر و ادب کے طالب علم اور اساتذہ اس کا مطالعہ کریں۔ ساہتیہ اکادمی کے سیمنار میں دلی میں اطہر رضوی کی تقریر سنی، میں نے اُن کی خدمت میں اپنی کتاب مرزا سلامت علی دبیر، اور موج نقد، پیش کی۔ اُن کا کوئی خط اس ضمن میں نہیں ملا۔ اصل میں ڈاکٹر سید تقی عابدی نے ادھر مرزا دبیر پر اتنا لکھا کہ اب کسی کو ہماری ادبی کاوشیں متاثر بھی نہیں کرسکتیں۔ اصل میں ان کی کتابوں کے ساتھ اُن کی شخصیت ہے اور ہماری کتابوں کے ساتھ ہم ہیں اور یہ کوئی معمولی فرق نہیں ہے۔

بہر حال گفتگو کا رخ کچھ بدلنے لگا جو میری منشاء کے بالکل خلاف ہے۔ سیمنار میں جس طرح کی گفتگو میں نے اطہر رضوی کی زبان سے سنی اُس سے میرے ذہن میں ان کی شخصیت کا جو پہلو مجھ پر حاوی رہا وہ اُن کی سنجیدگی، محققانہ انداز بیان، اور مورخانہ صداقت کا پہلو تھا۔ جب ڈاکٹر شاہد حسین صاحب کے وسیلے سے میری نظر سے 'چہرے باتیں یادیں لوگ'' گزری تو مجھے اُن کی تحریر میں کتاب کے عنوان ہی کی طرح سے ایک ایسی موسیقیت کا

احساس ہوا جس کے بغیر کوئی پڑھا لکھا بلکہ عام زندگی گزارنے والا انسان بھی صحیح معنوں میں اپنے مشاہدے اور زندگی کے تجربات سے محظوظ نہیں ہوسکتا۔ فرق یہ ہے کہ زاہد خشک کھڑکیاں اور دروازے بند کرکے ہنستا ہے اور رند باجرات دوسروں کو اپنی ہنسی میں شریک کرتا ہے۔ وہ بند کمرے میں صرف روتا ہے اور جب کھڑکی یا دروازے جھانکتا ہے تو اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے، چاہے اس نے اسی وقت اپنے آنسو پونچھ لیے ہوں۔

اطہر رضوی کی یہ کتاب، جس میں گیارہ اشخاص کے ساتھ محفلیں سجائی گئی ہیں، اپنے اندر خاکہ نگاری، انشائیہ نویسی ور سوانح نگاری کا ایسا امتزاج رکھتی ہے کہ ایک ٹکٹ میں کئی تماشے دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ مگر ان تمام تماشوں میں کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی صورت اطہر رضوی کا اپنا مزاج، اپنا رنگ اور اپنا سلیقہ ضرور جھلکتا ہے۔ اُن کی محققانہ روش، ناقدانہ نظر اور طنزیہ ادا کے جلوے بھی نگہہ نواز ہوتے ہیں۔

اس مجموعے میں گیارہ شخصیات کا احاطہ کیا گیا ہے، جن کی شخصیتیں زیر نظر دو سو کے لگ بھگ صفحات میں آنکھ مچولی کھیلتی نظر آتی ہیں اس میں دھوپ چھاؤں کا ایک ایسا سماں بندھا ہوا ہے کہ کہیں بھی بوریت کا احساس نہیں ہوتا۔ بیشتر لوگ ان ساری شخصیات سے واقف ہیں مگر اس کتاب میں شامل تحریریں، ان شخصیات کے بارے میں جاننے والوں کے علم میں ضرور اضافہ کرتی ہیں، بعض شخصیتیں جن کو لوگوں نے دور دور سے، یا خاص موقعوں پر، یا ماضی کے محض کسی ایک موڑ پر دیکھا ہے، ان کے بارے میں یہ کتاب پڑھ کے احساس ہوتا ہے کہ اب پہلی بار مل رہے ہیں یا دیکھ رہے ہیں۔ اکثر لگتا ہے کہ اطہر رضوی صاحب اپنا کوئی خاص نظریہ، رائے یا مشورہ ٹھونسنے کی کوشش نہیں کرتے مگر ان کی تصور کشی میں کسی ایک کونے میں اپنا موقلم اس طرح دبا کے چلاتے ہیں کہ رنگ گہرا آجاتا ہے اور قاری ایک بار اپنی آنکھیں کچھ زیادہ کھولنے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔

پڑھتے ہوئے قاری ایک بات ضرور محسوس کرتا ہے کہ اطہر رضوی گفتگو میں بے تکلفی

سے کام لے کر دوسروں کو اپنے مشاہدے میں شریک کر لیتے ہیں۔ بعض لوگ تو یہ خیال کریں گے کہ اطہر رضوی کا انداز غیر رسمی تحریر میں بھی بیشتر رسمی سا ہو جاتا ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ سب جان بوجھ کے یا سوچ سمجھ کر نہیں کیا گیا ہے، اصل میں اطہر رضوی کا مزاج ہی یہی ہے کہ ان کی گفتگو میں اُنکے اندر کا محقق اور مورخ غیر رسمی پردے پھاڑ کر اپنا رسمی اور مجلسی چہرہ سامنے لاتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پولس کا سپاہی آ کر ملزم کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے یا یوں کہ بچے اپنا ہنس کھیل رہے ہوں اچانک کوئی بزرگ سامنے آجاتا ہے۔

جمیل الدین عالی، ستیہ پال آنند، سلطانہ مہر، حمایت علی، منموہن شرما، اکرام صاحب کے بارے میں گفتگو متاثر کرنے والی ہے۔ ادھر کچھ عرصہ سے گیان چند جین کی دوزبانی اور بیک زبانی نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ جو جین صاحب کو قریب سے جانتے ہیں وہ بھی تعجب میں پڑ گئے اور جنہوں نے اس کتاب سے پہلے اُن کو صرف پڑھا تھا، وہ بھی محو حیرت ہیں کہ آن کی آن میں ان کے ذہن کا نقشہ بدل گیا۔ آدمی کچھ سوچ کے ایک بت بناتا ہے، اس کو پوجنے لگتا ہے اور پھر جب عملاً وہ بت اس کے سامنے آتا ہے، خود ہی بحرکت آ کے ہتھوڑا اٹھاتا ہے۔ اور اپنی صورت کو مسمار کرتا ہے تو تعجب کیسے نہ ہو۔ کوئی اور آ کے کسی کی تصویر مٹادے یہ تو ہوتا ہی ہے مگر خود وہ تصویر ہی اپنے ہاتھ بڑھا کے اپنے اوپر ایک نامانوس رنگ پھیر کے اپنے سارے رنگوں کو مٹادے، ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ جین صاحب نے اپنی تصویر کے ساتھ کچھ ایسا ہی کیا اور مقدر نے بھی ان کو اتنی فرصت نہیں دی کہ وہ اب اس تصویر کو خود بدل سکیں۔ بعض لوگوں نے کوششیں کیں کہ ''مدعی سست اور گواہ چست'' مدعی مدعی ہوتا ہے اور گواہ گواہ۔

شمس الرحمٰن فاروقی سے لے کر عبدالستار دلوی تک کئی حضرات نے اظہار خیال کیا، لوگوں کو کتنی نئی باتیں معلوم ہوئیں مگر اطہر رضوی نے جس طرح سے گفتگو کی اُس سے انگریزی کے اس محاورے کو اور تقویت ملی کہ From Horses mouth کے صحیح معنی کیا ہوتے ہیں۔

سوا اس کے کہ اطہر رضوی صاحب کشمیر اور جموں کو ایک سمجھتے ہیں جب کہ جموں، جموں ہے اور کشمیر، کشمیر۔ جبین صاحب جموں میں رہے، کشمیر میں نہیں۔

حمایت علی سے میری ایک ملاقات حیدر آباد کی رہی ہے۔ مجھے وہ سیماب پا لگے۔ یہ سیمابیت میں نے حمایت علی کے علاوہ مرحوم خمار بارہ بنکوی میں بھی دیکھی تھی۔ خمار کا معاملہ تو یہ تھا کہ وہ ہمیشہ اسٹیج پر بھی پاؤں ہلاتے رہتے تھے۔ وہ نہ صرف چھوٹی بحر میں کہتے تھے بلکہ خود بھی چھوٹی بحر لگتے تھے۔ اُن کے مقابلے میں حمایت علی متوسط جسم کے اچھے اچھے آدمی سے لگتے ہیں۔ جب اطہر رضوی کا بیان اس سیمابی شخصیت میں ایسا ٹھہراؤ پیدا کرنے میں کامیاب ہوا ہے کہ باہر کی سیمابیت اس کے اندر سرایت کر کے اُن کی اندر کی حرکی شخصیت کو ایسے سامنے لاتی ہے جیسے ایک پھڑ پھڑاتا ہوا پرندہ بار بار قریب سے گزر کے رقص حیات کا درس دے رہا ہو۔ حمایت علی اگر اطہر رضوی کی نظر میں دانشور نہ بن سکے تو کیا ہوا۔ اگر دنیا میں صرف دانشور ہوتے تو زندگی بے کیف اور بے رنگ ہو جاتی۔

اس تحریر میں بھی اطہر رضوی حمایت کو بہانہ بنا کر اپنے بارے میں گفتگو کرتے ہیں لیکن انداز ایسا ہے کہ جیسے سب کچھ بر سبیل تذکرہ ہو رہا ہے۔

بہر کیف اطہر رضوی کی اس طرز تحریر نے مجھے اطہر رضوی کے ایک ایسے پہلوئے تحریر سے ملا دیا کہ جس سے زندگی، زندگی بنی رہتی ہے اور خود محقق، ناقد اور مورخ کو آدمی بنے رہنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ موقعہ تھا کہ کچھ اور لکھتا مگر کاغذ جو سامنے ہے سلام کر رہا ہے اور گھڑی سفر کا الارم بجا رہی ہے اس لیے باقی ــــ باقی رکھتا ہوں کہ حساب دوستاں در دل رہے۔

ـــــoooOOOooـــــ

اطہر رضوی اردو دنیا کے اہم قلمکار

عاشور کاظمی برمنگھم
برطانیہ

اطہر رضوی اردو دنیا کے جانے پہچانے ادیب ہیں ان میں سچ کہنے کی ہمت ہے۔ کم و بیش دس کتابوں کے مصنف ہیں۔

میں نے نہ صرف برطانیہ بلکہ کینیڈا اور امریکہ کے ممتاز ادیبوں پر لکھا ہے۔ کینیڈا کے حوالے سے اطہر رضوی اہم قلمکار ہیں جن پر لکھنے کا مجھے یک طرفہ شرف حاصل ہے۔

چہرے باتیں یادیں لوگ کے دیباچہ میں پروفیسر سحر انصاری نے نہایت بے تکلفی سے لکھا ہے۔ "اطہر رضوی نے کہیں رسمیات، ادبی سماجیات کی اخلاقی نہج کو برقرار رکھنے کی کوشش نہیں کی، ہر تحریر میں ان کا انداز ہے کہ "عیب او جملہ بہ گفتی، ہنرش نیز بگو"۔ اس مصرعہ کی تلمیح پسِ پشت ڈالتے ہوئے انھوں نے اس مصرعہ کے معنی یہ بتائے ہیں۔

"انھوں نے (اطہر رضوی) کسی شخصیت کو سراپا مداحی سے سنوارا ہے اور نہ ہی عیب جوئی سے بگاڑا" پروفیسر سحر انصاری محترم اطہر رضوی کے بھی دوست ہیں اور میرے بھی۔ ہم بھائی انصاری کے مزاج سے واقف ہیں۔ ان کا تجزیہ غلط نہیں ہے بلکہ وضاحت طلب ہے۔

اطہر رضوی کا مزاج نہ قصیدہ خوانی ہے نہ مرثیہ نگاری .... ان کی تحریر کا انداز یہ ہے کہ جس کا ذکر کریں اس کے مثبت رویوں کا ذکر کریں، یہاں تک کہ وہ عظمت کی سر بلندی کو چھوتا نظر آئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس کے مزاج کے منفی رویوں کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ اب یہ قاری کا کام ہے کہ وہ ایک انسان کے مثبت اور منفی رویوں سے آگاہ ہو کر اپنے

ذہن میں اسی کردار کی تعمیر کرے۔

اطہر بھائی کی کچھ کتابیں، سفرناموں کی طرح ہیں لیکن وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اس کی تجزیہ نگاری بھی کرتے ہیں۔ مثلاً ان کی کتاب ''خدا کے منتخب بندے'' فلسطین اور یہودیوں کے تجزیہ پر مشتمل ہے۔

دوسری کتاب ''ہر ملک ملک ماست'' گم شدہ عظمتوں کی دریافت ہے۔ تیسری کتاب ''تاریخ کا سفر، بلکیبیا سے بازنیا تک'' قدم قدم مشاہدہ اور مطالعہ ہے، ان کتابوں کا format تو سفرنامہ ہے لیکن ان سفرناموں میں جستجو اور تحقیق کے جو عناصر ہیں وہ تاریخ کے باب وا کرتے ہیں۔

ان کی دیگر کتابوں میں ایک کتاب ''عالمی غالب سیمینار'' ٹورنٹو میں منعقد ہونے والے غالب سیمینار کی رپورٹ پر مشتمل ہے۔ ایک اور کتاب ''بیادِ غالب'' ہے جو غالب کی زمین میں مختلف شعراء (بجز عاشور کاظمی) کی کہی ہوئی غزلیں شامل ہیں۔ ''عالمی میر سیمینار'' منعقدہ ۲۰۰۰ء کی رپورٹ کتابی صورت میں شائع کی ہے۔ ایک کتاب ''یاد کے موتی'' بھی ہے جو اطہر بھائی کا شعری مجموعہ ہے۔

اتنی ڈھیر ساری کتابوں میں دبے ہوئے مصنف، ادیب، ناقد اور شاعر سید اطہر رضوی کو ''مغرب اور اردو'' کا روشن چراغ کہنے میں دشواری نہیں ہوتی۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں میں نے اطہر بھائی پر پہلے بھی لکھا ہے لیکن مجھے اعتراف ہے کہ حق ادا نہیں ہوا۔ بشرط حیات میں ان کی روشن تحریروں کے بارے میں کتاب لکھنا چاہتا ہوں اس لیے اس کے بغیر ان کی تحریروں کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ آج کی محفل میں اختصار ضروری تھا۔ اس لیے میں اپنے اور ان کے تعلق کے حوالے سے جوشؔ کے شعر پر اختتام کرتا ہوں۔

روندے ہوئے ذروں کے لبوں پر اے جوشؔ   خورشید کے بوسوں کے نشاں ملتے ہیں

oooOooo

اطہر رضوی کی ''چہرے باتیں یادیں لوگ''

نجمہ عثمان، لندن، انگلینڈ

میں اپنی غائب دماغی سے بہت خوف زدہ رہتی ہوں اور اپنے بھولنے کی عادت سے سخت نالاں ہوں۔ بہت سی باتیں بغیر سنے اور کہے میرے یادداشت کے کمپیوٹر کے کسی خانے میں ایک فائل کی صورت محفوظ ہو جاتی ہیں اور کئی اہم اور آسان سی باتیں بار بار دہرائے جانے کے باوجود میرے سر کے اوپر سے نکل جاتی ہیں۔ اپنے بارے میں یہ تمہید میں نے اس لیے باندھی کہ ہر چند یہ عادت قابل تعریف نہیں ہے مگر جو لوگ میرے اس ''بھلکڑ پن'' سے قطع نظر میرے اندر چھپی ہوئی نجمہ کی اصلی شخصیت کو تلاش کر لیتے ہیں وہ میرے عمر بھر کے دوست بن جاتے ہیں۔

برمنگھم کی ایک ادبی محفل میں شرکت کا شرف حاصل ہوا۔ تقریب رونمائی تھی۔ کینڈا سے آئے ہوئے اطہر رضوی صاحب کی کتابوں کی اور ان کے ساتھ پاکستان کے مشہور و معروف شاعر محسن احسان کی آمد بھی متوقع تھی۔ میں اطہر رضوی صاحب سے قطعی ناواقف تھی (اب یہ لکھتے ہوئے بڑی شرمندگی محسوس ہو رہی ہے) اور محسن احسان سے لندن کے ایک مشاعرے میں مل چکی تھی لیکن حسب عادت ان کا سراپا یکسر دماغ سے غائب ہو چکا تھا۔ اچانک ایک صاحب ہال میں داخل ہوئے لمبا قد، سرخ و سپید، اور متبسم چہرہ، آنکھوں میں ذہانت کی چمک۔ میں لپک کر آگے بڑھی سلام کیا۔ ادھر سے بھی بڑی محبت اور تپاک سے وعلیکم سلام آیا۔ میں نے لہک کر کہا۔ آپ ہی کا انتظار تھا۔ اب طبیعت کیسی ہے؟ بڑے دن بعد لندن آنا ہوا اور کچھ بھی

کہا ہوگا جواب یاد نہیں۔ انہوں نے اپنے چہرے سے قطعی یہ ظاہر ہونے نہیں دیا کہ وہ مجھ سے پہلی مرتبہ مل رہے تھے اور جو میں باتیں کر رہی تھی وہ بھی ان کے لیے ''ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا'' والی بات رہی ہوگی لیکن اس کا اظہار انہوں نے نہیں کیا۔ وہ ہال کے دوسری طرف چلے گئے۔ اتنے میں محسن احسان صاحب اپنے بیٹے کا سہارا لیے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہال کے اندر داخل ہوئے۔ کسی نے کہا محسن احسان تشریف لے آئے۔ میں نے انہیں دیکھا اپنے بھولنے کی عادت پر لعنت بھیجی اور پھر ان کی خیریت دریافت کی۔ ہال کی دوسری طرف پہلے آنے والے صاحب لوگوں کے درمیان کھڑے تھے اور مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہے تھے۔ کسی نے تعارف کرایا یہ اطہر رضوی صاحب ہیں۔ میں دل ہی دل میں بڑی خجالت محسوس کر رہی تھی۔ اطہر رضوی مجھے نہ جانے کیا سمجھ رہے ہوں گے اور میری اس بے تکلفی کو کیا معنی پہنائے ہوں گے۔ میں نے سابقہ روایت کو قائم رکھتے ہوئے اپنے اردگرد بہت سے سوالیہ نشان کھڑے کر لیے تھے اور مکمل طور پر غائب الدماغ ہو چکی تھی۔

بہر حال پروگرام شروع ہوا اور جیسے جیسے مقررین کی باتوں سے مجھے اطہر رضوی کی باکمال شخصیت کے بارے میں معلوم ہوتا چلا گیا ویسے ویسے میں زمین میں دھنستی چلی گئی۔ ایسی منفرد اور لاجواب ہستی میرے سامنے بیٹھی تھی اور میری کم مائیگی کہ میں اس سے لاعلم رہی۔ مہمان ادبی شخصیات ان کی کتاب ''چہرے باتیں یادیں لوگ'' کے حوالے سے کتاب میں شامل شخصیات کے بارے میں اطہر رضوی صاحب کی انوکھی، دلچسپ Analysis کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے اور میرے تجسس کو ہوا دے رہے تھے۔ نامور ادبی شخصیات پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں اور زیادہ تر روایتی قسم کی طرح ہوتی ہیں۔ کس نے کیا لکھا پڑھا، ان کی تصانیف کی لسٹ، ان کے بارے میں مصنف کے تاثرات جو زیادہ تر اچھے ہی ہوتے ہیں۔ اطہر رضوی کی کتاب میں شامل، شخصیات پر تجزیہ کچھ اور طرح کا تھا۔ چونکہ کتاب میں نے پڑھی نہیں تھی اس لیے بہت سی باتیں پر سراریت کا عنصر بنی میرے چاروں طرف گھومتی

رہیں۔ پروگرام کے بعد میں نے خاص طور سے ان کی کتاب مانگی، اس پر انہوں نے لکھ کر دیا (تاثرات کی توقع کے ساتھ) جو میرے لیے اعزاز تھا اور پریشانی و حیرانی کی بات بھی۔ میں بھلا ان کی کتاب پر کیا تاثرات دوں گی۔ یہ بھی ایک ادبی آرٹ ہے اور ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ کم از کم میں تو اپنے آپ کو اس لائق نہیں سمجھتی۔ پھر میں نے ڈرتے ڈرتے ان کو اپنا تازہ افسانوں کا مجموعہ پیش کیا (ڈر اس بات کا تھا کہ ان کی رائے سچی اور کھری اور بے لاگ لپیٹ ہوگی) لیکن خوشی اس بات کی تھی کہ اگر انہوں نے میری کہانیوں کے بارے میں کچھ لکھنا مناسب سمجھا تو میرے لیے وہی کافی ہوگا۔ یہ نومبر ۲۰۰۸ کی بات ہے۔ ان کی کتاب میرے سرہانے رکھی رہی۔ کچھ شخصیات کے بارے میں مضامین ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالے۔ (کتاب کی رونمائی والے دن کے حوالے سے) میرا تجسس کچھ کم ہوا لیکن اس کی جگہ تحیر نے لے لی۔ کیا اس دنیا کے مصنوعی غلاف میں لپیٹے ہوئے لوگوں کے درمیان اطہر رضوی ایسے لوگ بھی بستے ہیں، جو سچ اور حق بات کہتے ہوئے نہ ہچکچاتے ہیں اور نہ ہی اس خوف میں جیتے ہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ میں ان پر لکھوں تو کیا لکھوں۔

اطہر رضوی صاحب سے میرا ای میل کے ذریعہ رابطہ رہا۔ میری پہلی ای میل کے جواب میں انہوں نے کتاب کے لیے لکھا:

I have gathered from its sincere style that you are a thoroughly liberated lady from the East. I would love to have an intellectual liasion with you"

میں نے ان کی اس امید اور خواہش پر اپنے طور سے پانی پھیر دیا۔ ایک طرف تو میری زندگی کی نجی مصروفیات اچانک ہی بڑھ گئیں اور دوسری جانب اپنے افسانوں کے مجموعے کی اشاعت کے بعد کچھ ایسے حالات اور واقعات پیدا ہوئے کہ میں بہت دکھی ہوگئی۔ بہت سی باتوں کی ذمہ داری میں اور میری غائب دماغی ہے۔ کچھ لوگ انجانے میں دل دکھا جاتے ہیں

کچھ جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں تکلیف مجھے ہی زیادہ ہوئی اور ذہنی طور پر میں مفلوج سی ہو کر رہ گئی۔ کاش میرے پاس اطہر رضوی جیسا سچ بولنے اور اس کو سامنا کرنے کا حوصلہ ہوتا تو آج مجھے یہ چند سطور لکھتے ہوئے بھی اذیت نہ ہوتی۔ بہر حال میری تاویلیں جاری رہیں۔ وہی گھریلو مصروفیت کا رونا اور درس تدریس کے کام کی زیادتی۔ اطہر رضوی نے پہلی دسمبر کو ای میل بھیجی اس خوشخبری اور تمہید کے ساتھ کہ انہوں نے میرا افسانوں کا مجموعہ پڑھ لیا ہے۔

"Now after reading your thought provoking book..... Most of my remarks are complimentary"

پھر انہوں نے اپنا مضمون دو رسالوں کے لیے بھیج دیا اور مجھے دوہری خوش خبری کہ مارچ تک کے شماروں میں یہ مضمون چھپ جائے گا۔ یہ دسمبر ۲۰۰۸ء کی بات ہے۔ میں نے اطہر رضوی کو نئے سال کی مبارک باد دی اور اپنی مصروفیت کا رونا روتے ہوئے امید ظاہر کی کہ نئے سال میں بہت کچھ لکھوں گی۔ ان کا پیار بھرا جواب تھا۔

I am glad that in the coming year you would have more timeto devote to your creative activity. A creative mind generates serenity a sense of accomplishment.

ان کے یہ دو جملے مجھے جھنجھوڑ گئے۔ میں کچھ لمحوں کے لیے ''میں'' کے حصار سے باہر آ گئی۔ میں نے اپنا اور اپنے منفی خیالات کا محاسبہ کیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ کس لیے ہوا؟ میں نے ہمت باندھی اور منتشر خیالات کو یکجا کیا۔ کسی مسئلے کا حل اس سے بھاگنا نہیں بلکہ اس کا سامنا کرنا ہے۔ مسئلہ تو حل ہو گیا اور مجھے اپنے پریشان کن سوالات کے جواب بھی مل گئے۔ بہت تکلیف ہوئی۔ ندامت ہوئی اور افسوس بھی ہوا۔ لیکن قلم ہاتھ میں تھام لیا۔ زبان اور قلم دونوں ہی اگر تلوار کی مانند چلیں تو کبھی نہ بھرنے والے زخم دے جاتے ہیں۔ لیکن قلم کی زبان کو سچائی

سے بھری روشنائی میسر آجائے تو تحریریں پرانے سے پرانے زخموں کو مندمل کرنے کی قوت رکھتی ہیں۔ جناب اطہر رضوی صاحب کو اس فن میں کمال حاصل ہے۔ نئے سال پر ای میل رابطے کے بعد ان سے گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ میرے پاس لکھنے کے لیے کچھ نہیں تھا اور انہیں جو کہنا تھا کہہ چکے تھے۔ انہوں نے بھی سوچا ہوگا یہ نجمہ عثمان بھی typical خاتون نکلیں جو شاعری، افسانہ نگاری اور گھر داری کی دیوانی ہنڈیا پکا کر ان تینوں شعبوں میں یکساں مقبول بننے کی کوشش میں خود چوں چوں کا مربہ بن کر رہ گئی ہیں۔

میں نے ''چہرے باتیں یادیں لوگ'' از سر نو پڑھنا شروع کی۔ اطہر رضوی کا کمال یہ ہے کہ کتاب میں شامل ہر شخصیت کے بارے میں جم کر اور کھل کر لکھا ہے۔ جہاں وضع داری اور تہہ داری کے اصولوں پر کاربند رہے ہیں۔ وہیں کھرے کھوٹے اور سچ جھوٹ کی کسوٹی پر بھی ہر ایک کو پرکھا جانچا ہے۔ یہ میزان اور ناپ تول کا حسین مگر کھردرا امتزاج کم از کم میری نظروں سے کسی تحریری شکل میں نہیں گذرا۔ مجھے ممتاز مفتی کی ''اوکھے لوگ'' بہت پسند آئی صرف اس لیے کہ انہوں نے اپنی کتاب میں شامل 'معروف ادبی شخصیات کا احاطہ بڑی بے تکلفی اور انوکھے انداز میں کیا تھا اور ان کی تحریر کی شوخی اور بے باکی ان پر ہی ختم تھی۔ اس کے برخلاف اطہر رضوی کے دائرہ تحریر میں جہاں ایک طرف عالی صاحب، ستیہ پال آنند، سلطانہ مہر، حمایت علی شاعر حقی صاحب، نسیم سید، اکرام صاحب، گیان چند جین، من موہن شرما اور الیکزنڈر پشکن جیسی اعلیٰ ادبی شخصیات اور مفکر ہیں وہیں عام زندگی سے جڑے ہوئے ثریا اور سونیا جیسے کردار بھی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''کبھی کبھی محبت کے رشتے خون کے رشتوں سے زیادہ قریب ہوجاتے ہیں۔ یہ رشتے انوکھے ہوتے ہیں یہ اتفاقاً پیدا ہوتے ہیں اور ان کے استوار ہونے میں مدتیں لگتی ہیں۔ اور پھر وہ تادم حیات ساتھ رہتے ہیں۔ ثریا خان اور میرے مابین ایک ایسا ہی رشتہ ہے۔''

'ثریا اور سونیا' کی کہانی میں نے بار بار پڑھی اور ہر دفعہ آنکھیں نمناک رہیں۔ یہ اطہر

رضوی کی تحریر کا کمال ہے کہ وہ اپنے قاری کو اپنی تحریر کے ذریعے گونگوں اور بہروں کی اس بستی میں لے گئے جہاں رابطے کا ذریعہ اشاروں کی زبان ہے۔ میں مغربی دنیا کی اچھائیوں کو دل سے مانتی ہوں اور اس کا برملا اظہار بھی کرتی ہوں کیوں کہ میں ان خوبیوں کو مشرقیت کے تعصب کا چشمہ لگا کر نہیں دیکھتی۔ اطہر رضوی اس اصول پر سختی سے عمل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہاں انسان کی معذوری نہ باعث شرم ہے اور نہ موجب نارسائی اور نہ ہی ملازمت کے حصول میں اس کی معذوری قانون کے مطابق نا اہلی تصور کی جاتی ہے...... میں سوچتا ہوں مغرب کی تہذیب ہزار لعنتوں کے باوجود مشرقی دنیا سے کتنی صدیوں آگے ہے۔ ثریا کے گھر جتنے دوست، احباب اور رشتہ دار آتے ہیں وہ سب بقول ثریا، سونیا کو ایک بے جان، بے ضرر، بے زبان فرنیچر کے مانند تصور کرتے ہوئے اس کو نظر انداز کر کے ثریا سے گفتگو شروع کرتے ہیں اور سونیا فوراً اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے۔"

میرا بھی یہی کہنا ہے: ہم مشرقیت کے علم بردار کہلائے جاتے ہیں، انسانیت اور بھائی چارہ کا نعرہ لگاتے ہیں مگر وقت پڑنے پر اپنے ہی بھائی کا گلہ کاٹنے سے گریز نہیں کرتے اور جیتے جاگتے انسان کو بے جان تصور کرنے سے بھی نہیں باز آتے۔ ہمارے معاشرے کے اس دوغلے پن کو اطہر رضوی نے جہاں جہاں محسوس کیا اس کا اظہار بھی کر دیا۔

ثریا اور سونیا کی کہانی اطہر رضوی کی زبانی اس جملے پر ختم ہوتی ہے۔" زندگی کے قفس میں بیٹھے ہوئے ان دونوں پنچھیوں سے مجھے دلی قرابت ہے! خداوند عظیم ان کی مشکل حل کرے......"

ان کی اس دعا پر آمین ثم آمین کہتے ہوئے میرے دل سے یہ دعا بھی نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اطہر رضوی کی انسانیت کی اس محبت کو اور فروغ دے کیوں کہ ان کی تحریر کی دل کشی، ترشی اور نرم گرم انداز میں ایک نمایاں حصہ انسانیت سے جڑے ہوئے اس جذبے کا بھی ہے۔

کتاب کے دیباچے میں جناب سحر انصاری نے ان تمام شخصیات پر جو چھرے باتیں

یادیں لوگ' میں شامل ہیں اپنے طور پر اور شناسائی کے حوالے سے کسی پر طویل اور کسی پر مختصر سا جملہ یا نوٹ لکھ دیا ہے۔ میرے اس تاثر کو لکھنے کا مقصد ان شخصیات کی مدح سرائی نہیں کیوں کہ یہ کام اطہر رضوی صاحب نے بڑے خوبصورت اور انوکھے انداز میں کر دکھایا ہے۔ مجھے ان کی تحریر نے جہاں جہاں چونکا دیا یا حیرت و استعجاب میں مبتلا کر دیا میں تو اس پر لکھنے کی جسارت کر رہی ہوں۔

'سر حرف' میں لکھتے ہیں "اس کتاب میں نہ کوئی عمیق تحقیق ہے اور نہ تاریخیت۔ میں نے ہر مذکور شخصیت کے بارے میں کچھ نئی، کچھ ان سنی دلچسپ باتوں کو جمع کر کے شگفتگی اور لطف پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے ہر شخصیت کا ذکر ایک منفرد انداز سے کیا ہے۔ اور ہر مضمون میں، نئی ان سنی اور دلچسپ باتوں کا سیل رواں ہے۔ کسی ایک شخصیت کے بارے میں بتاتے ہوئے وہ اس زمانے یا اس کے اردگرد کے ماحول کا اس طرح ذکر کرتے ہیں کہ سارے واقعات نگینے جڑی انگوٹھی کی مانند دل آویز اور ایک دوسرے سے مربوط نظر آتے ہیں۔ عالی صاحب کا ذکر دور طالب علمی کی خوشگوار یادوں سے شروع ہوتا ہے پھر کالج کے زمانے کے اور ساتھیوں کے نام بھی ابھر کر آتے ہیں۔ ساتھ ساتھ اطہر رضوی اپنی صفات اور کمزوریوں کے بارے میں بتانے میں بھی بخل سے کام نہیں لیتے۔ اور جو انسان اپنی کمزوریوں کے بارے میں بتانے سے بھی نہ ہچکچائے اس کے سچے اور کھرے پن کو کون Challenge کر سکتا ہے۔ اطہر رضوی نے نہ صرف شعروسخن، غزلوں، دوہوں اور گیتوں کی اصناف میں عالی صاحب کی انفرادیت کو مستند قرار دیا ہے بلکہ ان کے دیباچہ نگاری کے فن کو اس دور میں نہایت اہم اور قابل ذکر مانا ہے۔ عالی صاحب کی جن باتوں سے اطہر رضوی کو دکھ پہنچا اور ان کے عقیدے کے آبگینے کو ٹھیس پہنچی وہ یقیناً ان کا ذاتی معاملہ ہے اور کسی دوسرے کو اس پر تنقید یا اس کی تائید کرنے کا حق نہیں۔ ذاتی حوالوں سے میرے پاس ناموں

کی ایک طویل فہرست ہے۔ ان سب لوگوں نے انجانے میں یا دانستہ طور پر مجھے اور میرے خلوص کو اس بے دردی سے مجروح کیا کہ میں اس کی کسک اور تکلیف کو آج بھی محسوس کرتی ہوں۔ جہاں جہاں ممکن ہو سکا میں نے ایسے تمام لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ کچھ رشتے نسبتیں توڑی نہیں جا سکتیں، اور میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہوتا کہ میں ان لوگوں سے صرف Working relationship رکھوں حالانکہ تکلیف اس میں زیادہ ہوتی ہے۔

اطہر رضوی نے اپنی پسندیدہ شخصیات کے بارے میں جیسا محسوس کیا لکھ دیا۔ سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ یہ سب لکھنے کے لیے Photographic memory اور فولاد کا جگر چاہیے اور اطہر رضوی ان دونوں صفات سے مالا مال ہیں۔ پھر سونے پر سہاگہ ان کا مشاہدہ اور مطالعہ غضب کا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ آخری الذکر صفات کو اپنے قاری پر ٹھونسنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ کسی واقعہ کی پکی پکائی ہنڈیا میں انہیں اوپر سے چھڑکنے کے لیے "ہرے مصالحے" کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

حمایت علی شاعر پر لکھے ہوئے مضمون نے مجھے ان کے بارے میں پھر سے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ میں ان سے کبھی نہیں ملی۔ اپنی طالب علمی کا دور یاد آ گیا۔ جب ریڈیو پاکستان سے ماہانہ مشاعرے اور سال میں ایک دفعہ 'جشنِ تمثیل' کے عنوان سے ڈرامے نشر کیے جاتے تھے۔ حمایت علی شاعر کی آواز، ترنم اور ان کی نظم، جب بھی دیکھا ہے اسے، کا جادو ہر لڑکی کے سر چڑھ کر بولتا تھا۔ ادھر ڈراموں میں طلعت حسین کی جذباتی صداکاری کے طلسم نے بھی کچھ کم ہنگامہ نہیں کیا تھا۔ یہ infatuation جلد ہی اپنی کوشش کھو بیٹھا۔

اب سوچ کر ہنسی آتی ہے اور پرانی سہیلیاں ملیں تو اس 'حماقت' کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا جاتا ہے۔ میں تو حسب عادت بہت سی باتیں بھول چکی ہوں لیکن دوسری لڑکیوں کو بہت کچھ یاد ہے۔ اطہر رضوی کے یادداشت کے کمپیوٹر پر حمایت علی شاعر کی فائل ایک بہت ہی Positive, historical and geographical پس منظر کے ساتھ کھلتی ہے۔ دکن، اورنگ

آباد سے جڑی اردو زبان کی ابتدا، اشتراکیت پسند دور میں نوجوانوں کا حلیہ اس پر اطہر رضوی کا طرحدار جملہ ''حقیقت یہ ہے کہ کارل مارکس کے نام کے علاوہ کسی کو بھی کمیونزم کی دم کا بھی پتا نہیں تھا۔''

ایک اور معنی خیز لیکن پر اثر جملہ ''لیکن فضیلت محض شہرت کی بیساکھیوں کے سہارے نہیں پیدا ہوتی ہے۔ فضیلت، بزرگی، علمیت، بردباری، پندار اور عظمت انکسار وفقر کی صفات سے پیدا ہوتی ہے۔'' یہ ایک جملہ اپنے اندر کس قدر وزن رکھتا ہے۔

اگر وہ حمایت علی شاعر کی نظم ''بنگال سے کوریا تک'' کو گنجلک اور لایعنی قرار دیتے ہیں تو آگے چل کر بنگال کے عظیم تاریخ نویس ڈاکٹر امریتا سین کے ریسرچ کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ ویسے تو اس کتاب میں کئی references دیے گئے ہیں اور مجھے اس لاعلمی کا اعتراف کرتے ہوئے ندامت ہے کہ میں نے ان کتابوں یا مضامین کو نہیں پڑھا۔ (زندگی اور وقت نے مہلت دی تو یہ کتابیں ضرور پڑھونگی)

دیکھا جائے تو ''چہرے باتیں یادیں لوگ'' میں شامل ہر مضمون اپنی جگہ ایک مکمل document ہے جس میں چہرے بولتے ہیں۔ باتیں تیز بارش کی طرح برستی ہیں۔ یادیں رنگ برنگے تاریخی اور جغرافیائی لباس پہنے گھومتی پھرتی نظر آتی ہیں اور اس سارے پس منظر میں جانے پہچانے لوگوں کی انگلی تھامے اطہر رضوی کی پروقار شخصیت ابھرتی ہے اور دلوں میں کھپ جاتی ہے۔ مجھے یہ لکھتے ہوئے بہت دکھ ہو رہا ہے کہ پاکستان کے دانش ور، صاحب علم طبقہ اور نام ور صحافی اطہر رضوی جیسے مسلمان ادیب اور محقق کو وہ خراج نہ دے سکے جس کے اطہر رضوی جائز طور پر مستحق ہیں۔

وہ اک شجر جو کڑے موسموں کی زد پر ہے
بہار آئی تو یہ پھول خوش نما دے گا

oooOooo

چہرے باتیں یادیں لوگ

شاہد ماہلی، دہلی، انڈیا

مغرب میں جو لوگ اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں اُن میں ایک نام جناب اطہر رضوی کا بھی ہے۔ جناب اطہر رضوی صاحب ایک عرصے سے کینیڈا میں رہ کر اردو کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔ جن لوگوں نے انھیں دیکھا ہے وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ وہ مشرقی تہذیب و ثقافت سے کتنے قریب ہیں۔ ویسے تو اُن کی تحریریں مشرق و مغرب کے اہم رسائل میں اکثر چھپتی رہتی ہیں مگر اُن کی ایک اہم کتاب ''چہرے باتیں یادیں لوگ'' ابھی ابھی ادبی منظر نامے پر آئی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب اُن کی یادوں کا ایک حسین مرقع ہے۔ دنیا کی اہم ادبی شخصیتیں جنھوں نے زبان و ادب میں اپنے علمی کارنامے سے اپنا ایک اہم مقام بنایا ہے اُن کے بارے میں اطہر رضوی صاحب نے اپنی اس کتاب میں اہم معلومات فراہم کی ہے۔ جمیل الدین عالی، ستیہ پال آنند، سلطانہ مہر، حمایت علی شاعر، حقی صاحب اور گیان چند جین یہ وہ شخصیتیں ہیں جنھوں نے اردو زبان و ادب اور تہذیب کے ارتقاء میں اپنی پوری زندگی گزار دی۔ جناب اطہر رضوی نے اپنی اس کتاب میں ان لوگوں کے بارے میں تاثرات قائم کیے ہوئے ہیں۔ ان تاثرات کو پڑھ کر قاری اس بات کا بھی اندازہ لگا سکتا ہے کہ ان شخصیتوں سے ان کے رشتے کی کیا نوعیت ہے بقول سحر انصاری کہ اطہر رضوی نے جن شخصیتوں کا خاکہ پیش کیا ہے وہ شخصیتیں ایسی ہیں جن کو ایک پکچر گیلری کی طرح یکجا

ہو جانا چاہیے تھا۔ اور یہ کام اطہر رضوی نے اپنے خاص اسلوب اور مزاج کے ساتھ کیا ہے۔ جس کی داد انھیں برابر ملتی رہے گی۔ اس سے پہلے بھی اُن کی چند تصانیف سامنے آئی ہیں جن میں ہر ملک ملک ماست، خدا کے منتخب بندے، یاد کے موتی، قابلِ ذکر ہیں اِن کتابوں نے بھی اردو ادب میں اپنی جگہ بنائی ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ آپ کی یہ کتاب بھی آپ کی سابقہ کتابوں کی طرح کافی مقبول ہوگی اور ہمارا دانشور طبقہ اسے عزت کی نظروں سے دیکھے گا۔

حساب دوستاں در دل

اشفاق حسین، کناڈا

چہرے، باتیں، یادیں لوگ کے دیباچے میں پروفیسر سحر انصاری نے نہایت سلیقے اور دانش مندی سے اطہر رضوی صاحب کی اس کتاب کے بارے میں ایک بات کی اور بات بھی سولہ آنے کھری۔ انھوں نے لکھا کہ اطہر رضوی نے کہیں ''رسمیات'' اور ''ادبی سماجیات کی اخلاقی نہج'' کو برقرار رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ یعنی انھوں نے وہی کچھ لکھا جو انھوں نے محسوس کیا۔ اطہر رضوی صاحب کی شخصیت سے جو لوگ واقف ہیں وہ اس رائے سے سو فیصد اتفاق کریں گے کہ بات کو گھما پھرا کر کرنے کی عادت سے نہ ان کی زبان آشنا ہے اور نہ ہی ان کا قلم۔

آج کی تقریب کے لیے مضمون لکھتے وقت سحر انصاری صاحب کی استعمال کردہ یہ دونوں ادبی اصطلاحیں جن کو انھوں نے داوین میں لکھا ہے نہ جانے کیوں میرے ذہن کے صفحوں پر اس طرح چسپاں ہو گئیں جیسے ساحل سمندر پر ننگے پیر چلتے ہوئے ریت کے خوش رنگ ذرات چپک جاتے ہیں۔ چنانچہ میں نے بھی اس کتاب کو انھی دونوں اصطلاحوں کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی اور چونکہ اطہر رضوی صاحب کے برخلاف، میں بات کو گھما پھرا کر ہی کرنے کا عادی ہوں لہٰذا تھوڑی دیر کے لیے میری آنکھیں کھردری سچائی کی روشنیوں سے چکا چوند ہو گئیں۔ سچ اور اتنا کڑوا سچ، روشنی اور اتنی تیز روشنی، فیصلے اور اتنے گھمبیر فیصلے شاید کیا، بلکہ مجھے پورا یقین ہے کہ اس کتاب کے بارے میں جو کچھ لکھتے ہوئے میرا قلم کہیں

نہ کہیں ضرور ڈگمگائے گا۔ مگر چونکہ وہ میرے بزرگ بھی ہیں اور ان سے ایک خاص رشتہ داری بھی ہے تو شاید میں تھوڑی سی آزادی لے سکتا ہوں۔

سحر انصاری صاحب کا یہ کہنا کہ اطہر رضوی صاحب نے اپنی تحریروں میں ان دونوں رویوں کو برتنے کی کوشش نہیں کی ہے تو یقیناً یہ بات محل نظر ہے۔ اسے ایک طرح کا کامپلی منٹ یا خراج عقیدت بھی کہا جاسکتا ہے اور میرے خیال میں انھوں نے ان دونوں رویوں کو برتنے کی کوشش نہیں کی ہے تو یقیناً یہ بات محل نظر ہے۔ اسے ایک طرح کا کامپلی منٹ یا خراج عقیدت بھی کہا جاسکتا ہے اور میرے خیال میں انھوں نے ان دونوں اصطلاحوں کو انھی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ لیکن اطہر رضوی صاحب کی تحریروں پر ان دونوں اصطلاحوں کا اطلاق کر کے انھوں نے ایک طرح کی چٹکی بھی لی ہے اور اس کتاب کے پڑھنے والے کو اس کے پہلے ہی پیراگراف میں اشارتاً یہ بتا دیا ہے کہ آگے کیا کچھ سامنے آنے والا ہے۔ بہ الفاظ دیگر اطہر رضوی صاحب کوئی لگی لپٹی رکھنے والے مصنف ہرگز نہیں ہیں۔ چیزوں کو جس طرح وہ دیکھتے ہیں اسی طرح ان کو بیان کرنے کی صرف صلاحیت ہی نہیں بلکہ جرأتِ رندانہ بھی اپنے اندر رکھتے ہیں۔ انھوں نے خود ایک جگہ اس کتاب میں لکھا ہے کہ:

"میں اپنی نگارشات میں حتی الامکان یہ سعی کرتا ہوں کہ میں اپنے نجی تعصبات کو جو ہر شخص کے شریر میں کہیں نہ کہیں چھپے بیٹھے ہوتے ہیں اپنی رشحات فکر اور قلم و قرطاس سے دور رکھوں اور وہ لکھوں جو صحیح، صادق، مستند اور جائز ہو۔"

ان دنوں جب کہ اردو کے تقریباً سب ہی شاعر اور ادیب اپنی تعریف و توصیف کے علاوہ کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں تو اطہر رضوی صاحب جیسے بے باک، نڈر اور حق گو صاحب قلم کا ہونا ہمارے ادبی چرچ میں خوش آواز گھنٹوں کے بجنے سے کم نہیں ہے۔ وہ آزادی رائے اور آزادی فکر کے بہت بڑے علمبردار ہیں۔ وہ اسے اپنا فطری حق سمجھتے ہیں اور سمجھنا بھی چاہیے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہی حق وہ اپنے معترضین کو دینے کے لیے بھی

تیار ہیں اس کتاب کے بیش تر مندرجات کو پڑھ کر مجھے اس میں کچھ شک نظر آتا ہے اس لیے کہ ان کے یہاں رنگ صرف دو ہیں ایک سیاہ اور ایک سفید مگر ان دونوں رنگوں کے بیچ جو ایک سرمئی رنگ ہے اس پر ان کی نظر ٹھہرتے ہوئے ہچکچاتی ہے۔

میں نے بات شروع کی تھی رسمیات اور ادبی سماجیات کی اخلاقی نہج کے حوالے سے تو ہمارے مشرقی سماج کی ایک رسم یہ بھی تھی اور یقیناً آج بھی ہے کہ آدمی کو خود اپنے منہ سے اپنی تعریف نہیں کرنی چاہیے۔ البتہ شاعروں نے تعلّی کے بہانے اپنے لیے تھوڑی سی آسانیاں ضرور پیدا کرلی ہیں۔ اطہر رضوی صاحب چونکہ آدھی صدی سے زیادہ دیار مغرب میں گزار چکے ہیں لہٰذا مشرقی سماج کی یہ رسم انکساری ان کی شخصیت سے میل نہیں کھاتی۔ چنانچہ وہ اپنی کتابوں یا اپنی شخصیت کے بارے میں دوٹوک الفاظ میں خود ہی اظہار خیال کرنے سے ذرا بھی نہیں ہچکچاتے۔ مثلاً اس کتاب کے پہلے مضمون ہی میں وہ اپنی کتاب کی کراچی میں ہونے والی رسم اجرا کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''جب میری کتاب (اور پھر بریکٹ میں لکھتے ہیں) میری انتہائی اہم کتاب خدا کے منتخب بندے، کے تعلق سے گفتگو ہوئی تو مقررین نے اعتراف کیا کہ ایسی معلوماتی کتاب اردو میں کبھی نہیں لکھی گئی''...... میں نے خدا کے منتخب بندے درجنوں نہیں بیسیوں کتابیں پڑھ کر لائبریریوں میں گھنٹوں وقت صرف کر کے فلسطین کے عظیم ترین اور بزرگ ترین مورخ اور دانشور سامی بداوی سے ملاقاتوں کے بعد ایسی شخصی آنکھوں دیکھی معلومات پیش کی تھیں جن کا پاکستان کے مورخین اور محققین کے فرشتوں کو بھی علم نہ ہوگا اور پاکستان کے نام نہاد دانشوروں نے اس کی کیا قدردانی کی؟ عالی صاحب نے کہہ دیا ایسی کتاب کسی اور نے بھی لکھی ہے اور پاکستانی میڈیا نے اسے نظر انداز کر دیا۔''

''میں نے پہلی بار اردو زبان میں تاریخ عالم کی عظیم ترین شخصیتوں میں یہودیوں کی ایک فہرست فراہم کی۔ میں نے قرآن کے حوالے سے ان کے افضل ہونے کا ذکر کیا۔ میری

کتاب سے زیادہ متوازن اور منصفانہ کتاب شاید ہی کبھی لکھی گئی ہو۔"

یہ باتیں اطہر رضوی صاحب نے لکھی ہیں اور انھیں اگر سو فیصدی بھی درست مان لیا جائے تو بھی ہماری مشرقی رسمیات اور ہماری تہذیبی روایات میں ان جذبات و احساسات کے لیے آسانی سے گنجائش نہیں نکل سکے گی۔ سحر انصاری صاحب نے اطہر رضوی صاحب کی تحریروں کے ان ہی پہلوؤں کے پیش نظر یہ بات کہی ہوگی کہ وہ رسمیات اور ادبی سماجیات کی اخلاقی نہج کو برقرار رکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اسی نقطہ نظر کی روشنی میں میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اس کتاب میں جمیل الدین عالی اور حمایت علی شاعر کے بارے میں جو مضامین شامل کیے گئے ہیں ان کے مندرجات کو من و عن ہضم کرلینا بہت سوں کے لیے مشکل ہوگا۔ اور ان بہت سے لوگوں میں میں بھی اپنے آپ کو شامل سمجھتا ہوں۔ عالی صاحب اور حمایت بھائی بہر حال ہمارے دور کے اہم شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں سو گر ان پر مضامین لکھتے وقت ادبی سماجیات کا اخلاقی نہج کا ہلکا سا پردہ پڑا رہتا تو اس سے ہماری مشرقی روایات کا کچھ نہ کچھ بھرم قائم رہ جاتا اور یہ تو ہم سب جانتے ہی ہیں کہ ہماری مشرقی روایت میں "حساب دوستاں در دل" والا مقولہ بھی شامل ہے۔

ان دو مضامین کے ذکر کے ساتھ ہی مجھے اس کتاب میں شامل اطہر رضوی صاحب کے دو بہت ہی خوبصورت اور پر اثر مضامین نے اپنا گرویدہ بنالیا۔ یہ دو مضامین جو سونیا اور ثریا اور من موہن شرما کے بارے میں لکھے گئے ہیں ان میں اطہر رضوی صاحب نے گویا اپنا دل نکال کے رکھ دیا ہے۔ جو محبت، جو وارفتگی اور جو طرز احساس ان دونوں مضامین میں نظر آتا ہے وہ انھیں ایک بلند پایہ نظر نثر نگار منوانے کے لیے کافی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے خاکہ نگاری کا حق ادا کردیا۔ ثریا جی کو میں جب سے کینیڈا میں آیا ہوں تب سے جانتا ہوں اور یہ ملاقات بھی اطہر رضوی صاحب کی معرفت ہوئی تھی مگر جب میں نے یہ مضمون پڑھا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں تو آج تک ان دونوں شخصیتوں سے ملا ہی نہیں ہوں بلکہ آج پہلی بار ان

سے اور ان کی بیٹی سونیا سے مل رہا ہوں۔ یہی ایک اچھی خاکہ نگاری کا کمال ہے۔

خاکہ نگاری کے اس حسن کو دیکھنا ہو تو سونیا اور ثریا والے خاکے کے اس ٹکڑے پر ایک نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ ایک لمحے میں کیا سے کیا ہو جانے کے عمل کو کس خوبصورتی سے انھوں نے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ثریا کے گھر کے پیچھے ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا جسے یہاں بیک یارڈ کہا جاتا ہے۔ سعید صاحب نے وہاں سونیا کے لیے ایک جھولا نصب کروایا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے سونیا آٹھ ماہ کی تھی۔ ثریا نے اسے گھاس پر بٹھا کر اکیلا چھوڑ دیا تھا اس کے اطراف اس کے محبوب کھلونے تھے۔ ثریا کی پڑوسن اپنے چھوٹے کتے کے ساتھ ثریا سے ملنے آئی۔ دونوں دالان میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ پڑوسن کا کتا سونیا کے قریب کھڑا توجہ طلب کرنے کے لیے دھیمی آواز میں بھونک رہا تھا۔ یکا یک پڑوسن نے ایک بات کہی جس کی معنویت پر غور کیے بغیر اس کا اظہار کیا تھا۔ ''ثریا دیکھو سونیا جھولے کے کتنے قریب بیٹھی ہے، جھولا ہل رہا ہے اور میرا کتا بھی کچھ آواز کر رہا ہے لیکن سونیا کسی بھی جانب مڑ کر نہیں دیکھتی۔ یہ عجیب سی بات ہے نا، ارے وہ اپنی گڑیا میں اتنی مگن رہتی ہے کہ کسی آواز پر دھیان نہیں دیتی ہے۔ ثریا نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ کچھ دیر بعد ثریا کی پڑوسن اپنے کتے سمیت اپنے گھر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی ثریا نے سعید خاں کو آواز دی اور پڑوسن کے مشاہدے کا ذکر کیا۔ سعید صاحب سونیا کے قریب پہنچے پھر پیچھے ہو کر زور سے تالی بجائی اور پھر پیچھے ہو کر زور سے تالی بجائی اور پھر متواتر تالیاں بجاتے رہے۔ سونیا ایک معصوم بت کی طرح بیٹھی ہے۔ ثریا اور سعید نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور دیکھتے ہی رہے۔ اس لمحے انھوں نے کسی قسم کے اظہار خیال کو لایعنی سمجھا۔ یا یہ کہ دونوں کی نطق کی صلاحیت مفلوج ہو گئی تھی۔''

اطہر رضوی صاحب نے اس لمحے کو یہیں پر ختم کر دیا اور ایک اسٹل پکچر ہمارے سامنے پیش کر دی۔ یہ وہ لمحہ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یونہی دنیا بدلتی ہے اسی کا نام دنیا

ہے۔ اس کے بعد انھوں نے سونیا کے میڈیکل ٹسٹ وغیرہ کی تفصیل دینے کے بعد اس دلخراش لمحے کو نہایت پر اثر انداز میں بیان کیا ہے جو اس خاکہ کا نقطہ عروج ہے۔ انھوں نے لکھا کہ:

''پھر ایک دن ڈاکٹر نے ثریا اور سعید کو اپنے کمرے میں بلایا اور نہایت معذرت کے ساتھ انھیں مطلع کیا کہ سونیا سماعت کے غدود کے بغیر پیدا ہوئی ہے اور یہ کہ وہ ساری عمر سماعت سے محروم رہے گی۔ ثریا کے ہمراہ پاکستان سے آئی ہوئی ان کی بہن بھی موجود تھیں جو اس وحشت ناک خبر کو برداشت نہ کر سکیں اور بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑیں۔ ثریا اور سعید کچھ دیر تر ڈاکٹر کو دیکھتے دراصل گھورتے رہے۔ ان کی آنکھیں کھلی تھیں لب مرتعش تھے لیکن وہ گویائی سے محروم تھے۔ ثریا نے ہمت کر کے ڈاکٹر سے ایک سوال پوچھا کہ کیا سونیا سماعت سے محروم ہو کر گویائی سے بھی محروم ہو جائے گی؟ ڈاکٹر نے نہایت متانت سے جواب دیا کہ جب سونیا کسی آواز کو سن نہیں سکے گی تو اس کے دماغ کے نظام کو اس کا کوئی علم نہیں ہوگا کہ آواز کیا ہے اور اس کا فنکشن کیا ہے۔ اس طرح جب وہ کوئی آواز کوئی آہٹ سن ہی نہیں سکے گی تو اس کو اس کا علم کیسے ہوگا کہ الفاظ زبان، موسیقی یا پرندوں کی چہچہاہٹ کیا چیز ہوتی ہے نتیجتاً وہ گویائی سے بھی ہمیشہ محروم رہے گی۔''

یہ واقعہ اسی شہر ٹورنٹو میں پیش آیا تھا۔ اس وقت چھوٹی سی کمیونٹی تھی سب لوگ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک تھے۔ سب ہی اس حادثے سے واقف تھے اور یقیناً سب ہی کے دل پر اس کا اثر تھا لیکن اب میں سوچتا ہوں کہ کتنے لوگ ایسے تھے جو اطہر رضوی صاحب کی طرح اس حادثے کی گہرائی تک جا سکتے۔ کتنے ایسے لوگ تھے جو اس حادثے کی شدت کو اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کر سکے۔ انسان کے خاموش چہرے کے پیچھے کیسی کیسی کہانیاں چھپی ہوتی ہیں۔ مگر ہم ان کو پڑھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ کیسی کیسی درد کی لہریں اس دل کے سمندر میں موج تہ نشین کی طرح رواں دواں رہتی ہیں، مگر ہم انھیں محسوس کرنے سے غافل

رہتے ہیں۔ بے توجہی کی ایک دیوار سی ہمارے چاروں طرف کھنچی رہتی ہے اور ایسے میں ہمیں کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ:

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

اطہر رضوی صاحب نے اس سچائی پر پوری طرح عمل کیا اور اپنے دل کی آنکھوں سے ان شخصیتوں کو دیکھا اور صرف یہی نہیں بلکہ ہمیں ان شخصیتوں سے صحیح معنوں میں متعارف بھی کرایا۔ ایک سچے، کھرے اور مخلص ادیب سے ہم اس سے زیادہ اور کیا توقع رکھیں۔

ڈاکٹر من موہن شرما والے خاکے کو بھی میں نے اپنے پسندیدہ خاکوں میں شمار کیا ہے مگر سچی بات تو یہ ہے کہ اس کی پہلی خواندگی میں بے حد اثر انگیزی کے باوجود میں اس کی پسندیدگی کی وجہ نہ جان سکا۔ کافی سوچتا رہا کہ آخر اس میں ایسی کون سی بات ہے جو مجھے اس شخصیت کی طرف کھینچتی ہے۔ اس خاکے کی بنیاد ایک انٹرویو پر ہے۔ جس میں ان کے بارے میں چند بنیادی باتیں لکھی گئی ہیں کہ وہ مذہباً ہندو برہمن ہیں، پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں، افریقہ میں آباد ہندوستانی نژاد ہیں اور تعلیم کی غرض سے ہندوستان آئے اور وہاں ایک دن قوالی کی محفل میں شریک ہوئے اور پھر کچھ ان کا دل اردو شاعری کی طرف کھنچا اور دیوناگری رسم الخط میں انھوں نے سب سے پہلے غالب کا دیوان خریدا اور یوں ان کی اردو سے محبت کا سفر شروع ہوا اور کینیڈا میں منعقد ہونے والی ادبی محفلوں میں وہ باقاعدگی سے شرکت کرتے ہیں۔ اب اطہر رضوی صاحب کی فراہم کردہ ان معلومات میں بظاہر کوئی بات زیادہ انوکھی یا چونکا دینے والی بات نظر نہیں آتی تو پھر ڈاکٹر من موہن شرما کے اس خاکے نے میرے دل پر کیوں اتنا گہرا اثر چھوڑا۔ اس ادھیڑ بن نے مجھے اس خاکے کو کئی بار پڑھنے پر مجبور کیا اور بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کی اصل وجہ وہ سوالات ہیں جو اطہر رضوی صاحب نے براہ راست ان سے کیے ہیں۔ یہ سوالات اتنے سخت اتنے تلخ اور اتنے غصہ دلانے والے تھے کہ ان کے

جوابات بھی کم سے کم اسی تلخ اور اسی تلخ سے دیے جانے چاہیے تھے۔ مگر ہوا یہ کہ جب ان سوالوں کے انگارے ان کی طرف آئے تو شرما صاحب نے ان انگاروں کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہی پھولوں میں تبدیل کر دیا اور ان سوالوں کے جوابات اتنی شائستگی اور نرمی سے دیے کہ جن کی توقع ایک عام انسان سے نہیں کی جاسکتی۔ یہ آگ کو گلزار میں تبدیل کر دینے کا عمل در اصل پیغمبروں کی سنت ہے، درویشوں کا مسلک ہے، سنتوں کا راستہ ہے اور صوفیوں کا وطیرہ ہے۔ ان جوابات کی روشنی میں شرما صاحب کی شخصیت کا قد اونچے سے اونچا ہوتا چلا جاتا ہے۔ بھلا بتائیے ایک ہندو برہمن سے ایک مسلمان سید یہ پوچھ رہا ہے کہ:

ہندوستان سے صدیوں پرانی رسومات، جو کچھ ناپسندیدہ، کہیں شرمناک اور بعض گھناؤنی محسوس ہوتی ہیں ان کا خاتمہ کبھی ہو سکے گا؟

''جانوروں کو مقدس سمجھنا خصوصاً گائے کی پرستش اس کے پیشاب کو آب نجات تصور کرنا، گنگا کے دریا میں جہاں لاشیں اور انسانی فضلہ ساتھ ساتھ بہتے ہیں، اس میں اشنان کرنے کو نروان کے مترادف تصور کرنا، اکیسویں صدی کا پروردہ تعلیم یافتہ نوجوان ان لعنتوں کو کب تک برداشت کرے گا؟

تو ایسے بہت سے سخت اور تند و تیز سوالات اطہر رضوی صاحب نے شرما صاحب سے کیے مگر ان کی تیوری پر ذرا سا بھی بل نہیں آیا۔ انھوں نے تمام سوالوں کے ہنس ہنس کر دھیمے دھیمے اور سمجھانے والے انداز میں جوابات دیے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے منہ سے نکلے ہوئے ہر لفظ نے ان کی شخصیت کے گرد ایک ایسا ہالا بنا دیا کہ جہاں صرف روشنی ہی روشنی ہے، پیار ہی پیار ہے، حسن ہی حسن ہے۔ چنانچہ اطہر رضوی صاحب کی اس تحریر کے ذریعہ اس موہنی صورت اور درویشوں والی سیرت رکھنے والے بت ہندی کی زلفوں کے سب ہی پڑھنے والے اسیر ہو جاتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اطہر رضوی صاحب کی تحریر کی وجہ سے ہوا سو انھیں اس پر مبارکباد دینا ہم سب کا فرض بنتا ہے۔

ایک اور خاص بات جو اس کتاب میں نمایاں نظر آتی ہے وہ اطہر رضوی کا یہ مخصوص انداز ہے کہ وہ ان کو لکھے گئے کسی ذاتی خط یا ان سے ٹیلی فون پر کی جانے والی گفتگو کو بھی بہت ذوق وشوق سے استناد کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح تحریر میں ایک دلچسپ تڑکا لگ جاتا ہے۔ مثلاً ستیہ پال آنند کے حوالے سے انھوں نے نیو یارک کے کسی بنیاد پرست مسلمان کے فون کا ذکر کیا۔ (نام انھوں نے نہیں لکھا) جس نے کہا جناب جب ستیہ پال آنند مسلمانوں کے اتنے مداح ہیں اور حضور اکرم کی شان میں نعت تک لکھتے ہیں تو پھر آخر وہ مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے؟ اطہر رضوی صاحب لکھتے ہیں کہ:

"یہ سن کر میں کچھ دیر سناٹے میں رہا اس لیے کہ ان صاحب کے لہجے میں ستیہ پال کی عقیدت کے تعلق سے ڈھکی چھپی تشکیک کی جھلک تھی۔ پھر مجھے حقی صاحب کا جملہ یاد آیا کہ ہم مسلمانوں میں کوٹ کوٹ کر عصبیت بھری ہوئی ہے۔"

اب ظاہر ہے کہ اگر وہ ٹیلی فون پر ہونے والی یہ گفتگو معرض تحریر میں نہ لاتے تو پھر مسلمانوں کے اندر دو الگ الگ طرز فکر کی یہ صورت سامنے نہ آتی۔ اسی طرح انھوں نے حقی صاحب کے ایک خط کا بھی اپنے مضمون میں حوالہ دیا ہے۔ انھوں نے اس کا پس منظر بھی بیان کیا ہے جو اس کتاب میں شامل حقی صاحب پر لکھے گئے ان کے مضمون میں آپ پڑھ سکتے ہیں تو ان کے خط کے جواب میں حقی صاحب نے لکھا کہ:

"اطہر صاحب ایک اچھا مسلمان بڑی حد تک شیعہ ہی ہوتا ہے"

تو اب اس قسم کی باتیں ادبی تحریر میں تو مشکل سے بیان کی جاتی ہیں لیکن گفتگو حقی صاحب کی ہو اور بیان اطہر رضوی صاحب کا تو پھر غالب کی زبان میں کیوں نہ کہا جائے کہ:

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

ویسے حقی صاحب بلاشبہ ایک سیکولر مزاج کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنے ایک انٹرویو

میں کہیں کہا تھا اور جس کا حوالہ اپنے مضمون میں اطہر رضوی صاحب نے بھی دیا ہے اور اسی پر میں اپنے اس مضمون کا اختتام کروں گا۔ حقی صاحب نے کہا کہ:

''میں ہر طرح کی عصبیت سے پناہ مانگتا ہوں اور حقائق سے اغراض برتنے کا قائل نہیں۔ ہم اپنے نفس کو دھوکہ دے کر فلاح کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ خلوص فکر اور خلوص جذبات کے بغیر بات نہیں بنتی۔ عصبیت سے چھٹکارا پانا بڑا مشکل ہے لیکن اہل علم اور اہل ادب کو عصبیت سے بیعت کر لینا زیب نہیں دیتا۔ وہ جو غالب نے کہا تھا کہ شیعی کیوں کر ہو ماوراء النہری، تو بھائی میں نے تو پاکستان کے اسلامی معاشرے میں رہتے ہوئے بھگوت گیتا اور ارتھ شاستر کا ترجمہ کیا اور بندے ماترم کا بھی جس سے مسلمانوں کو چڑ تھی۔''

اطہر رضوی صاحب نے حقی صاحب پر لکھے گئے اپنے مضمون میں جس دیانتداری سے ان کی سیکولر فکر کو نمایاں کیا ہے اس کے لیے وہ ہر غیر متعصب شخص کی نگاہوں میں اپنے لیے احترام پائیں گے اور اس حوالے سے میں بھی اپنے آپ کو ان کے لیے سراپا احترام پاتا ہوں۔

اطہر رضوی۔ ایک ثقافتی شہزادہ

پروفیسر ڈاکٹر سید وقار احمد رضوی، کراچی
پاکستان

اطہر رضوی، ایک مدنی الطبع انسان ہیں۔ ان کے تین اقانیم ثلاثہ ہیں۔ یعنی اردو، اسلام اور ثقافت۔ میں نے ان کو ثقافتی شہزادہ اس لیے کہا ہے کہ انھوں نے کینیڈا میں تہذیب وثقافت کے چراغ جلائے ہیں۔ اردو سے ان کو بے پناہ محبت ہے۔ اور اسلام کے وہ شیدائی ہیں۔ اردو پاکستان کی شناخت ہے۔ اس لیے وہ اس تہذیبی شناخت کو باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے ہجرت کی ہے۔ لیکن اس ہجرت میں انھوں نے اتباع رسول کی پیروی کرتے ہوئے ایثار وقربانی سے کام لیا ہے۔ وہ ان اہل خرد میں سے ہیں جو اخلاق وکردار کی پاسداری کرتے ہیں اطہر رضوی کی کتاب۔ چہرے باتیں یادیں لوگ ان کے تحریر کردہ خاکوں کا مجموعہ ہے۔ ان کے خاکے قلب و دماغ کو متاثر کرتے ہیں۔ ان کے خاکوں میں سرسبز و شاداب پتیاں ہیں۔ جو ذہن کو بالیدگی عطا کرتی ہیں۔ ان کے خاکے کیا ہیں پتھروں کو تراش کر ہیرا بنادیا ہے۔ انسان دوستی، کشادہ دلی اور حسن کلام اطہر رضوی کی خصوصیات ہیں۔ وہ ایک فعال اور متحرک انسان ہیں۔ وہ اپنے چہرے پر ایک معصوم سی مسکراہٹ سجا کر فکر کی برق پاشی کرتے ہیں۔ وہ ایک باغ و بہار شخصیت ہیں اور ایک ثقافتی انسان ہیں۔

وہ دل کے تونگر ہیں اور اسلامی تہذیب وثقافت کے دلدادہ ہیں۔ انھوں نے کینیڈا میں گلشن اردو کی آبیاری کی ہے۔ وہ خوش مزاج وخوش کلام اور خوش خصال شخصیت ہیں۔ غالب شناسی کی جو مہم انھوں نے کینیڈا میں چلائی ہے۔ وہ فلسفہ غالب کو سمجھنے میں معاون و مددگار

ثابت ہورہی ہے۔ ملت بیضا سے بھی اطہر رضوی کی دلچسپی جنون کی حد تک ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں بوسنیا کے مسلمانوں پر مظالم سے ان کا دل دھڑکا اور انھوں نے بہ نفس نفیس سر بیا جاکر مسلمانوں کی حالت زار کا جائزہ لیا۔ مظالم کے واقعات کو انھوں نے دردمندی سے قلم بند کیا۔

جہاں تک ان کے خاکوں کا تعلق ہے تو ان کی کتاب چہرے باتیں یادیں لوگ میں گیارہ خاکے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔ ۱۔ عالی صاحب ۲۔ ستیہ پال آنند ۳۔ سلطانہ مہر، ۴۔ حمایت علی شاعر۔ ۵۔ حقی صاحب ۶۔ نسیم سید ۷۔ اکرام صاحب۔ ۸۔ گیان چند جین ۹۔ ثریا اور سونیا ۱۰۔ من موہن شرما ۱۱۔ الیکو نڈر پشکن۔

ان خاکوں میں کوئی رومانوی تصور نہیں بلکہ انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے ان خاکوں میں سماجی ارتقاء کے ساتھ ان عوامل کی نشاندہی کی ہے۔ جو ان شخصیات کے پیکر میں کارفرما ہیں۔ انھوں نے سماجی جدوجہد اور ادبی کاوشوں کو مدنظر رکھتے ہوئے خاکہ نگاری کی ہے۔ ان کے خاکے مقاصد کی تشریح وتعبیر پیش کرتے ہیں۔ اطہر رضوی ایک ادبی معاشرتی انسان ہیں۔ ان خاکوں میں انھوں نے عشق کی تقویم نہیں لکھی بلکہ فکر واسلوب کے گوہر آبدار لٹائے ہیں۔

انھوں نے تمثال نگاری، تصویر آفرینی اور محاکات نگاری سے کام لیا ہے۔ انھوں نے تجربہ ومشاہدہ سے کام لیتے ہوئے تخلیق کے پیکر تراشے ہیں۔ ان کی چشم نگارش شخصیت کو اس طرح دیکھتی ہے جیسی وہ ہے۔ انھوں نے لفظوں کے حوالے سے حسن انتخاب اور حسن ترتیب سے کام لیا ہے۔ ان کے خاکے علامتی پیکر ہیں۔ ان کی تحریر دل آویز ہے لیکن پراسرار نہیں۔ انھوں نے اپنے خاکوں میں سماج اور کردار کو پیش کرتے ہوئے کرداروں کی تحت الشعور کیفیتوں کو واضح کیا ہے۔ اور شخصیت کے نقوش کو ابھارا ہے۔ اطہر رضوی علم وادب سے محبت، بزرگوں کا احترام اور الجھے ہوئے معاملات کو سلجھے ہوئے انداز سے پیش کرتے ہیں۔

مجھے ان کے خاکوں میں حقی صاحب کا خاکہ بہت پسند آیا۔ مصنف نے ان کی شخصیت کو اعلیٰ ظرفی، بلند ہمتی اور انسانی عظمت کا پیکر بتایا ہے۔ ان کے حالات اور واقعات کو نہایت اختصار و جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ فنی اعتبار سے یہ ایک جامع خاکہ ہے۔ جس کی زبان سلیس اور شگفتہ ہے۔

اکرام بریلوی صاحب کے خاکے میں اطہر رضوی نے ان کے خدو خال، لباس، وضع قطع، ان کی نشست و برخاست کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ان کی محبت، شفقت عادات و اطوار اور لطف اندوز مذاق کا ذکر کیا ہے۔

حمایت علی شاعر کے خاکے میں شخصیت کی بڑی خوبصورتی سے تصویر کشی کی ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ فنی اعتبار سے یہ خاکہ دلکش اور خیال انگیز ہے۔ نسیم سید پر خوبصورت خاکہ ہے۔ اس میں اطہر رضوی نے اپنی ملاقاتوں کے خوشگوار احساسات اور یادوں کو قلم بند کیا ہے۔ ان کی شخصیت میں شرقی اقدار و روایات۔ خوش اخلاقی، سنجیدگی و شوخی کا ذکر ہے۔ سلطانہ مہر کے خاکے میں لطافت خیال کا عکس ہے۔ ان کے فن اور شخصیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اور شخصیت کے نقوش واضح کیے ہیں۔ ستیہ پال آنند کے خاکے میں ان کے اردگرد کے ماحول سے پروان چڑھنے والے ادبی ذوق کو بیان کیا ہے۔ گیان چند جین کے خاکے میں ان کی علمی ادبی اور تحقیقی سرگرمیوں کا ذکر ہے۔ غرض جیسا کہ اطہر رضوی کی اس کتاب کا نام ہے۔ چہرے باتیں یادیں لوگ کو اس کتاب میں چہرے یعنی خاکے باتیں یعنی ملاقاتیں اور لوگوں کے بارے میں اپنی یادوں کو مجتمع کیا ہے۔ گویا یہ ایک طرح سے ان کی Memoirs ہیں۔ جو انھوں نے کیے ہیں،۔ ان خاکوں میں اسلوب بیان، جدت، سادگی اور دلچسپی ہے۔ اطہر رضوی کے خاکوں میں خیالات کی بلندی، وسعت معلومات اور زبان کی حلاوت ہے۔ ان کے خاکے ادبی، معاشرتی، تہذیبی، ثقافتی نوعیت کے ہیں۔ ان کا اسلوب نرم و نازک ہے، زبان سادہ اور دلآویز ہے۔

ان کا قلم حقیقت سے لبریز ہے۔ ایک عہد کی تاریخ ہے جس کو دلکش انداز میں کیا گیا ہے۔ ان خاکوں میں علم وہنر اور تہذیب وثقافت کی کہانی ہے۔

خاکہ نگاری، تاریخ اور سوانح نگاری سے الگ چیز ہے۔ کیوں کہ تاریخ شخصیت کے کارناموں سے بحث کرتی ہے۔ اور سوانح نگاری شخصیت کی سوانح عمری ہوتی ہے۔ جب کہ خاکہ نگاری میں شخصیت کی جھلک منعکس ہوتی ہے اس لحاظ سے خاکہ نگاری اپنی ساخت اور فن کے اعتبار سے تاریخ وسوانح سے مختلف چیز ہے۔ خاکہ کسی بھی شخصیت کی جیتی جاگتی چلتی پھرتی تصویر ہوتا ہے۔ جیسا کہ اطہر رضوی کے ان خاکوں میں نظر آتی ہے۔

تاریخ کی وہ کتابیں جو محض خشک حوادث کا مجموعہ ہوں ان کو تاریخ کا مادہ خام کہا جاسکتا ہے۔ اس لیے تاریخ علم وفن کی کڑی ہے۔ جب کہ خاکہ نگاری صنف ادب ہے میں اطہر رضوی کی اس کتاب کو خاکہ نگاری تسلیم کرتا ہوں۔ جو اردو میں خاکہ نگاری کی اچھی تصنیف ہے۔

اردو میں اگر چہ خاکہ نگاری پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً رئیس احمد جعفری کی دید وشنید، اعجاز حسین کی جان پہچان، فکر تونسوی کی خدوخال جگناتھ آزاد کی'' اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں۔ منٹو کی کتاب۔ گنجے فرشتے عبدالمجید سالک کی یاران کہن۔ نقوش کا شخصیات نمبر، ممتاز مفتی کی پیاز کے چھلکے۔ شاہد دہلوی کی کتاب گنجینۂ گوہر سید ضمیر جعفری کی کتابی چہرے یہ سب کتابیں اردو ادب میں خاکہ نگاری کا سردار ہیں۔

اردو ادب میں خاکہ نگاری کے اس سرمایہ میں اطہر رضوی کی کتاب چہرے باتیں یادیں لوگ ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ میں اطہر رضوی کو اتنی اچھی کتاب لکھنے پر صمیم قلب سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ وہ یقیناً علم وادب کا ایک روشن ستارہ ہیں۔

چہرے، باتیں، یادیں لوگ

اختر جمال، اوٹاوا کناڈا

اردو خاکہ نگاری کا سفر آب حیات کے زندہ جاوید خاکوں اور تذکروں سے شروع ہوا۔ محمد حسین آزاد نے خاکہ نگاری اور تذکرہ نگاری کو اس طرح یکجا کیا تھا کہ تاریخ ادب میں اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ہے۔ وہ زبان و بیان بھی آزاد کے بعد کسی سے ممکن نہیں ہو سکی۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کا نام خاکہ نگاری میں دوسرا اہم نام ہے۔ انھوں نے طنز وظرافت سے ایسے لطیف مزاح کو تخلیق کیا کہ ان کے خاکے جاندار خاکے بن گئے۔ کرداروں کا چلتا پھرتا آئینہ، جیسے ٹیلی ویژن پر مولوی نذیر احمد سامنے چل پھر رہے ہیں سانس لے رہے ہیں۔

رشید احمد صدیقی کے خاکے مہذب مزاح اور لطیف طنز کے انداز اور زبان و بیان کی خوبیوں کی وجہ سے منفرد ہیں ان کے بہت سے جملے ضرب المثل بن گئے ہیں۔ ترقی پسند ادب کے ساتھ خاکہ نگاری کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ عصمت اور منٹو کی حقیقت نگاری ایک نشتر سے شخصیت کی پرتوں کو کھولتی ہے۔ عصمت نے دوزخی لکھ کر حقیقت نگاری کی ایک سنگدل مثال پیش کی ہے۔ شوکت تھانوی کے خاکے ان کے مخصوص مزاح کا رنگ لیے ہیں۔

خاکہ نگاری کے اہم ناموں میں ایک نام محمد طفیل ایڈیٹر نقوش کا ہے ان کے خاکوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ انھوں نے ادب اور احتیاط کے تقاضہ کے ساتھ قلم اٹھایا ہے جن ادیبوں سے ان کے مراسم تھے ان کے خاکے لکھے ہیں۔

وہ کسی کا دل نہ دکھا سکتے تھے اس لیے شخصیت کی کمزوریوں پر بھی ہمدردی سے روشنی

ڈالی ہے۔ پڑھنے والوں کو بعض دفعہ خامی بھی خوبی معلوم ہونے لگتی ہے۔ جوش صاحب اور احمد ندیم قاسمی اور اپنے عہد کے ممتاز ادیبوں کے بارے میں یہ خاکے ہیں۔

ہمارے عہد کے ممتاز افسانہ نگار ممتاز مفتی کے خاکے بھی دلچسپ اور رنگا رنگ ہیں۔ ممتاز مفتی کی افسانہ نگاری کا مخصوص رنگ ان خاکوں میں بھی ہے۔ وہ خاکے جو انھوں نے خواتین کے لکھے ہیں زیادہ دلچسپ ہیں۔

ٹورنٹو اردو کا نیا مرکز ہے اور اب یہ بہت بڑا اور اہم مرکز اس لیے بھی بن گیا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے ادیبوں کا مشترکہ پلیٹ فارم بن گیا ہے۔ یہاں بہت اچھی اچھی کتابیں لکھی جارہی ہیں جو ہندوستان یا پاکستان سے چھپ کر آجاتی ہیں۔ یہاں کے لکھنے والوں میں ایک نیا اور اہم نام اطہر رضوی صاحب کا ہے۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ "چہرے باتیں یادیں لوگ" سامنے آیا ہے۔ ان خاکوں کی زبان اور بیان میں تازگی اور شگفتگی ہے۔ ان خاکوں کا ایک انفرادی رنگ ہے۔ اطہر رضوی صاحب نے اپنے ذاتی تعلقات کے آئینہ میں شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے سرچ لائٹ ڈال کر دیکھا ہے۔ صاحب شخصیت کی خوبیاں بھی تفصیل سے ہیں اور خامیاں بھی تفصیل سے ہیں۔

حقی صاحب کا خاکہ ان کے علم و فضل اور ان کی شاعری اور بہت سی جہتوں میں ان کی ادبی خدمات کا کھلے دل سے اور بہت محبت اور محنت سے اعتراف ہے اور لفظوں سے عقیدت کے پھول پیش کیے ہیں۔ حقی صاحب بجا طور پر اس کے حقدار بھی تھے۔ اکرام بریلوی صاحب اور نسیم سید کے خاکے خلوص دل سے لکھے گئے ہیں جو خوبیاں ان لوگوں میں نظر آئیں وہ اس طرح قلمبند کی ہیں کہ ان کو پڑھتے ہوئے قاری کو جان پہچان کا احساس ہوتا ہے۔ یہ شخصیات بھی ادب میں اپنا اپنا مقام رکھتی ہیں۔

ستیہ پال آنند کی ادبی خدمات کا بھی تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ ان کی گنگا جمنی تہذیب کی خوبیوں کو سراہا ہے اور ان کے نظریات سے جہاں جہاں اختلاف ہے صاف گوئی سے ذکر

کیا ہے۔ دراصل یہ صاف گوئی اور سچائی اطہر رضوی کے قلم کی ایک پہچان نظر آتی ہے۔ وہ مروت سے کام نہیں لیتے جرأت اظہار اتنی ہے کہ وہ لگی لپٹی رکھنے کے قائل نہیں ہیں۔ خاص کر جن شخصیات کے بارے میں سرچ لائٹ کا ذکر کیا ہے ان میں جمیل الدین عالی، گیان چند جین اور حمایت علی شاعر کا خصوصی نام ہے۔

عام طور پر قاری جب کسی ادیب یا شاعر کو پڑھتا ہے تو اس کی شاعری اور ادبی کاوشوں پر نظر ڈال کر اس کا ایک خاکہ ذہن میں بناتا ہے کیونکہ صاحب کتاب سے کتاب کے علاوہ اس کا اور تعارف نہیں ہوتا۔ لکھنے والے کے زبان و بیان اور خیالات ہی کی مدد سے پڑھنے والا ذہن میں خاکہ بناتا ہے۔ اس لیے حمایت علی شاعر کے بہت اچھے اشعار ہی ان کا تعارف کراتے ہیں۔ جمیل الدین عالی کے دوہوں اور ترانوں سے ان کی شخصیت کا سراپا بنتا ہے۔ دوہوں کی نغمگی اور مٹھاس ان کی باقی شاعری سے بھی الگ ہے۔ اس لیے ان شخصیات کے خاکے پڑھ کر بڑا تعجب سا ہوتا ہے کہ ان کی شاعری میں اور شخصیت میں اتنا تضاد کیسے ہے۔ اطہر صاحب نے دل شکستہ لے کر قلم اٹھایا ہے ان سے ہمدردی بھی محسوس ہوتی ہے اور خیال آتا ہے کہ ان کے ساتھ واقعی زیادتی ہوئی ہے جسے وہ معاف نہیں کر سکتے۔

گیان چند جین کے خطوط سے ان کی سیرت کے گوشوں پر نظر پڑتی ہے تو افسوس ہوتا ہے کہ پڑھنے والے انھیں اسکالر اور استاد کی حیثیت سے ہی جانتے ہیں۔

سلطانہ مہر کا خاکہ بھی ان کی شخصیت کا ایک دل پذیر تعارف ہے۔ سلطانہ نے بہت سی جہتوں میں قلم اٹھایا ہے صحافی، تذکرہ نگار، ادیبہ شاعرہ۔ انھوں نے بہت اچھی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ سلطانہ نے محنت سے ہر کام کیا ہے اور محنت سے بھرپور زندگی اور جدوجہد کا آئینہ سامنے آتا ہے۔ اور یہ خاکہ ایک بہت اچھا خاکہ ہے۔

اس کتاب کا سب سے اچھا خاکہ ''سونیا'' ہے۔ خالق نے انسان کی تخلیق کرتے ہوئے جو شعور اور ادراک کی دولت انسان کو عطا کی ہے وہ لا انتہا ہے اور اگر کسی میں کوئی

جسمانی کمی یا کمزوری ہے تو اس کی تلافی قدرت نے شعور اور آگہی کی روشنی بڑھا کر کردی ہے۔ اکثر نابینا افراد جب کرسیاں بنتے ہیں تو ان کے ہاتھ ہی ان کی آنکھیں بن جاتے ہیں اور وہ ان سے زیادہ تیزی سے ہاتھ چلاتے ہیں جو دیکھ دیکھ کر کرسیاں بنتے ہیں۔

اگر سونیا قوت سماعت سے محروم ہے تو قدرت نے اس کی تلافی شعور اور آگہی کی دولت سے پوری کردی اور اسے بے مثال روحانی قوت عطا کی ہے۔ خوش قسمتی سے وہ ایک ایسے ملک میں پلی بڑھی ہے جہاں اس کی صلاحیتوں کو نشوونما دینے کی آسانیاں ہیں۔ سائنس اگر انسانی بہبود کے لیے استعمال ہو تو دنیا جنت بن جائے۔ ماں باپ یوں تو خدا کی رحمت ہیں مگر قدرت نے سونیا کو ماں باپ بھی چن کر دیے جو مثالی ماں باپ نظر آتے ہیں۔ ثریا اور سونیا دونوں کے لیے پڑھنے والے کے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔

آخر میں انھوں نے پشکن پر جو مضمون لکھا ہے وہ بھی کتاب میں شامل ہے۔ یہ ایک سیر حاصل مضمون ہے جس میں پشکن کے فن اور شخصیت کا جائزہ ہے۔ ہندوستان میں روسی ادب کے اردو میں بہت تراجم ہوئے اور پشکن کے ڈرامے اور شاعری کی مقبولیت بڑھی ہے اس سے پہلے صرف انگریزی ترجموں کی وساطت سے روسی ادب تک پہنچ تھی۔ پشکن سے اردو کے شعرا کافی متاثر بھی رہے ہیں اور دنیا کے کلاسیکی ادب میں پشکن کا خاص مقام ہے۔

اس مضمون میں جوش صاحب کا بھی ذکر کیا ہے۔ جوش صاحب کا انتقال کراچی میں نہیں اسلام آباد میں ہوا تھا۔ وہ کافی عرصہ بیمار رہے تھے ان کی عیادت کے لیے بھی اسلام آباد کے ادیب جاتے رہے اور ان کے انتقال پر اسلام آباد کے ادیبوں اور شاعروں اور ادب دوستوں کی ایک بڑی تعداد جنازے میں شامل تھی۔ یہ اور بات ہے کہ دوسرے دن ایک مسجد سے ان کے بارے میں یہ بات کہی گئی کہ جوش صاحب کی نماز جنازہ پڑھنے والے کافر ہیں۔ جوش صاحب کا مزار غریب اسلام آباد کے بڑے سے قبرستان میں گیٹ پر داخل ہوتے ہی نظر آتا ہے۔ کاش یہ مزار ان کے شایان شان بنایا جاتا جو ان کا حق تھا۔

جب عصمت چغتائی پاکستان اور اسلام آباد آئیں تو انھوں نے ہمارے ہی گھر قیام کیا تھا۔ انھوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں جوش صاحب سے ان کی جو باتیں ہوں وہ سب ٹیپ کروں جو وہ ہندوستان لے جاکر ادیبوں کو سنائیں گی۔ دوسرے دن جب وہ میرے اور احسن کے ساتھ جوش صاحب سے ملنے گئیں تو میں نے گفتگو ٹیپ کی۔ جوش صاحب تڑپ کر ہندوستان کو یاد کرتے رہے وہ اردو زبان اور اولاد کی وجہ سے پاکستان آئے تھے۔ عصمت آپا سے جوش صاحب نے اپنی ایک مثنوی ''انسان'' کا ذکر کیا تھا۔ اس مثنوی کے بارے میں انھوں نے کہا کہ اس کے ذریعہ ان کا فلسفہ اور فکر کو سمجھا جاسکے گا۔ یہ ان کی ساری عمر کی محنت اور علم کا حاصل تھا۔

بھوپال سے اختر سعید جب اسلام آباد آئے تو وہ بھی میرے اور احسن کے ساتھ جوش صاحب سے ملنے گئے۔ اس موقع پر جوش صاحب نے پھر اپنی مثنوی انسان کا ذکر کیا اور پھر میرے میاں حسن علی خاں سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ محمد طفیل سے کہیں کہ وہ اپنے ادارے سے اس مثنوی کو شائع کریں۔

جوش صاحب پھر اس کے بعد بیمار ہوئے اور ان کا انتقال ہوگیا۔ جب طفیل بھائی سے یہ بات کی میں اس مثنوی کو اہتمام سے شائع کروں گا'' طفیل بھائی نے یہ کام میرے سپرد کیا کہ میں ان کے خاندان سے مثنوی انھیں دلوادوں۔ تبسم آفریدی میری شاگردہ جوش صاحب کی پوتی تھی اس کے ذریعہ میں نے کوشش کی کہ طفیل بھائی کو مثنوی مل جائے۔ تبسم نے کہا ''میرے گھر والے یہ سمجھتے ہیں کہ اس مثنوی کا چھپنا ہمارے خاندان کے لیے مناسب نہیں ہے۔ اس سے ہمیں نقصان ہوسکتا ہے۔''

جوش صاحب کے وارث کفر کے فتوے سے ڈر گئے جو اس زمانے میں جوش صاحب پر لگ رہے تھے۔ کاش وہ مثنوی چھپ سکتی۔

چہرے باتیں یادیں لوگ — ایک مختصر جائزہ

نسیم انجم، کراچی، پاکستان

''چہرے باتیں یادیں لوگ'' کناڈا سے آئے ہوئے ممتاز و معتبر ادیب اطہر رضوی کی تصنیف و تالیف کے اعتبار سے یہ تیرہویں کتاب ہے جسے انھوں بے حد مشقت، لگن اور خلوص دل کے ساتھ تصنیف کیا ہے۔ ''خلوص'' کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ ہر تخلیقی کاوش خلوص و محبت کے تحت ہی وجود میں آتی ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ بعض اوقات ناخوشگوار و ناپسندیدہ واقعات کے اظہار کو بھی بہ حالت مجبوری بے حد تہذیب، شائستگی اور محبت کی چاشنی میں ڈبو کر کیا جاتا ہے۔ ویسے بھی اگر غور کیا جائے تو شعر و ادب سے تعلق رکھنے والوں کا شمار شرفاء میں ہی ہوتا ہے اور شریف انسان ہر کام کرتے وقت اخلاقی تقاضوں کو مدنظر رکھتا ہے۔ رہی غصے یا نفرت کی بات تو نفرت و محبت بھی انسانی جبلت کا حصہ ہیں۔ قلم کار دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ حساس ہوتا ہے لہٰذا ہر ناخوشگوار یا ناپسندیدہ باتوں کا اثر بھی زیادہ لیتا ہے لیکن اللہ رب العزت نے اسے بے حد مضبوط، منفرد اور موثر ہتھیار بھی دیا ہے۔ وہ اس ہتھیار یعنی اپنے قلم کے ذریعے ہر دکھ سکھ کے واقعہ کو بے حد سلیقے اور خوبصورتی کے ساتھ بیان کر دیتا ہے۔

مذکورہ کتاب میں اطہر رضوی نے اپنے مشاہدات و تجربات کو بے حد نفاست کے ساتھ تحریر کے قالب میں ڈھالا ہے۔ ''چہرے باتیں یادیں لوگ'' کی تحریروں کو مضامین کہا جائے یا خاکے، یہ ایک علاحدہ بحث ہے۔ اس حوالے سے مصنف نے اپنے مضمون ''سرحرف'' میں لکھا

ہے کہ ''یہ کتاب میری شخصی یادوں، ذاتی تجربوں اور میرے حافظے کی ساغاتوں کا مجموعہ ہے، اس میں پیش کی گئی نگارشات خاکے ہیں یا تذکرے۔ مضامین ہیں یا کوائف، میرے نزدیک اس کی تقویم ضروری نہیں۔'' بہر حال یہ بات تو طے ہے کہ ''چہرے باتیں یادیں لوگ'' نثری تصنیف ہے۔ مصنف نے بے حد سادہ سلیس اور دل نشیں انداز میں مضامین رقم کیے ہیں۔ قاری ان مضامین کو پڑھتے ہوئے تحریری دلچسپی کے ساتھ اختتام کو پہنچ جاتا ہے۔ اس بات میں رتی بھر بھی شک وشبے کی گنجائش نہیں ہے کہ اطہر رضوی کے یہ نثر پارے کرداروں کے حوالے سے بہت سے راز منکشف کرتے ہیں اور مخفی باتوں کو سامنے لاتے ہیں۔

اطہر رضوی کی اس کتاب کو پڑھنے کا مجھے بے حد کم وقت ڈاک کے ناقص نظام کی وجہ سے میسر آیا۔ بہر حال اطہر رضوی کی تحریروں کو اس قلیل وقت میں جس قدر پڑھ اور سمجھ سکی ہوں اس سے مجھے ان کی شخصیت کو سمجھنے میں بے حد مدد ملی۔ اس سے پہلے کہ ہم دوسری اہم شخصیات کو زیر بحث لائیں، کیوں نہ پہلے مصنف کے حوالے سے کچھ باتیں ہو جائیں۔ جہاں تک میں سمجھ سکی ہوں وہ یہ ہے کہ اطہر رضوی بے حد سادہ مزاج شریف النفس، سچے اور کھرے انسان ہیں۔ ایثار و قربانی اور احسان کرنے کے وصف سے مالا مال ہیں اور یہ ان کی خوش قسمتی ہے۔ منافقت اور ریاکاری سے کوسوں دور ہیں، خود غرضی اور مفاد پرستی سے ان کا دور دور کا بھی واسطہ نہیں۔ محب وطن ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سچے مسلمان بھی ہیں۔ میں پھر وہی اپنا جملہ دہراؤں گی کہ یہ بھی ان کی خوش قسمتی ہے۔ ایسے پرخلوص اور بے لوث محبت کرنے والے خود تکلیف اور نقصان اٹھاتے ہیں اور ''کر بھلا، ہو بھلا'' کے مصداق لوگوں کے کام آتے ہیں اور ان کے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ان کا اپنا بھلا جنھیں وہ اپنا سمجھتے ہیں، ان کے ہاتھوں نہیں ہوتا ہے، بلکہ ان کے حصے میں نیکی کے بدلے برائی آتی ہے۔ اس طرح وہ چوٹ کھاتے ہیں اور زخم بڑھاتے جاتے ہیں اطہر رضوی کے لیے ہمارا مشورہ یہی ہے کہ وہ خاطر جمع رکھیں۔ نیکی کا صلہ اور بدی کا بدلہ تو اللہ سے بہتر اور کوئی نہیں

دے سکتا۔

زیر نظر کتاب میں ترتیب کے اعتبار سے تیسرے نمبر پر سلطانہ مہر پر مضمون ہے۔مضمون کیا ہے، معلومات کا خزانہ ہے۔ اس خزانے کو اطہر رضوی نے بے حد عزت واحترام اور خلوص کے ساتھ مضمون نما پٹارے میں بند کر کے اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کیا ہے۔

اس مضمون میں بہت سی وہ باتیں بھی سامنے آئی ہیں جن سے بہت سے لوگ اب تک نہ واقف تھے۔ایک تو یہی بات بڑی حیرت کی ہے کہ اردو کی بڑی ادیبہ، شاعرہ، تذکرہ نگار اور صحافی اہل زبان نہیں ہے بلکہ ان کی مادری زبان گجراتی ہے اور وہ اردو زبان پر کس شان سے حکومت کر رہی ہیں۔ بے شک ان کی اردو سے محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ مادری زبان گجراتی ہونے کے باوجود انھوں نے اردو زبان میں شعر وادب کے حوالے سے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں۔

مصنف نے سلطانہ مہر کے ادبی کارناموں اور ان کی ادب سے بے پایاں محبت، ادبی کاوشوں، افسانوں، ناولوں تذکرہ نویسی اور شاعری کے حوالے سے بے حد خوبصوتی کے ساتھ اپنے مضمون کا احاطہ کیا ہے۔ سلطانہ مہر کی ذاتی زندگی، جس میں ان کے شوہر اور بچے ہیں، ان کے بارے میں بھی مختصراً بتایا گیا ہے۔صحافتی زندگی میں ابراہیم جلیس جیسی قد آور شخصیت کی گفتگو جو کہ مکالموں کی صورت میں بھی بیان کی ہے۔ ابراہیم جلیس کے ساتھ ناقدین علم وادب نے سلطانہ مہر کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف بے حد سچائی اور خلوص ومحبت کے ساتھ کیا ہے۔ یقیناً ناقدوں کی طرف سے ان کی شعروسخن پر تعریف وتوصیف سلطانہ مہر کے لیے اعزاز کی بات ہے۔ سلطانہ مہر کی ادبی زندگی کے ہر گوشے پر اطہر رضوی نے بے حد موثر انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ ساتھ ساتھ مصنف کی اس خوبی اور وسیع النظری کی تعریف کرتی چلوں کہ انھوں نے اپنے مضامین میں جہاں بھی موقع ملا، خواتین کی محنت، لگن اور شعری وادبی کاوشوں

کا اعتراف بھی کیا ہے اور اس بات کا اظہار برملا کیا ہے کہ ناقدین اور مورخین نے خواتین قلمکاروں کو وہ پذیرائی نہیں دی جس کی وہ مستحق تھیں۔

حمایت علی شاعر یقیناً اپنے کام اور نام کے حوالے سے ادب کے میدان میں ایک اہم شخصیت کے طور پر نمایاں ہیں جس کا ذکر اطہر رضوی نے بارہا بے حد خلوص کے ساتھ کیا ہے۔ اطہر رضوی اور حمایت علی شاعر کا آبائی تعلق ہندوستان کی سرزمین اورنگ آباد سے رہا ہے۔ انھوں نے اورنگ آباد کے حوالے سے بہت سی معلومات اپنے قارئین کے لیے فراہم کی ہیں اور اپنے ہم وطن، دوست حمایت علی شاعر کے نظریات و خیالات کی بھرپور انداز میں ترجمانی کی ہے اور ان تلخ حالات و واقعات کا بھی ذکر کیا ہے جو حمایت علی شاعر سے محبت و احسانات کرنے کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئے۔ بقول مصنف کے کہ انھیں اپنے حسن سلوک، ایثار و محبت کا صلہ اس شکل میں نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے بلکہ انھیں مہربانیوں، عنایتوں کے بدلے دکھ اور ذہنی اذیت اٹھانا پڑی اور اس دکھ کے احساس نے ہی ان کے ہاتھ میں قلم پکڑا دیا۔ قلم نے صفحہ قرطاس پر وہی کچھ لکھا جو ان پر گزری اور جو ان کی حساس طبیعت نے محسوس کیا۔

مصنف نے اپنی کتاب ''چہرے باتیں یادیں لوگ'' میں ادب کی گیارہ اہم شخصیات پر بھرپور انداز میں اپنے جذبات و احساسات اور تعلقات کے حوالے سے خامہ فرسائی کی ہے۔ ان قابل قدر ہستیوں میں شان الحق حقی، جمیل الدین عالی، ستیہ پال آنند، اکرام بریلوی صاحب جیسی شخصیات شامل ہیں۔ اطہر رضوی نے اپنے ہر مضمون میں تفصیل کے ساتھ شخصیت کے ادبی و غیر ادبی کارناموں اور موصوف سے اپنے تعلق کی بنا پر بھرپور انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ جہاں دوسری اہم ہستیوں کے ادبی کارناموں کو اجاگر کیا ہے وہاں جمیل الدین عالی کی شاعرانہ عظمت اور نثر نگاری کے قصیدے بھی بے حد خلوص کے ساتھ پڑھے ہیں اور ان تلخ حقائق کا بھی ذکر کیا ہے جو عالی جی سے تعلقات کے نتیجے میں پیدا ہوئے۔

دوسرے مضامین کی طرح کچھ حکایتیں اور شکایتیں عالی صاحب کے مضمون میں بھی نمایاں ہیں۔اسی طرح گیان چند جین کے خطوط بھی قابل مطالعہ ہیں۔

اطہر رضوی کی یہ کتاب شخصیات کے حوالے سے اہم نہیں ہے۔ بلکہ اس وجہ سے بھی اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ مصنف نے عالمی مسائل کے تناظر میں اپنے تجربات و مشاہدات کو بے حد دردمندی کے ساتھ رقم کیا ہے۔ بازنیا کے سانحے، سربیا کی قتل گاہوں اور مسلم خواتین کے ساتھ وحشیانہ سلوک کی تصویر کشی کی ہے۔سربینیا کی اس قتل گاہ کو مصنف نے تڑپتے دل، زخمی روح اور اشک بار آنکھوں کے ساتھ دیکھا جہاں آٹھ ہزار مسلمانوں کو ہاتھ پیر باندھ کر صف در صف کھڑا کر کے سرب درندوں نے چوبیس گھنٹوں میں قتل کیا تھا۔گویا یہ کتاب بین الاقوامی واقعات اور علم وادب کے حوالے سے ایک بے حد اہم اور معلومات افزا کتاب ہے۔

میں انھیں ان کی اس کاوش پر مبارک باد پیش کرتی ہوں اور امید کرتی ہوں کہ آئندہ سال اطہر رضوی جب وطن عزیز آئیں تو یہ خوش خبری بھی اپنے ساتھ لائیں کہ اسی قبیل کی اپنے ہم عصر شعراء وادباء کے حوالے سے ان کی نئی کتاب اشاعت کے مراحل طے کر چکی ہے۔

اطہر رضوی کی
’’چہرے باتیں یادیں لوگ‘‘

رسول احمد کلیمی

اطہر رضوی صاحب نے اپنے ناقدین اور مبصرین کو اپنی ’کتاب چہرے باتیں یادیں لوگ‘ کی نثری ادب کی کسی مانوس صنف، ہیئت، یا اسلوب میں درجہ بندی یا اصطلاحی تشریح کرنے سے عملاً محفوظ رکھنے کے لیے خود ہی یہ تحریر کردیا ہے کہ یہ کتاب میری شخصی یادوں ذاتی تجربوں اور میرے حافظے کی سوغاتوں کا مجموعہ ہے، اس میں پیش کی ہوئی میری نگارشات خاکے ہیں یا تذکرے، مضامین ہیں یا کوائف میرے نزدیک یہ تقویم غیر ضروری ہے۔ ہمدم دیرینہ سحر انصاری نے بصد خلوص ان کی توضیح سے اتفاق کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ’چہرے باتیں یادیں لوگ‘ شاعر، نقاد اور محقق اطہر رضوی کی شخصی یادوں کا مرقع ہے۔ اس کے بارے میں انہوں نے خود قطعیت سے طے نہیں کیا کہ یہ خاکے ہیں، مضامین ہیں یا کوائف۔ بہر حال انکی ان نثری تحریروں کو ان تینوں اصناف نثر کا مجموعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان دونوں انتہائی مقتدر آراء کی روشنی میں اطہر رضوی صاحب کو مذکورہ اصناف نثر کی صف میں ایک نئی صنف کا موجد قرار دیا جاسکتا ہے۔ ویسے بھی اپنی شخصیت، ادبی فکر اور تخلیقی رویے میں وہ روش عام سے کچھ اختلافی رجحان کے حامل دکھائی دیتے ہیں۔ جوائس کا قول ہے کہ: ’’میں جیسا کچھ بھی ہوں اسی کا اظہار کروں گا:‘‘ اطہر رضوی کے بھی مضامین بڑی حد تک اسی قول کا فنی

اور تخلیقی اعتراف کہے جاسکتے ہیں۔ اپنی کتاب میں انہوں نے ۱۲ شخصیات پر بڑی مہارت اور چستی اور بے ساختگی سے نثر پارے تخلیق کیے ہیں۔ ان کا لب ولہجہ کہیں عقیدت مندانہ، کہیں ناقدانہ، کہیں عاشقانہ، کہیں مشفقانہ اور چند مقامات پر معاندانہ بھی ہے۔ مگر ان کا اسلوب بیان بلاشبہ تکلف اور تصنع اور تخیلاتی تضاد اور تصادم سے پاک، اور اکثر مقامات پر بے لاگ، برمحل اور برجستہ ہے۔ ان کو تحقیق، تخلیق اور تنقید کا وہ ہنر آتا ہے جو ان کا اپنا ہے اور جس سے اختلاف تو کیا جاسکتا ہے مگر انکار نہیں کیا جاسکتا۔

ان کی کتاب کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے دراصل ۱۳ شخصیات کا بالصراحت و بالالتزام احاطہ کیا ہے۔ ۱۲ کے اسمائے گرامی فہرست مضامین میں ہیں لیکن تیرہواں نام قصداً یا سہواً انہوں نے شامل نہیں کیا۔ اور یہ ان کی اپنی ذات یا شخصیت ہے۔ پوری کتاب میں جابجا اور وہ بھرپور زندگی، توازن اور آہنگ کے ساتھ رواں دواں اور موجود نظر آتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کتاب میں مرتسم حقیقتوں کے درمیان وہ خود سب سے بڑی حقیقت ہیں۔ وہ لوگ جو میری طرح ان کی شخصیت کا ادراک اور کارہائے نمایاں سے کماحقہ واقفیت نہیں رکھتے انہیں اس کتاب کی ورق گردانی سے ان کی شخصیت، فن علم وآگہی، سماجی افکار اور تنقیدی رویوں کے مختلف مدارج سے بڑی حد تک متعارف ہونے کا موقع مل سکتا ہے۔ ہر مضمون میں ہمیں ایک اپنی ہی میزان پر خود کو تولتا ہوا محقق، ادیب، شاعر، نقاد، اور دانشمند وغیرہ ہی نظر نہیں آتا بلکہ ایک زودرنج، نازک مزاج مگر انسان دوست تخلیق کار بھی ملتا ہے جس میں جذباتی تجربات کی شدید ترین ترجمانی اور اپنے ذاتی ردعمل کی چابک دست قلمبندی کی حیرت انگیز صلاحیت موجود ہے۔ ان کی ظاہری اور باطنی خوبیوں کا اندازہ ان کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے کہ ''میری عمر مغرب کے بازاروں میں کٹی ہے مگر روح بہت سادہ اور بہت مشرقی اور بہت اسلامی ہے۔''

اپنی کتاب میں اطہر رضوی نے تین حضرات کے لیے 'صاحب' کا لاحقہ استعمال کیا

ہے۔ عالی صاحب، حقی صاحب، اکرام صاحب۔ ان تینوں مضامین کو پڑھ کر یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ ان شخصیتوں سے انہیں نہ صرف ایک والہانہ لگاؤ ہے بلکہ ان کی شخصیت، علمیت، انفرادیت، اور ہمہ گیر تخلیقی صلاحیت کے وارفتگی کی حد تک مداح ہیں۔ اور یہ صاحب کا لاحقہ دراصل اسی احترام اور وابستگی کا غماز ہے۔ عالی صاحب کو وہ ہشت پہلو شخصیت کہتے ہیں اور اس بات کا بڑی خوشدلی سے اعتراف کرتے ہیں کہ عالی صاحب کی شخصیت کے انگ انگ سے شہزادگی جھانکتی نظر آتی ہے۔ یہاں جھانکتی کا لفظ مجھے بہت معنی خیز محسوس ہوا۔ اور غالباً اسی کی تشریح کے لیے انہیں راجا اندر اور کاسانووا کالموں کے مجموعوں کی انتہائی اثر انگیز انداز میں تعریف کی ہے۔ وہ مزید وضاحت یوں کرتے ہیں کہ ''جمیل الدین عالی اور احمد فراز پاکستان کی ادبی شخصیتوں میں دو ایسے نام ہیں جن کا ٹورانٹو کے شہر اردو میں ایک تقریباً مقدس نام ہے'' ظاہر ہے کہ یہ جملہ ہر دو شخصیات سے ان کی عقیدت اور بے پایاں محبت کا غماز ہے اور اطہر رضوی جیسے دانائے راز کے قلم سے بہت بھلا لگتا ہے ورنہ عام قاری لفظ مقدس سے گمراہ بھی ہوسکتا ہے۔ بوجوہ عالی صاحب ایک مدت تک ان کی پسندیدہ شخصیت رہنے کے بعد کچھ باتوں کی وجہ سے انہیں anti-hero محسوس ہونے لگے۔ ان باتوں میں بشمول دوسری باتوں کے ایک ان کی کتاب ''خدا کے منتخب بندے'' کے بارے میں عالی صاحب کا یہ کہنا کہ انہوں نے اس موضوع پر ایک کتاب پہلے بھی پڑھی ہے دوسرے پرویز مشرف صاحب کی ایک خدمت میں ان کی کتاب بدست خود پیش کرنے کا انتظام کرنے میں عالی صاحب کی ناکامی یا غالباً عدم دلچسپی اور تیسرے عالی صاحب کا یہ کہنا کہ ''ان کو کینیڈا میں پنشن کی بڑی رقم ملتی ہے۔ ان کو پیسوں کی ضرورت نہیں ہے حاضرین جلسہ ان کی کتابیں اٹھالیں'' شامل ہیں، مجھے اس سے اختلاف نہیں کہ ان باتوں سے اطہر رضوی صاحب کی دلآزاری ہوئی ہے اور مالی خسارہ بھی۔ مگر کیا ان باتوں سے کوئی hero ایک anti-hero ہو جاتا ہے۔ اس میں مجھے شک ہے۔ ''غزلیں، دوہے، گیت'' جن اطہر صاحب کے نام معنون کی گئی ہے انہیں میں ایک

احترام کے رشتے سے۔بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔

میرا عالی صاحب سے وہی رشتہ ہے جو ایک مودب چھوٹے بھائی اور ایک مہذب بڑے بھائی کے درمیان ہوتا ہے۔ میں بھی اس ادارے سے گذشتہ ۳۴ سال سے ایک معمولی کارکن کی حیثیت سے منسلک ہوں جس کے سربرآوردہ لوگوں میں وہ شامل رہے ہیں۔اطہر رضوی کے محسوسات اور جذبات سے پوری ہمدردی رکھتے ہوئے میں بالیقین یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر چہ عالی صاحب کی پرخلوص فراوانی شفقت سے اکثر فریق ثانی کو فائدہ پہنچنے کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا لیکن مجھے یہ تسلیم کرنے میں لاشعوری طور پر تامل ہوگا کہ وہ اپنے دوستوں، مداحوں، بہی خواہوں اور چھوٹوں کو ضرر یا زک پہنچانے کی شعوری کوشش کرتے ہیں۔ اسی مضمون میں اطہر رضوی نے ایک روایت کو استدلال بناتے ہوئے یہ کہا ہے کہ ''حقیقت یہ ہے کہ ممتاز حسن ایک متنازعہ اور متعصب شخصیت تھے۔'' ظاہر ہے کہ اطہر رضوی کے پائے کا محقق اور تخلیق کار کسی نامور اردو دوست صاحب قلم پر ایسا حکم صادر کرنے سے پہلے روایت کی صحت اور صداقت کے بارے میں خود کو مطمئن ضرور کر لیتا ہے۔اس لیے میں صرف یہ کہنے پر اکتفا کروں گا کہ نیشنل بینک کی لائبریری میں عرق ریزی اور جانفشانی سے جمع کیے گئے اردو نثر اور دواوین کے قدیم ترین نسخے اور یوپی اور حیدرآباد کے بہت سے سینئر افسران کی فائلوں میں ان کے قلم سے لکھے ہوئے توصیفی کلمات جو میں نے خود پڑھے ہیں۔میرے ذہن میں ان کی ایک مختلف تصویر منعکس کرتے ہیں۔

اطہر رضوی نے دوسرا عقید تمندانہ مضمون شان الحق حقی صاحب کے بارے میں لکھا ہے اور بلاکم و کاست حق ادا کر دیا ہے۔۱۹۹۲ سے ان کے انتقال تک میرا حقی صاحب سے ایک ارادتمندانہ قریبی تعلق رہا ہے۔ کچھ دفتری اور کچھ ادبی نوعیت کا۔ایک وقت تھا کہ وہ اسی تشہیری ادارے سے منسلک تھے جس کو کبھی ممتاز حسن صاحب نے بینک کی فہرست تشہیر کنندگان میں شامل کیا تھا۔ادارے کے تاجر مزاج مالک نے حقی صاحب سے میری مودبانہ

ارادتمندی کو بھانپ لیا اور ہر ملاقات میں انہیں ساتھ لاکر مجھے شرمندہ کرنے کا ایک تکلیف دہ سلسلہ شروع کر دیا۔ آخر کار میں نے یہ طے کیا یہ ملاقاتیں میرے دفتر کی بجائے حقی صاحب کے ہی دفتر میں شام کو ہوا کریں گی جن میں، میں گھر واپس جاتے ہوئے شرکت کروں گا۔ یہ طریقہ کار اس قت تک چلتا رہا جب تک حقی صاحب اس ادارے سے منسلک رہے۔ میں نے نہ تو کبھی یہ ضرورت محسوس کی اور نہ خود میں یہ جرأت اور اہلیت پائی کہ حقی صاحب کے تحریر کردہ کسی اشتہار میں کوئی حرف بھی داخل یا خارج کر سکوں۔ میری دانست میں اطہر رضوی نے حقی صاحب کے کینیڈا میں مقیم تمام نیازمندوں اور مداحوں پر اظہار عقیدت کا جو قرض واجب تھا وہ یہ معرکتہ الآرا مضمون لکھ کر بحسن وخوبی ادا کر دیا ہے۔ اور اس سلسلے میں ان کا یہ جملہ حرف آخر کہا جا سکتا ہے کہ ''حقی صاحب کے ہم پلہ اور ہم مرتبہ کوئی اور ہمہ گیر اور ہمہ داں شخصیت اردو تہذیب میں پیدا نہیں ہوئی۔'' دراصل ہم وہ بدقسمت لوگ ہیں جو اکثر اپنے مشاہیر کی ان کی زندگی میں قدر کرنے سے معذور رہتے ہیں۔ رہا اطہر رضوی کا یہ سوال کہ ''ہماری اردو شاعری میں ولی دکنی سے لے کر پروین شاکر اور عشرت آفرین تک سارے کے سارے نہیں تو عظیم المرتبت، عدیم المثال، ممتاز نام اور معتبر شعراء کی ایک بہت بڑی اکثریت کا تعلق اہل تشیع سے رہا ہے۔'' اس سوال کا محققانہ جواز تو برادرم تقی عابدی فراہم کریں گے، میری جانب سے مختصر ترین جواب یہ ہے کہ اسے فیضان باب العلم اور عطائے صاحب نہج البلاغہ سمجھنا چاہیے۔

اطہر رضوی نے تیسرا عقیدتمندانہ مضمون اکرام بریلوی صاحب کے لیے لکھا ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ دراصل اکرام صاحب ہی وہ شخصیت ہیں جنھوں نے اطہر رضوی کے اندر چھپے ہوئے تخلیق کار کو نہ صرف بیدار کیا بلکہ اس کی تہذیب وترویج میں بنیادی کردار ادا کیا۔ دراصل بڑے لوگوں کی ایک بڑی یہ بھی صفت ہوتی ہے کہ وہ اپنے اطراف علم وفن اور اس اعتبار سے اکرام بریلوی صاحب ایسے ہی چند صاحبان علم وآگہی اور ارباب

فکروفن میں شمار کیے جاسکتے ہیں جن کو قدرت نے اس صفت خاص سے معمور و مزین کیا ہے۔ اطہر رضوی نے ایک والہانہ نیازمندی سے نثری ادب میں شمار کی جانے والی ہر صنف میں اکرام بریلوی صاحب کی تخلیق مہارت، زبان و بیان کی لطافت، موضوع کے انتخاب میں ان کی بصیرت اور افسانہ اور ناول نگاری میں ان کی انفرادیت کا انتہائی اثر انگیز اور قابل تحسین جائزہ پیش کیا ہے۔ البتہ وہ اکرام صاحب کی دقیق نویسی کے بارے میں بہت ہی نرم لہجے میں اعتراف کمال کے ساتھ کچھ شکوہ سنجی بھی شامل کی ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اردو نثر کے روایتی محاسن میں سلاست اور روانی کا ایک خاص تصور موجود ہے۔ مجھے تو اکرام بریلوی صاحب کے نامانوس الفاظ بھی دل و دماغ پر ایک مانوس مفہوم نقش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یوں بھی اکرام صاحب، ابوالکلام آزاد اور نیاز فتحپوری کی طرز نگارش سے متاثر ہیں۔ ابو الکلام آزاد کے بارے میں سبھی جانتے ہیں کہ اردو رسم الخط میں عربی کے سب سے بڑے ادیب تھے۔ میری اکرام صاحب سے ٹورانٹو میں ہی ملاقات ہوئی باوجود اس کے وہ تمام لوگ جو ان کے دوستوں یا ارادتمندوں میں شامل ہیں ان سے میرے بھی دیرینہ مراسم رہے ہیں۔ گویا بقول سرور بارہ بنکوی:

یہ مرا نصیب ہے ہمنشیں سرِ راہ بھی نہ ملے کہیں

وہی میرا جادۂ جستجو، وہی تیری راہ گذر بھی تھی

میں اپنی ناواقفیت کے باوجود اطہر رضوی کے مضمون کی بنیاد پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ اکرام صاحب صرف آدمی کہاں ہیں وہ تو ایک اسلوب ہیں، جینے کا بھی اور لکھنے کا بھی۔ اطہر رضوی نے چار خواتین پر اپنے مضامین تحریر کیے ہیں۔ یہ ہیں سلطانہ مہر، نسیم سید، ثریا اور سونیا، سلطانہ مہر کے بارے میں سیر حاصل معلومات اور محیر العقول کارناموں سے آگاہی کے بعد مجھے شدید صدمہ ہوا کہ مجھے ان سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ ان کے جو کوائف کتاب میں درج ہیں ان سے یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ وہ ایک انتہائی لائق، ذہین اور

اردو ادب، شاعری اور صحافت کے حوالے سے فنی بلندیوں کو چھو لینے والی صف اول کی شہرت یافتہ خواتین میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ مزید برآں سلطانہ مہر کتاب میں درج روایت کے مطابق نہ صرف عورتوں کی شبلی نعمانی ہیں بلکہ وہ بیسویں صدی میں تذکرہ نگاری کا با قاعدہ اور باضابطہ آغاز کرنے والی پہلی خاتون ہیں۔ ان کی عظمت کے اعتراف کے لیے انجام کے دفتر میں ملازمت کے دوسرے ہی دن ابراہیم جلیس جیسے نامور ادیب اور صحافی سے معاصرانہ نوک جھونک میں ملوث ہونا ہی ایک مؤثر ،معتبر اور مرعوب کن دلیل ہے۔ سلطانہ مہر کے بارے میں اطہر رضوی کی تحریر کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اپنی رائے کے علاوہ تقریباً تمام مشاہیر کی آرا کو ایک ایسے خوبصورت گلدستے کی شکل میں پیش کردیا ہے۔ اور یہی اطہر رضوی کے قلم کا کمال ہے۔ نسیم سید دوسری خاتون ہیں جو اطہر رضوی کی تحریر کا موضوع ہیں۔ یہ چند صفحات ماہرانہ تنقید، ہمدردانہ تبصرہ اور مشفقانہ طرز نگارش کا شاہکار ہیں۔ یہ ایک حساس، جرأت مند اور دل سوختہ شاعرہ کا مسحور کن منظر نامہ ہیں جس کی شاعری کا خمیر روایت اور جدت کے حسین امتزاج اور مشرق و مغرب کی حیاتی کشمکش سے اٹھا ہے۔ اکثر مقامات پر اس کے تخلیقی مطالعے کا مرکز خود اس کی اپنی ذات، خود اپنی اذیت اور اس سے آزادی حاصل کرنے کی ایک مسلسل جدوجہد ہے۔ اس کا کرب میر اور فانی کی طرح الم پرستی نہیں بلکہ بہادری ہے۔ وہ عورت کی تذلیل کا ذکر تاسف سے نہیں بلکہ وقار سے کرتی ہے۔ مثل فوکو کا قول ہے کہ ”بعض دفعہ محبت کے وہی نتائج ہوتے ہیں جو نفرت کے“ اطہر رضوی کی تصویر کشی کے مطابق نسیم سید کی شاعری اکثر مقامات پر اس قول کی تفسیر نظر آتی ہے۔ اطہر رضوی نے دو مختلف صفحات پر نسیم سید کی شادی کے دو مختلف سالوں رقم کیے ہیں۔ غالباً یہ کمپوزنگ کی غلطی ہوگی۔

ثریا اور سونیا کے عنوان کے تحت اطہر رضوی نے نہ صرف فنی ذکاوت کا ثبوت دیا ہے بلکہ انسانی زندگی کی قدرتی محرومیوں اور پے در پے المیاتی تجربوں کا جس دل آزردگی

اور دلجوئی سے تذکرہ کیا ہے وہ ان کے ہمدردانہ انسان دوست ہونے کا نا قابل تردید ثبوت ہے۔ یہ سنگینی روز وشب کی ایک ایسی پر اثر داستان حیات ہے جو ذہن پر انمٹ نقوش مرتب کرتی ہے۔ خلقت کے اس بے پایاں سمندر میں ثریا اور سونیا دو ایسے کردار نظر آتے ہیں جن کو قدرت نے غالباً آزمائش کے لیے چن بھی لیا ہے اور ساتھ ہی وہ حوصلہ بھی ودیعت کیا ہے جو ہر المیے کے بعد مزید مضبوط اور توانا ہو جاتا ہے۔ اسے پڑھ کر مجھے فراق گورکھپوری کا یہ شعر یاد آیا:

میاں رو پیٹ کر بیٹھے ہیں سو باران فریبوں کو
یہ ہم سے پوچھنے آئے ہو، غم کیا تھا خوشی کیا تھی

ایک بے مثال تاثراتی مضمون ڈاکٹر منموہن شرما کی شخصیت اور ان کے خیالات و کمالات پر کتاب میں شامل ہے۔ اگر چہ اس میں کچھ نزاعی سیاسی، معاشی اور مذہبی مسائل اور رسوم پر بھی سوالات اٹھائے گئے ہیں مگر اس سے قطع نظر اس مضمون کو پڑھ کر یقین واثق ہو جاتا ہے کہ کچھ لوگ واقعی اسم بامسمّیٰ ہوتے ہیں۔ اردو سے لگاؤ، ویدانتا کا علم اور تصوف ہے، رسم و راہ اور پھر امراض قلب میں مہارت یہ سب آثار اس جنون آگہی کے ہیں جس کے تانے بانے علم ظاہری کی حدوں سے نکل کر روحانیت سے جا ملتے ہیں۔ یقیناً ڈاکٹر منموہن شرما من موہ لینے والی شخصیت کے روپ میں اطہر رضوی کی تحریر میں جلوہ گر نظر آتے ہیں۔

اطہر رضوی نے تین دوسرے ابواب میں تین مزید قد آور شخصیتوں کو موضوع گفتگو بنایا ہے۔ پہلا مضمون ڈاکٹر ستیہ پال آنند پر ہے۔ اس مضمون میں اطہر رضوی نے ادبی تنقید، اصناف شعری کے تقابلی مطالعے، خاکہ اور تذکرہ نویسی اور ذاتی تاثرات کی چست قلمبندی کا لاجواب مظاہرہ کیا ہے۔ حقیقت حال یہ ہے فی زمانہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر ستیہ پال آنند دو ایسی شخصیات ہیں جن کی اردو زبان و ادب پر امتیازی دسترس اور مضبوط ترین گرفت کو حلقہ تحریر میں لانا بجائے خود ایک ادبی کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں ہی جدید ادبی رجحانات

، تنقید، نظریہ سازی اور تخلیقی انفرادیت کے باوصف اردو ادب کے عہد جدید کو اپنے نام لکھوا چکے ہیں۔ فراق نے یہ شعر غالباً انہیں کے لیے کہا ہے:

میں وہ ہنگامہ ہوں خود مجھ کو نہیں جس کی خبر
پوچھتا پھرتا ہوں یہ، شور کہاں ہوتا ہے

دوسرا مضمون حمایت علی شاعر پر ہے۔ اطہر رضوی اور حمایت علی شاعر اورنگ آباد سے ایام طفلی کے واقف کار ہیں۔ میرا نہ صرف ان دونوں سے بلکہ ان شخصیات میں سے بیشتر سے جن کے اسمائے گرامی اس مضمون میں درج ہیں، ایک مخلصانہ احترام اور برادرانہ نیاز مندی کا رشتہ ہے۔ مجھے اس تحریر کو پڑھ کر شدید افسوس ہوا۔ ادب کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش یہ مضمون اس مجموعہ مضامین میں شامل نہ ہوتا اور شاید میرا یہ منصب نہیں کہ اس پر کوئی تبصرہ کروں اور صرف شاعر لکھنوی کا یہ شعر پیش کروں گا:

تمام عمر کی قربت کے باوجود اکثر
نگاہ و دل میں بڑے فاصلے نکلتے ہیں

تیسرا مضمون گیان چند جین پر ہے۔ یہ ایک واقعاتی اور تاثراتی تحریر ہے۔ اس کا بیشتر حصہ گیان چند کی متنازعہ تصنیف "ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو ادب" اور اطہر رضوی کے ان سے ذاتی تعلقات و تجربات کی روشنی میں ترتیب دیا گیا ہے۔ میری پہلی اور آخری ملاقات گیان چند جین سے غالباً ۲۰۰۲ء میں ہوئی تھی جب وہ برادرم امراء طارق اور انجمن ترقی اردو پاکستان کے دوسرے دوستوں کے ہمراہ میرے دفتر آئے تھے۔ وہیں لنچ کیا اور ان سے کافی دیر تک گفتگو رہی۔ یہ حقیقت ہے کہ میں نے ان کی شخصیت، علمیت اور اردو سے محبت کا اچھا تاثر لیا تھا۔ اطہر رضوی کے مضمون کا خورد بینی سے مطالعہ کرنے کے بعد مجھے ماننا پڑا کہ ایک دو ملاقاتوں کے بعد بڑے لوگوں کے بارے میں بھی کوئی حتمی رائے نہیں قائم کرنی چاہیے۔

اگرچہ پروین شاکر نے یہ خصوصیت لڑکیوں سے منسوب کی ہے۔

آخری مضمون الیگزنڈر پشکن پر ہے۔ روس کے پشکن شاعر، ناول نگار اور ڈرامہ نویس ۱۸۳۷ میں ۳۷ سال کی عمر میں انتقال کر گئے تھے۔ ان کی شخصیت رومانوی اور طبیعت تہ بہ تہ عاشقانہ تھی۔ یہ مضمون بھی میرے اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ اس کتاب میں جابجا ایک ایسے شخص کے نقوش ہیں جو جوانی میں کالج کی ایک دھان پان سی لڑکی کے عاشقوں کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس پر نظم لکھتا ہے۔ اور اس کا نام بھی اس عمر میں اپنی کتاب میں لکھ دیتا ہے۔ جس کو عالی صاحب کی شخصیت میں شہزادگی جھانکتی نظر آتی ہے اور اب جس کا خیال ہے کہ ''کوئی دل نشین، سکون بخش، ہوش ربا تحریر پڑھنے میں جو لطف آتا ہے وہ جسم و جان کی موجودہ کیفیت میں ہم بستری کی لطافت سے کم نہیں ہوتا۔''

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے، صحبت نہیں رہی

”سخنے بیادِ غالب“ از اطہر رضوی

ڈاکٹر فرمان فتح پوری، کراچی، پاکستان

غالبؔ اردو کا ایک عجیب و غریب شاعر ہے، عجیب و غریب ان معنوں میں کہ نہ تو اس پر سوچنے والے تھکتے ہیں نہ لکھنے والے، نہ اس کے پڑھنے والوں میں کوئی کمی، واقع ہوتی ہے اور نہ اس کے کلام پر سر دھننے والوں میں بلکہ سلسلہ اس کے برعکس ہے، اس کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، اس کو ذہن و دل سے قریب تر رکھنے کے لیے نئی نئی راہیں نکالی جا رہی ہیں جن میں تازہ ترین وہ راہ ہے جو کنیڈا میں مقیم جناب اطہر رضوی کی ایجاد ہے۔

اطہر رضوی صاحب شاعر ہیں، نثر نگار ہیں اور اردو انگریزی دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں۔ جتنا اچھا لکھتے ہیں اتنا ہی اچھا بولتے ہیں۔ خوش فکر ہیں، خوش نظر ہیں خوش وقت اور خوش باش ہیں، خوش لباس، وخوش مزاج ہیں اور زندوں کی طرح زیست کرنے کو عبادت جانتے ہیں۔ چنانچہ غالب کے اس نوع کے اشعار کے اتباع میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

بخشے ہے جلوہٴ گل، ذوقِ تماشا غالبؔ　　چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر　　نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب　　آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

یہ غالب کے اقوال ہیں اور غالب کا خود اپنے اقوال پر، عامل نظر آنا ضروری نہیں لیکن

غالب کے سچے عاشق جناب اطہر رضوی ان اقوال کے پابند و عامل نظر آتے ہیں۔ وہ زندگی کے سارے مناظر سے آنکھ لڑانے اور ان سے لطف اندوز ہونے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور صرف اپنے ہم عمر و ہم مذاق خواتین و حضرات کی مجلس میں نہیں بلکہ اپنے سے چھوٹوں اور نوجوانوں کی محفلوں میں بھی لطف اندوزی اور گل افشانی کی سبیل نکالتے ہیں۔ زندگی کو عزم و حوصلے کے ساتھ ہنستے مسکراتے اور روشناس خلق ہوکر بسر کرنے کو حاصل حیات جانتے ہیں۔ خلوت نشینی و خود پوشی پر بزم آرائی و نبرد آزمائی کو ترجیح دیتے ہیں۔ ناکامیوں سے افسردہ خاطر ہونے کے بجائے انھیں حصول کامرانی کا وسیلہ بنالیتے ہیں اور ہر لمحہ نئے طور و نئی برق تجلی کے شوق سے خود کو سرشار رکھتے ہیں۔ جینے کے اس قرینے کا فیضان ہے کہ عمر رسیدگی کے باوصف ان کے جسم و جان پر کہولت و اضمحلال کے آثار نظر نہیں آتے۔ ان کی یہ حوصلہ مندی، تازہ دمی مجھ جیسوں کے لیے قابل رشک ہے۔

شعر و ادب کے حوالے سے میں نے عرض کیا کہ وہ ایک باشعور، با مطالعہ آدمی ہیں۔ فطرت نے انھیں شعر گفتن و شعر فہمی کی صلاحیتوں سے بھی پوری طرح نوازا ہے، لیکن ان کی ادبی صلاحیت یا شوق سخن وری کی جولہر ان کے جسم و جان کو محیط کئے ہوئے ہے، وہ اپنی زبان، اپنی ثقافت، اپنی تہذیب اور اپنی ملی و ملکی اقدار ان کا بے پناہ لگاؤ ہے۔ یہ اس لگاؤ ہی کا ایک رخ ہے کہ وہ ایک مدت سے کنیڈا میں اردو شاعری کی شمع روشن کئے ہوئے ہیں پھر چونکہ اس شمع کو انھوں نے اردو کلاسیکی کے عظیم مفکر شاعر، غالبؔ سے وابستہ کر رکھا ہے اس لیے اس کی لو روز بروز بڑھتی جارہی ہے اور کنیڈا کا ایوان اردو، روشن سے روشن تر ہوتا جارہا ہے۔

اس ایوان کو مستقلاً روشن رکھنے کے لیے ان کی اختراع پسند طبیعت نے شعر و ادب کے بہت سے پہلو نکال رکھے ہیں۔ ان میں دو پہلو خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ایک پہلو وہ جو سالانہ مذاکرے یا سیمینار کی صورت میں کسی خاص شخصیت یا موضوع کے حوالے سے برپا کیا جاتا ہے جس میں پاک و ہند کے ممتاز شاعر و ادیب شرکت کر کے اس کی گونج کو صرف

مقامی نہیں رہنے دیتے بلکہ دور دور تک پہنچا دیتے ہیں۔ دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ وہ غالب و کلام غالبؔ کی تفہیم و تبلیغ کو اپنی زندگی کا مشن بنائے ہوئے ہیں۔ اس لیے وہ وقفے وقفے سے طرحی مشاعرے منعقد کرتے ہیں اور غالب کے مصرعوں کو طرحی مصرع قرار دے کر شعراء کو ان پر غزل کہنے کی ترغیب دیتے ہیں اور پھر ان طرح غزلوں کو یکجا کتابی صورت میں شائع کر کے اردو اور غالب دونوں کے پرچم دیار غیر میں بلند رکھتے ہیں۔

بعض حضرات آج کل طرحی مشاعروں کو بے وقت کی راگنی خیال کرتے ہیں ان کا یہ خیال درست نہیں ہے۔ اردو شاعری اور غالبؔ کے حوالے سے اطہر رضوی کے بنا کردہ، طرحی مشاعرے کی روایت کے کئی بہت اہم پہلو ہیں، طرحی غزلوں کی یہ روایت صرف، نو آموز شعراء کو نہیں بلکہ پختہ مزاج شعراء کو بھی بہت کچھ دیتی ہے۔ غزل کہنے کے لیے جو مصرع دیا جاتا ہے شاعر کو اس کو معنوی تہ داریوں پر بار بار غور کرنا پڑتا ہے، اس کی لطافتوں اور نزاکتوں کو اپنے قلب و ذہن میں اتارنا پڑتا ہے۔ ساتھ ہی اصول قافیہ وزن کے ارکان اور بحر و زمین، سب کو توجہ کا مرکز بنانا پڑتا ہے اور اس طرح رفتہ رفتہ ہر شاعر اپنے آپ کو شعر گوئی، فن شعر گوئی اور زبان و بیان کے رموز و نکات سے مزین کر لیتا ہے۔ طرحی مشاعروں کی یہی وہ افادیت ہے جس سے استفادے کی راہیں جناب اطہر رضوی نے ایک مدت سے کھول رکھی ہیں۔

یہ تو ان مشاعروں کی عمومی افادیت کی بات تھی۔ ان کا خصوصی رُخ یہ ہے کہ یہ طرحی مشاعرے غالب اور کلام غالب کو متعارف کرانے، انھیں دوسروں تک پہنچانے، ان کے واقعی و عمودی محاسن شعری کو اُجاگر کرنے اور قاری و شاعر کو غالب سے قریب تر کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ طرح پر غزل کہنے والا جب غالب کی غزل کو سامنے رکھ کر غزل کہے گا تو وہ یقیناً غالب کے صرف مصرعے پر نہیں بلکہ پوری متعلقہ غزل پر ایک نظر ڈالے گا، غالب کے انداز فکر اور اسلوب بیان پر غور کرے گا اور اپنی قوت متخیلہ کو غالب کا ہم سفر بنانے کی حتی الوسعی کوشش کرے گا اور ایسا کرنے میں صرف یہی نہیں کہ اس کے ذہن میں جلا پیدا ہوگی بلکہ

وہ شعر گوئی کی ارتقائی منزلوں کو بڑی آسانی سے طے کر سکے گا۔ اب اس خاص زاویے سے دیکھیے تو غالب کے مصرعۂ طرح کے حوالے سے اطہر رضوی کے بنا کردہ مشاعرے نہ صرف غالب وکلام غالب کی اشاعت و تفہیم میں معاون نظر آئیں گے۔ بلکہ ہمارے شعراء ان کے وسیلے سے اتنا کچھ حاصل کرلیں گے کہ درجنوں کتابوں سے بھی وہ میسر نہیں آئے گا۔

اطہر رضوی صاحب نے غالب کے سلسلے میں طرح مشاعروں کی معرفت جس انداز سے کام کرنے کا آغاز کیا ہے، اسے بعض حضرات نے سنہ ۱۹۶۹ء میں غالب کے جشن صد سالہ کے موقع پر اپنانے کی کوشش کی تھی۔ غالب کی زمینوں میں غزلیں بھی کہی گئی تھیں۔ تضمینوں کی مثالیں بھی دیکھنے میں آئی تھیں اور غالب کے مصرعے کو طرح قرار دے کر شعری نشستیں بھی منعقد کی گئی تھیں، لیکن یہ سارا کام انفرادی نوعیت کا تھا ظاہر ہے کہ اس کا حلقہ اثر محدود تھا۔ اس کے برعکس اطہر رضوی صاحب نے ''بیادِ غالب'' کے زیر عنوان جس نوع کی طرحی غزلیں یکجا کی ہیں اور طرحی مشاعرے برپا کیے ہیں وہ اجتماعی نوعیت کا کام ہے اور صلائے عام کی حیثیت رکھتا ہے۔ نتیجتاً اس کا حلقہ اثر بھی بہت بڑا ہے۔ چنانچہ غالب کے نام اور کام کو دور دور تک پہنچانے، عام وخاص کو اس کی جانب توجہ دلانے اور غالب کی مقبولیت کے گراف کو بلند تر کرنے میں اس اجتماعی کام کی نوعیت وافادیت شخصی یا دوسری انفرادی کوششوں کے مقابلے میں زیادہ کارگشادہ کارگر ہے۔

''بیادِ غالب'' مرتبہ اطہر رضوی میں بیس سے زیادہ شاعروں کی غزلیں شامل ہیں اور ایک آدھ کو چھوڑ کر سبھی کینیڈا میں آباد ہیں۔ اس میں جو طرحی غزلیں شامل ہیں ان میں چار زمینیں ردیف ''الف'' کی ہیں، چار زمینیں ''نون'' کی ہیں اور سات ردیفیں حرف ''ی'' سے تعلق رکھتی ہیں۔ ''الف'' ردیف کی زمینوں کے مصرعہ طرح اس طور پر ہیں:

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا؟

●●●

اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

●●●

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

●●●

ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

●●●

مصرعۂ اول پر صرف نو شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے، ان میں جوش مندوزئی کی غزل سب سے طویل یعنی سولہ سترہ اشعار کی ہے۔ بقیہ غزلیں پانچ اور نو اشعار کے درمیان ہیں۔ اپنے اپنے زورِ بیان اور پرواز تخیل کو سبھی نے آزمایا ہے لیکن عروج اختر زیدی کی غزل حاصل مشاعرہ کہی جاسکتی ہے۔ نو شعروں کی یہ غزل پوری کی پوری مرصع ارو دامن دل می کشد کے مصداق ہے۔ اطہر رضوی اور اشفاق حسین کے یہ شعر بھی قابل توجہ ہیں:

ہم جو ہیں فردا سے قوت آزما
زحمتِ امروز سے گھبرائیں کیا

اطہر رضوی

ہر گلی کوچے میں سورج قید ہے
آنکھ والے اس نگر میں جائیں کیا

اشفاق حسین

''الف'' کی دوسری زمین کی غزلیں پہلی زمین کے مقابلے میں کمزور ہیں البتہ محترمہ عقیلہ شاہین کا یہ شعر بہت اچھا اور سچا ہے کہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

مسئلے ان کے کچھ نہیں ہوتے
جن کو غیرت کا مسئلہ نہ ہوا

ردیف ''الف'' کے تیسرے سلسلے کی غزلیں پہلی دو کی بہ نسبت زیادہ خوبصورت ہیں۔بطور نمونہ پہلے اطہر رضوی کے رومانی انداز کے دو شعر دیکھئے:

کنول اب آرزو کے کیا کھلیں گے
سحر ہونے میں باقی ہی رہا کیا

●●●

مسلسل میری جانب دیکھتی ہیں
انھیں اس عمر میں یہ ہوگیا کیا

دوسروں کے یہ اشعار بھی توجہ چاہتے ہیں جو صورت و معنی دونوں اعتبار سے قابلِ داد ہیں:

مرے آذر سمجھتا کیوں نہیں ہے
کہیں پتھر کا ہوتا ہے خدا کیا

سلیم آذر

مزاج شہر سے سب کو گلہ ہے
کوئی ہو آشنا ناآشنا کیا

اختر آصف

جو اپنا فرض تھا ہم نے نبھایا
بہ کارِ خیر امید صلہ کیا
پرندے ہیں انہیں اُڑنا تھا آخر
پرندوں کو درختوں کا گلہ کیا

تسلیم الٰہی زلفی

دریچے گھر کے کر کے بند عابد
ہوا کا روک لوگے راستہ کیا
عابد جعفری

میں خود اپنا مخالف ہوگیا ہوں
بگاڑے گا کوئی منہ کا مزہ کیا
عابد جعفری

اگر مقصد نہ ہو جینے کا مسلم
تو ایسی زندگی کا فائدہ کیا
مسلم چشتی

ردیف ''الف'' کی چوتھی زمین جس کا مصرعہ طرح تھا ''ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا'' اس پر صرف نو شاعروں نے توجہ دی ہے اور ہر ایک نے ایک دو شعر اچھے نکال لیے ہیں لیکن ڈاکٹر خالد سہیل کی پوری غزل اوروں سے بہتر ہے صرف ابتدائی دو شعر سن لیجیے:

روزِ روشن میں بھی لوگوں کا ہراساں ہونا
شام ڈھل جائے تو ماؤں کا پریشاں ہونا
خوف چپکے سے گلی کوچوں میں گھس آیا ہے
ہم نے دیکھا ہے بھرے شہروں کا ویراں ہونا

ردیف ''نون'' کی چار زمینوں کے طرحی مصرعے یہ تھے:

تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
ہم کو تسلیم نکونامی فرہاد نہیں

پہلا مصرعہ غالب کی نہایت شگفتہ غزل کا ہے اور اس میں انھوں نے ''کم'' اور ''ہم'' کے قافیے میں دو ایسے غضب کے شعر نکال لیے ہیں کہ ان قافیوں کو ہاتھ لگانا آسان نہیں تھا پھر بھی داغ دہلوی نے دونوں قافیے اپنائے ہیں اور خالص غزل کے بہت خوبصورت اشعار نکالے ہیں۔

پہلے غالب کے شعر دیکھیے:

ترے سروِ قامت سے اک قد آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
تماشا کہ اے محو آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

اب داغ کے اشعار کا لطف اٹھایئے اور قافیوں کے خوبصورت مصرف کی داد دیجیے:

غنیمت ہے چشم تغافل بھی اُن کی
بہت دیکھتے ہیں جو کم دیکھتے ہیں
اُدھر شرم حائل، اِدھر خوف مانع
نہ وہ دیکھتے ہیں، نہ ہم دیکھتے ہیں

''بیادِ غالب'' مرتبہ اطہر رضوی میں بھی ان قافیوں کو برتا گیا ہے لیکن کسی کو کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی، پھر بھی ''کم'' کے قافیے کے بعض اشعار دیکھتے چلیے کہ بہر حال داد کے قابل ہیں۔

ستاروں کی جا کر خبر لانے والے
زمیں کے مسائل کو کم دیکھتے ہیں

اسماء وارثی

عجب ان دنوں رنگ ہم دیکھتے ہیں
زمیں اپنے محور پہ کم دیکھتے ہیں

اشفاق حسین

وہ عشق کے پیچ وخم دیکھتے ہیں
ہر اندیشہ بیش وکم دیکھتے ہیں

عروج اختر زیدی

حسیں کون ہے وہ صنم دیکھتے ہیں
تراشا ہے کس نے یہ کم دیکھتے ہیں

سلیم آذر

غالب کے دوسرے قافیوں کا کوئی قابل ذکر مصرف ''بیادِ غالب'' میں نظر نہیں آیا البتہ یہ کیا کم ہے کہ غالب کی زمین کو ہاتھ لگایا گیا اور غزل کہی گئی۔

''نون'' کی زمین کا دوسرا مصرعہ طرح یہ تھا'' ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں'' اس غزل میں غالب نے ''جواب'' کا قافیہ یوں نظم کیا ہے:

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

غالب کی اس زمین میں متعدد اساتذہ کی غزلیں ہیں اور انھوں نے ''جواب'' کے قافیے پر طبع آزمائی کی ہے بطور مثال دو تین شعر دیکھئے:

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

ذوقؔ

کہتے ہو ہم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

مومنؔ

کیا کیا فریب دل کو دیئے اضطراب میں

اپنی طرف سے آپ لکھے خط جواب میں

داغ

بے قصد لکھ دیا ہے گلہ اضطراب میں

دیکھوں کہ کیا وہ لکھتے ہیں خط کے جواب میں

امیر مینائی

حیرت کی بات یہ ہے کہ "بیادِ غالب" کے کسی شاعر نے اس قافیے کو ہاتھ نہیں لگایا اگرچہ سامنے کا قافیہ تھا، دوسرے قافیوں میں البتہ بعض اچھے اشعار نکال لیے ہیں صرف اشفاق حسین اور عروج اختر زیدی کے دو دو شعر دیکھیے:

میں حرف حرف ہوں تری دل کی کتاب میں

مجھ کو بھی پڑھ کہ میں بھی ہوں شامل نصاب میں

پھر دیکھ کیسے بجتی ہے تاروں کی انجمن

تو خواب ہی کی طرح سہی آ تو خواب میں

اشفاق حسین

روحیں لہو ہو تو بدن ہیں عتاب میں

ہے مبتلا یہ ملک مرا کس عذاب میں

عہد خزاں نے دیکھے نہ ہوں گے جو خواب میں

ہم نے وہ دکھ اٹھائے ہیں فصل گلاب میں

عروج اختر زیدی

ردیف "نون" کا تیسرا مصرعہ طرح تھا "میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں"

غالب کا پورا شعر اس طور پر ہے کہ ضرب المثل بن چکا ہے:

مہرباں ہو کے بلالو، مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

تخیل والفاظ دونوں لحاظ سے یہ شعر اتنا بلند ہے کہ اس کے مصرعہ طرح کو چھونا اور اس پر کامیاب گرہ لگانا محال تھا لیکن نزہت صدیقی نے محال کو آسان کر دکھایا۔ ان کی تضمین کا شعر دیکھئے:

پھر پلٹ کر نہیں آیا وہ جو کہتا تھا کبھی
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

نزہت صدیقی نے پانچ شعر کی مختصر سی غزل کہی ہے۔ پوری کی پوری غزل بلند پایہ ہے اور ان کی فطری صلاحیت شاعرانہ پر دلالت کرتی ہے اس لیے بقیہ اشعار بھی دیکھتے چلیے:

عشق وہ شمع نہیں ہے کہ جلا بھی نہ سکوں
دل وہ اقلیم نہیں ہے کہ لٹا بھی نہ سکوں
تاب، دل میں اسے کھونے کی کہاں سے آئے
اور پانا اسے چاہوں تو میں پا بھی نہ سکوں
خاک ہو جاؤں تو ممکن ہے، ہوا، لے جائے
میں کہ سنگِ درِ جاناں ہوں کہیں جا بھی نہ سکوں
زخم، دل کا ہے سو آنکھوں میں اُتر آئے گا
راز ایسا ہے کہ چاہوں تو چھپا بھی نہ سکوں

عابد جعفری اور اعجاز بزمی کے مندرجہ ذیل اشعار بھی خوبصورت شاعری کی خوبصورت مثال ہیں۔

امتحاں لیتے ہیں غالبؔ کی زمیں میں اطہرؔ
شعر کہہ بھی نہ سکوں بات بنا بھی نہ سکوں

عابد جعفریؔ

سینہ چاکان وطن پر جو قیامت گزری
چاہوں روداد سنانی تو سنا بھی نہ سکوں

اعجاز بزمیؔ

ردیف ''نون'' کا چوتھا مصرعہ تھا ''ہم کو تسلیم نکونامی فرہاد نہیں'' سچ بات یہ ہے کہ خود غالبؔ بھی اس زمین میں کوئی ایسا شعر نہیں نکال سکے جسے غیر معمولی کہا جا سکے یا جسے ان کی غیر معمولی شاعرانہ فطانت کی دلیل بنا کر پیش کیا جا سکے۔ ایسے میں ''بیادِ غالب'' کے شاعروں کے لیے اس زمین میں اشعار نکالنا آسان نہ تھا پھر بھی بعض نے بہت کامیاب طبع آزمائی کی ہے دو تین شعر دیکھیے:

حشر میں مجھ سے جو پوچھیں گے ترے ظلم کی بات
یاد آئی بھی تو کہہ دوں گا مجھے یاد نہیں
زندگی لطف کشاکش کے سوا کچھ بھی نہیں
وہ چمن کیا کہ جہاں گھات میں صیاد نہیں

خلیل یوسفؔ

دردِ دل، ایک عطا ہے کوئی بیداد نہیں
کیسے انسان ہو، احسان پہ بھی شاد نہیں
یہ وہ لنکا ہے جہاں سارے ہیں باون گز کے
کون شاعر ہے سو امیرے، جو استاد نہیں

جوش مندوزئیؔ

رونقِ بزمِ جنوں خواب، کہ مانندِ بہشت
حیف اب کوچہ جاناں بھی تو آباد نہیں

دشت و صحرا کی، نہ اب،کوچہ جاناں کی خبر
دل گم گشتہ کو کچھ، اپنا پتا یاد نہیں

نزہت صدیقی

ردیف ''ی'' کے ساتھ طرح مصرعوں پر ''بیادِ غالب'' کے شعراء نے غزلیں کہی ہیں۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ غزلیں پہلی دو ردیفوں یعنی ''الف'' اور ''نون'' کی غزلوں کے مقابلے میں بہ حیثیت مجموعی کمزور ہیں اور ایسا ہونا حیرت انگیز نہیں، وجہ یہ ہے کہ غالب کی جن غزلوں سے مصرعہ طرح دیئے گئے ہیں وہ غزلیں خود بھی غالب کی دوسری غزلوں کی بہ نسبت کمزور ہیں۔ سات متعلقہ غزلوں میں سے صرف ایک غزل ایسی ہے جسے غالب کی بہترین غزلوں میں شمار کیا جاسکتا ہے، میری مراد اس غزل سے ہے جو'' حال اچھا ہے، کمال اچھا ہے،سال اچھا ہے'' کی زمین میں ہے۔ ورنہ بقیہ چھ غزلیں بہت معمولی درجے کی ہیں۔ ان غزلوں کے اشعار میں اتنی سکت نہیں کہ وہ زبان زدِ خلائق ہوجاتے یا ضرب المثال بن جاتے ہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ خاص خاص صاحبان ادب کے سوا غالب کی ان غزلوں کے اشعار شاید ہی کسی عام قاری کے ذہن میں محفوظ ہوں۔ ایسے میں اگر بیادِ غالب'' کے شعراء بلند پایہ طرحی غزلیں کہنے میں کامیاب نہ ہو سکے،تو اس سے ان کی سخن گوئی پر حرف نہیں آتا۔ یہ زمینیں اپنی ساخت و مزاج میں اتنی مشکل، ناشگفتہ اور ناہموار تھیں کہ ان میں اچھے اشعار نکالنا آسان نہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ خود غالب بھی ان زمینوں میں اس پائے کے اشعار نہیں کہہ سکے جن کی بدولت انھیں شہرت عام و بقائے دوام کے دربار میں جگہ ملی ہے۔ بایں ہمہ میں ''بیادِ غالب'' کے شاعروں کو داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انھوں نے ایسی سخت زمینوں میں طبع آزمائی کی اور بعض بہت اچھے اشعار نکال لیے۔ چند شعر دیکھئے:

ہم کہ دانشور بڑے، شاعر عظیم
سب کرشمے ہیں خیال خام کے

ضیاء علیگ

نارسائی کاتب تقدیر تھی
فاصلے تھے ایک یا دو گام کے
عہد تجدید مراسم کس لیے
یہ مرے ناراض شانے تھام کے

صبیحہ صبا

چہرے پہ جو لکھا ہے اسے پڑھ تو لیں مگر
اِک اور داستان پسِ داستان ہے

اشفاق حسین

دور تھے ہم سے تو اندیشے تھے اور
قربتوں میں بدگمانی اور ہے
دشمنوں کی دشمنی کچھ کم نہ تھی
دوستوں کی مہربانی اور ہے

جوش مندوزئی

اور بھی ہیں لوگ پر اس شخص میں
ایک طرز دلستانی اور ہے

عقیلہ شاہین

کینیڈا میں فروزاں شمع غالب

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، لاہور
پاکستان

غالب کے انتقال پر ایک سو تین برس ہونے کو آئے۔ ان کے نام کو آج بھی اردو شعروادب کے سب سے زیادہ مقبول اور پرکشش اسمِ اعظم کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی شہرت آگرہ (جہاں وہ پیدا ہوئے) اور سرزمین دہلی (جہاں عمر گزاری اور بالیدہ ہوئے) سے نکل کر اطراف و اکناف عالم میں دور دور پہنچی ہے اور روز بروز ان کی شہرت اور مرتبت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

اطہر رضوی کی مرتب کردہ کتاب ''بیادِ غالب'' اس کی ایک تازہ مثال ہے جو براعظم شمالی امریکا میں غالب فہمی اور غالب پسندی کے تسلسل کی ایک دلآویز کہانی سناتی ہے۔

بیاد غالب کے مرتب اطہر رضوی کے بقول (انہوں نے) : بچپن میں ہندوستان چھوڑا، نوجوانی میں پاکستان کو خیر باد کہا۔ پہلے کافی عرصے وہ لندن اور یورپ میں رہے اور اب ایک زمانے سے کینیڈا کے وفادار شہری ہیں...... ''زندگی کے سارے پہلو کم و بیش مغربی نہج کے ہو چکے ہیں لیکن روح پر اب تک مشرقیت.......... محیط ہے۔'' (بیادِ غالب، ص ۱۷)

اطہر رضوی ایک خوش مزاج اور خوش گفتار شاعر اور بڑے خوش طبع اور نفیس انسان ہیں۔ وہ پاکستان سے ہزاروں میل دور شمالی امریکا' کینیڈا کے ایک شہر ''مسی ساگا'' میں ایک اردو دنیا بسائے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے گھر ''پوشیدہ وادی'' (Hindden Valley Court) میں ۱۹۸۳ء سے سال بہ سال غالب کی یاد اور اعزاز میں غالب کی طرح (زمین) میں محفل

مشاعرہ منعقد کرتے ہیں۔

پچھلے پندرہ برسوں میں مقامی شعرا کے علاوہ متعدد ملکوں اور خطوں کے نامور شعراء نے اطہر رضوی کی قیام گاہ "پوشیدہ وادی" کے مشاعروں میں شرکت سے شعر وادب کی شمع کو روشن اور غالب کے نام کو قلمبند کیا ہے۔ اطہر رضوی نے جو ان مشاعروں کا اہتمام اور انصرام کرتے چلے آرہے ہیں، ان مشاعروں میں غالب کی زمین میں کہی اور پڑھی گئی غزلوں کو "بیادِ غالب" کے نام سے کتابی صورت میں جمع کر دیا ہے۔ یہ مجموعہ غالب کی پندرہ زمینوں میں چالیس سے زیادہ شعراء اور شاعرات کی کوئی ڈیڑھ سو سے زیادہ غزلوں پر مشتمل ہے۔

چالیس چالیس شاعروں میں سے صرف چار: جمیل الدین عالی، حمایت علی شاعر، حسین انجم اور نجمہ خاں "بذات خود" ان طرحی مشاعروں میں شریک نہیں ہو سکے، لیکن انہوں نے اطہر رضوی کی فرمائش پر ان کے مشاعروں کے لیے طرحی غزلیں فراہم کیں...... خود اطہر رضوی کے علاوہ بیاد غالب مشاعروں میں شریک ہونے والے دوسرے شعراء میں سحر انصاری، محسن احسان، شہزاد احمد، اشفاق حسین عابد جعفری، ضیاء علیگ، عروج اختر زیدی، فہمیدہ ریاض، عقیلہ شاهین اور ڈاکٹر خالد سہیل وغیرہ کے اسماء بہت نمایاں ہیں۔ ان مشاعروں کی کچھ رنگین تصاویر بھی زیب کتاب ہیں۔ ان میں ایک تصویر احمد ندیم قاسمی کی بھی ہے لیکن ان کی کوئی غزل مجھے اس مجموعے میں دکھائی نہیں دی۔

کتاب کا ایک ابتدائی حصہ جو مرتب کے قلم سے "شعراء" کے منظوم تعارف پر مبنی ہے خاصے کی چیز ہے اور ان کی قادر الکلامی پر مظہر ہے۔ حسین انجم کی دو اڑھائی صفحے کی ایک تحریر "تقریظ" کے عنوان سے شامل کتاب ہے...... اور یہ ایسی ہی ہے جیسی پچھلے زمانے میں "تقریظیں" ہوا کرتی تھیں، یعنی مرصع اور مدحیہ.......... یہ مختصر بھی ہے۔ کتاب کا "تنقیدی مقدمہ" ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے قلم سے ہے مرعوبیت یا واضح مروت سے خالی ان کا یہ تجزیاتی مطالعہ، یکسر تحسینی نہیں ہے۔

''بیادِ غالب'' کے فاضل مرتب اطہر رضوی غالب کو'' اردو کا عظیم ترین اور ساری اردو دنیا کا محبوب ترین لازوال اور لافانی شاعر'' مانتے ہیں، انہوں نے لکھا ہے کہ:

''مختلف مصنفین نے مختلف زمانوں میں غالب کو دنیا بھر کو متعدد اکابر فن) کا ہم درجہ، ہم مرتبہ شاعر، دانشور اور مفکر تصور کیا ہے۔ ایک شخصیت جس کا کسی نے غالب سے مقابلہ نہیں کیا، وہ روس کا عظیم ترین اور ذہین ترین شاعر پشکن (Pushkin) ہے''

اردو مراکز سے دور کینیڈا میں سارے اردو ماخذ کا نہ پہنچنا اور ان تک نارسائی سمجھ میں آتی ہے، اس لیے وہ یہ بات لکھ گئے ورنہ یہ کہنا درست نہیں کہ غالب اور پشکن کا آج تک کوئی تقابلی مطالعہ نہیں کیا گیا...... واقعہ یہ ہے کہ اردو اور روسی دونوں زبانوں میں پشکن اور غالب کا موازنہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری کو اس موضوع سے خاص تعلق رہا ہے۔ پشکن اور غالب کے تقابلی مطالعے پر مبنی ان کا خاصا مفصل جائزہ رسالہ ''آج کل'' دہلی فروری ۱۹۶۴ء میں دیکھا جا سکتا ہے (ص ۸۔۲۰، ۲۲)

اگرچہ خود ظ۔ انصاری کا احساس یہ ہے کہ ''یہ مضمون مفصل ہونے کے باوجود نا تمام ہے اور کچھ اور وسعت چاہتا ہے۔......'' ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے پشکن پر اردو میں ایک مستقل کتاب بھی لکھی (۱۹۶۶)...... انہوں نے تحسین روسی اسکالر اے ایس سکاچیف نے بھی کی ہے، دیکھیے: اشاریہ غالب سید معین الرحمٰن لاہور ۱۹۶۹ ص ۳۹۳۔ بہر حال اطہر رضوی کا یہ کہنا بجا ہے کہ ''غالب اور پشکن کے درمیان جتنی باتیں مشترک ہیں، وہ شاید ہی دو شاعروں کے درمیان ملتی ہیں......' (بیادِ غالب، ص ۱۱) اس اجمال کی تفصیل ظ۔ انصاری کے مضمون ''غالب اور پوشکن...... ایک مطالعہ'' میں ملتی ہے (آج کل، دہلی فروری ۱۹۶۴)

''بیادِ غالب'' کے فاضل مرتب اطہر رضوی کے بعض بیانات مبہم ہیں یا مبہوت کرتے ہیں، مثلاً انہوں نے کہا ہے کہ:

''بجنوری کے نسخہ حمیدیہ کے دیباچے کا آغاز اس فقرے سے ہوتا ہے:

''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، مقدس وید اور دیوان غالب'' اور پھر دوسروں نے اسی بات کو یوں کہا ''مغلیہ سلطنت کو کھو کر ہندوستان نے دو چیزیں حاصل کیں، تاج محل اور دیوان غالب'' (بیاد غالب، ص ۱۷)

یہ دونوں باتیں ''ایک'' کیسے ہو گئیں؟ اور آخری بات کن ''دوسروں'' نے کہی؟ رشید احمد صدیقی کا معروف عالم قول ہے:

''مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا؟ تو میں بے تکلف یہ تین نام لوں گا: غالب، اردو اور تاج محل!(علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۴۹۔۱۹۴۸ء ص ۳۶۱)

اطہر رضوی غالب سے محبت کرتے ہیں۔ محبت انصاف کی عاجزی کا نام ہے، اس کا اعتدال دشمن ہونا بھی مسلمات میں ہے۔ مبالغے یا بے اعتدالی کی دو مثالیں دیکھیے:

''غالب دنیا کے کسی بھی ذہین اور دانشور شاعر سے کم نہیں تھا۔'' (بیاد غالب ص ۶)

''زندہ اور متحرک ذہن کی پہچان یہ ہے کہ وہ مسلسل سوچے اور غالب سے زیادہ، اردو شاعری کی تاریخ میں کسی اور نے نہیں سوچا'' (بیاد غالب ص ۹۔۱۰)

یہ باتیں غالب کے بارے میں کہی گئی ہیں اور محبت سے کہی گئی ہیں۔ ہمیں اچھی بھی لگیں گی لیکن کیا یہ جی لگتی بھی ہیں؟ ابھی کوئی ایسا پیمانہ وضع نہیں ہوا جس سے دنیا بھر کے شاعروں کی ذہانت اور دانش وری کو جانچنا ممکن ہو سکے اور ان کی قدر پیمائی کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ دیا جا سکے یا درجہ بندی کی جا سکے...... غالب کی شاعری غور و فکر پر مائل کرتی ہے۔ یہ سوالات اٹھاتی ہے پھر بھی یہ کیوں کر کہا جا سکتا ہے کہ اردو شاعری کی پوری تاریخ میں غالب سے زیادہ تسلسل کے ساتھ کسی اور نے نہیں سوچا؟ بایں ہمہ میں فاضل مرتب کے اسلوب کو منطقی اور فطری مانتا ہوں۔ اطہر رضوی کو غالب اور اُن کی شاعری سے ''والہانہ عشق'' ہے، اس صورت میں اُن کے دیباچے کا اسلوب، مبالغہ آمیز ہی ہونا چاہیے تھا۔ ''بیان مولف'' یا ''عرض مرتب'' کا معتدل ہونا تعجب انگیز ہوتا......

اردو اور غالب سے اطہر رضوی کے عشق اور شغف پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے یہ لفظ گواہ ہیں: ''اطہر رضوی کو اپنی جان، اپنی ثقافت، اپنی تہذیب اور اپنی ملی وملکی اقدار سے بے پناہ لگاؤ ہے.......... یہ اس لگاؤ ہی کا ایک رخ ہے کہ ایک مدت سے کینیڈا میں اردو شاعری کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں...... اس شمع کو انہوں نے اردو کلاسیک کے عظیم مفکر شاعر غالب سے وابستہ کر رکھا ہے۔ اس لیے اس کی لو روز بروز بڑھتی رہی ہے اور کینیڈا کا ایوان اردو روشن سے روشن تر ہوتا جارہا ہے...... وہ غالب اور کلام غالب کی تفہیم و تبلیغ کو اپنی زندگی کا مشن بنائے ہوئے ہیں۔ اس لیے وقفے وقفے سے طرحی مشاعرے منعقد کرتے ہیں اور غالب کے مصرعوں کو طرحی قرار دے کر شعراء کو ان پر غزل کہنے کی ترغیب دیتے ہیں اور (اس طرح) اردو اور غالب دونوں کے پرچم دیارِ غیر میں بلند رکھتے ہیں یہ طرحی مشاعرے غالب اور کلام غالب دونوں کو متعارف کرانے، انہیں دوسروں تک پہنچانے، ان کے افقی و عمودی محاسن شعر کو اجاگر کرنے اور قاری و شاعر کو غالب سے قریب تر کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں...... اطہر رضوی کا حلقہ اثر بہت بڑا ہے۔ غالب کے نام اور کام کو دور دور تک پہنچانے، عام و خاص کو اس کی جانب توجہ دلانے اور غالب کی مقبولیت کے گراف کو بلند تر کرنے میں (ان کی کوششیں) بڑی کارکشا و کارگر ہیں......'' (بیادِ غالب ص ۲۲۔۲۵)

ایشیا سے دور براعظم شمالی امریکا میں اطہر رضوی نے غالب دوستی کا جو بیج بویا ہے، وہ برگ و بار لا رہا ہے، آنے والے وقتوں میں یہ زیادہ ثمر دار اور بارور ہوگا، مزید پھلے اور پھیلے پھولے گا......اور یقین ہے کہ اطہر رضوی اپنی شخصی و ادبی وجاہتوں کے علاوہ بسلسلۂ غالب اپنی توجہ اور تخم ریزی، اور غالب شناسائی کو عام کرنے کے حوالے سے بھی محترم اور معزز رہیں گے......اور ان کی مرتب کردہ کتاب ''بیادِ غالب'...... غالب کی یاد اور اُن کے اعزاز میں برپا ہونے والی تقریبات اور ان کے اثرات کی ایک مستقل یادگار کے طور قدر کی نظر سے دیکھی جائے گی۔

oooOOooo

اطہر رضوی کے تخلیقی و تاریخی سروکار

پروفیسر آفاق احمد، بھوپال، انڈیا

اطہر رضوی کی تحریروں کا تجزیاتی مطالعہ کرتے وقت تجزیہ نگار کو سب سے پہلے اس مسئلہ کا حل تلاش کرنا پڑتا ہے کہ وہ ان تحریروں کو اردو کی مختلف اصناف میں سے کس خانہ میں رکھے۔ انھیں سفرنامہ کہے، تاریخ کی تلاش سمجھے، انشائیہ کا خوب صورت نمونہ قرار دے یا تحقیق وتنقید کے زمرے میں شامل کرے۔ اُن کی نگارشات دراصل اُن کے اپنے الفاظ میں ''مناظر، مشاہدات، تاریخ اور تحقیق کے تعاون سے ایک نقطہ نظر'' قارئین کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ نتیجہ میں یہ تحریریں بیک وقت مختلف اصناف کے جوہر اپنے میں جذب کرتے ہوئے ایک ایسا منظر نامہ تشکیل دیتی ہیں جو ان اصناف کے امتزاج سے اطہر رضوی کی نگارشات کو ''شیئے دیگر'' کے ضمن میں لے آتا ہے۔ ''ہر ملک ملک ماست'' بلکلیا سے بازنیا تک'' ''خدا کے منتخب بندے'' ''کون عبث بدنام ہوا'' سے لے کر اُن کی تازہ ترین تصنیف ''گر ہم برا نہ مانیں'' کی صفحات گردانی کے دوران آپ یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکیں گے کہ ان نگارشات میں اسلوب کی جو بوقلمونی ہے اور اس کا جو تخلیقی سروکار ہے وہ تاریخ ہو یا تحقیق، روئیداد سفر ہو یا مقامات اور شخصیات کا تذکرہ۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں کچھ اس طرح اُن کے بطون تک رسائی حاصل کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ تاریخ کے ساتھ زمانہ چلتا ہے، زمانے کے ساتھ معاشرہ اپنی چھب دکھاتا ہے اور معاشرے کے ساتھ وہ سارے عوامل جلوہ گر نظر آتے ہیں جن سے اُس کی تشکیل ہوئی ہے۔

بھوپال میں قیام کے دوران میں نے بچشم خود اطہر رضوی صاحب کی تلاش وجستجو کے مختلف مراحل کو دیکھا ہے۔ باریک بینی کے ساتھ ایک ایک چیز کا مطالعہ، سنی سنائی باتوں پر یقین نہ کر کے مختلف ذرائع سے حقیقت کا ادراک اور انسانی فطرت کا وہ عمیق مطالعہ جو انسانی نیتوں کا اندازہ ماحول کے تاثرات کے پیش نظر کرنے پر آمادہ کرتا ہے ایک طرف پرانی تاریخ کے بوسیدہ صفحات سے اس دور کی روح کو پانا اور دوسری طرف ماضی سے موجود میں آ کر معاشرہ کی تبدیلیوں اور حالات کا جائزہ اس طرح لینا کہ ایک ایسی تصویر بن جائے جس میں کوئی رنگ پھیکا نہ ہو۔ انسانوں کی طرح شہروں کا بھی مزاج ہوتا ہے۔ اُس مزاج کے ساتھ وہ سانس لیتے اور جیتے ہیں۔ خاص طور سے وہ شہر جو اپنی قدیم تہذیب پر نازاں ہیں، جو اپنے عظیم کارناموں پر فخر کرتے ہیں اور جنھوں نے تاریخ کا سفر اس طرح طے کیا ہے کہ اُن کا ہر کھنڈر آج بھی زبان حال سے اپنے تغیر کی داستان بتا رہا ہے۔ اطہر رضوی یہاں ایک خاموش تماشائی نہیں بلکہ ایک ایسے داستان گو کی شکل میں نظر آتے ہیں جو تاریخ کے اس جبر اور عروج وزوال کی داستان کو صرف سناتا ہی نہیں ہے بلکہ نتائج کا استخراج اس طرح کرتا ہے کہ ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کے سفر کی بشارتیں اس میں تلاش کی جا سکتی ہے۔

ایک سیاح کی نظر، مورخ کا دماغ دانشور کا ذہن اور ادیب کا قلم رکھنے والے اطہر رضوی کی یہ نگارشات سرسری طور پر گزر جانے والی چیز نہیں۔ میں اکثر محسوس کرتا ہوں کہ، اقبال کے الفاظ میں ان کے مطالعہ کے دوران پاسبان عقل دل کے پاس رہے تو اچھا ہے لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دینا چاہیے تا کہ غور وفکر کے سامان مہیا کرتے وقت بیک وقت تاریخ وادب کا سفر طے کیا جا سکے۔ کبھی اطہر رضوی کے ساتھ اور کبھی تنہا۔

ooOOOOo

شاہد پبلی کیشنز کی مطبوعات

2253۔ ریشم اسٹریٹ کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی۔2
فون :011-23272724 موبائل:9868572724
برانچ آفس: قاصدی ٹولہ، حاجی الطاف حسین مارگ
مغل پورہ اول، مرادآباد۔٦ یوپی (انڈیا)
E-mail: drshahidhusain_786@yahoo.co.in

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف/مرتب	قیمت
۱	فن تذکرہ نگاری اور عصری رجحانات	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	Rs.400/-
۲	کلاسیکی اردو شاعری روایتی ادارے کردار اور علامتیں	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	Rs.300/-
۳	شمالی ہند کی بولیوں اور بھاشاؤں میں بارہ ماسہ کی روایت	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	Rs.250/-
۴	سفر نامۂ حیدرآباد اور لاہور	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	Rs.300/-
۵	جنوب مغرب ایشیا میں ہمارا تہذیبی ورثہ	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	Rs.300/-
۶	ترقی پسند ادب کے معمار انسائیکلوپیڈیا جلد اوّل	پروفیسر قمر رئیس	Rs.500/-
۷	موج نقد	پروفیسر محمد زماں آزردہ	Rs.250/-
۸	میر تقی میرؔ عالمی سیمنار	اطہر رضوی	Rs.300/-
۹	عالمی میرؔ انیس سیمنار	اطہر رضوی	Rs.300/-
۱۰	گر ہم برا نہ مانیں!!!	اطہر رضوی	Rs.200/-
۱۱	ہندو مرثیہ گو شعراء	پروفیسر اکبر حیدری	Rs.300/-
۱۲	ترکی اور اُردو کے مشترک الفاظ	اصغر حمید	Rs.500/-

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف/مرتب	قیمت
۱۳	دہلی میں اُردو افسانہ	ڈاکٹر ظلِ ہما	Rs.300/-
۱۴	صادق الخیری حیات اور ادبی خدمات	ڈاکٹر ظلِ ہما	Rs.250/-
۱۵	افکار ونظریات	ڈاکٹر ظلِ ہما	Rs.300/-
۱۶	روہیلکھنڈ کی ادبی وتہذیبی تاریخ	ڈاکٹر ظلِ ہما	Rs.900/-
۱۷	بدایوں۔ تاریخی منظر نامہ عہد بہ عہد اس کی شہری روایت	ڈاکٹر ظلِ ہما	Rs.300/-
۱۸	شہر مرادآباد کی تاریخ وتہذیب اور ادبی آثار ونقوش۔ منظر وپس منظر	ڈاکٹر ظلِ ہما	Rs.600/-
۱۹	رام پور تاریخی حالات، نوابانِ رامپور اور انکی معارف پروری	ڈاکٹر ظلِ ہما	Rs.300/-
۲۰	امروہہ جغرافیہ تاریخی پس منظر، اکابر اور صوفیاء	ڈاکٹر ظلِ ہما	Rs.300/-
۲۱	بریلی تاریخ روایت اداراتی فکر اور ارتقائی ماحول	ڈاکٹر ظلِ ہما	Rs.250/-
۲۲	بجنور قدیم تاریخ، مسلم آبادکاری اور شعروادب کے ارتقاء میں اس کا حصہ	ڈاکٹر ظلِ ہما	Rs.250/-
۲۳	پیلی بھیت جغرافیائی ماحول عہد بہ عہد تاریخی روایات اور ادبی ثقافت	ڈاکٹر ظلِ ہما	Rs.250/-
۲۴	شاہجہاں پور ارباب علم وادب اور ان کا تاریخ ساز کردار	ڈاکٹر ظلِ ہما	Rs.250/-
۲۵	اندازِ بیاں اور... اردو کے منفرد نثر نگار اطہر رضوی کی تخلیقات پر ناقدین اور اساتذہ کے تاثرات	ڈاکٹر ظلِ ہما	Rs.400/-
۲۶	ابواب المصائب	ڈاکٹر سید تقی عابدی	-
۲۷	مثنویات دبیرؔ	ڈاکٹر سید تقی عابدی	-
۲۸	مصحفِ فارسی	ڈاکٹر سید تقی عابدی	-
۲۹	رُباعیاتِ دبیرؔ	ڈاکٹر سید تقی عابدی	-
۳۰	غالبؔ دیوانِ نعت ومنقبت	ڈاکٹر سید تقی عابدی	-
۳۱	تعشق لکھنوی	ڈاکٹر سید تقی عابدی	-

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف/مرتب	قیمت
۳۲	قصہ مہر افروز و دلبر	ڈاکٹر شاہد حسین	Rs.300/-
۳۳	مشاہیر کے خطوط بنام ڈاکٹر تنویر احمد علوی	ڈاکٹر شاہد حسین	Rs.300/-
۳۴	چاند کے خطوط بنام ڈاکٹر تنویر احمد علوی	ڈاکٹر شاہد حسین	Rs.300/-
۳۵	سراج العروج	سید شمیم کاظم	Rs.250/-
۳۶	گلدستۂ مدحیات جلد پنجم	سید شمیم کاظم	Rs.150/-
۳۷	گلدستۂ مدحیات جلد ششم	سید شمیم کاظم	Rs.150/-
۳۸	گلدستۂ مدحیات جلد ہفتم	سید شمیم کاظم	Rs.150/-
۳۹	ہندوستانی نشاۃ ثانیہ میں قدیم دہلی کالج کا کردار	ڈاکٹر شمس الہدیٰ	Rs.300/-
۴۰	پروفیسر قاضی غلام محمد حیات اور فن	ڈاکٹر نصرت جان	Rs.250/-
۴۱	کچھ ذکر کچھ فکر	میمونہ علی چوگلے	Rs.350/-
۴۲	پر ہوا کے (شعری مجموعہ)	انور سلیم	Rs.175/-
۴۳	شواظ (شعری مجموعہ)	عابد ادیب	Rs.200/-
۴۴	غم سنور گئے (شعری مجموعہ)	ابو قاسم کرجیکر	Rs.151/-
۴۵	قرۃ العین حیدر کے ابتدائی تین ناول	گلِ صبا	Rs.200/-
۴۶	ہند و پاک کی خواتین ناول نگار	ڈاکٹر غلام محی الدین سالک	Rs.550/-
۴۷	اکیسویں صدی میں اردو	شیخ سلیمان کرول	Rs.200/-
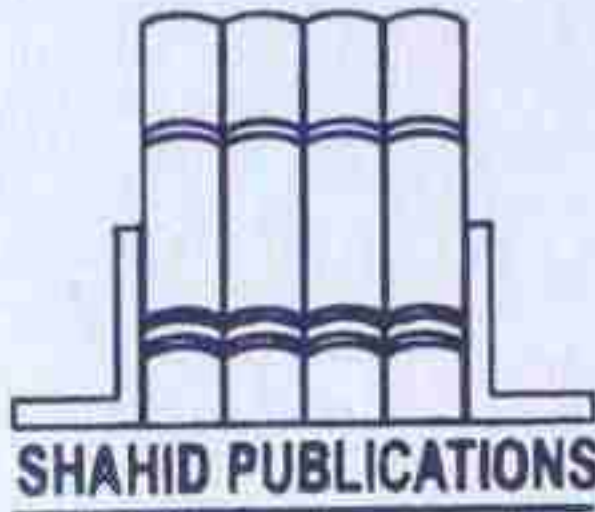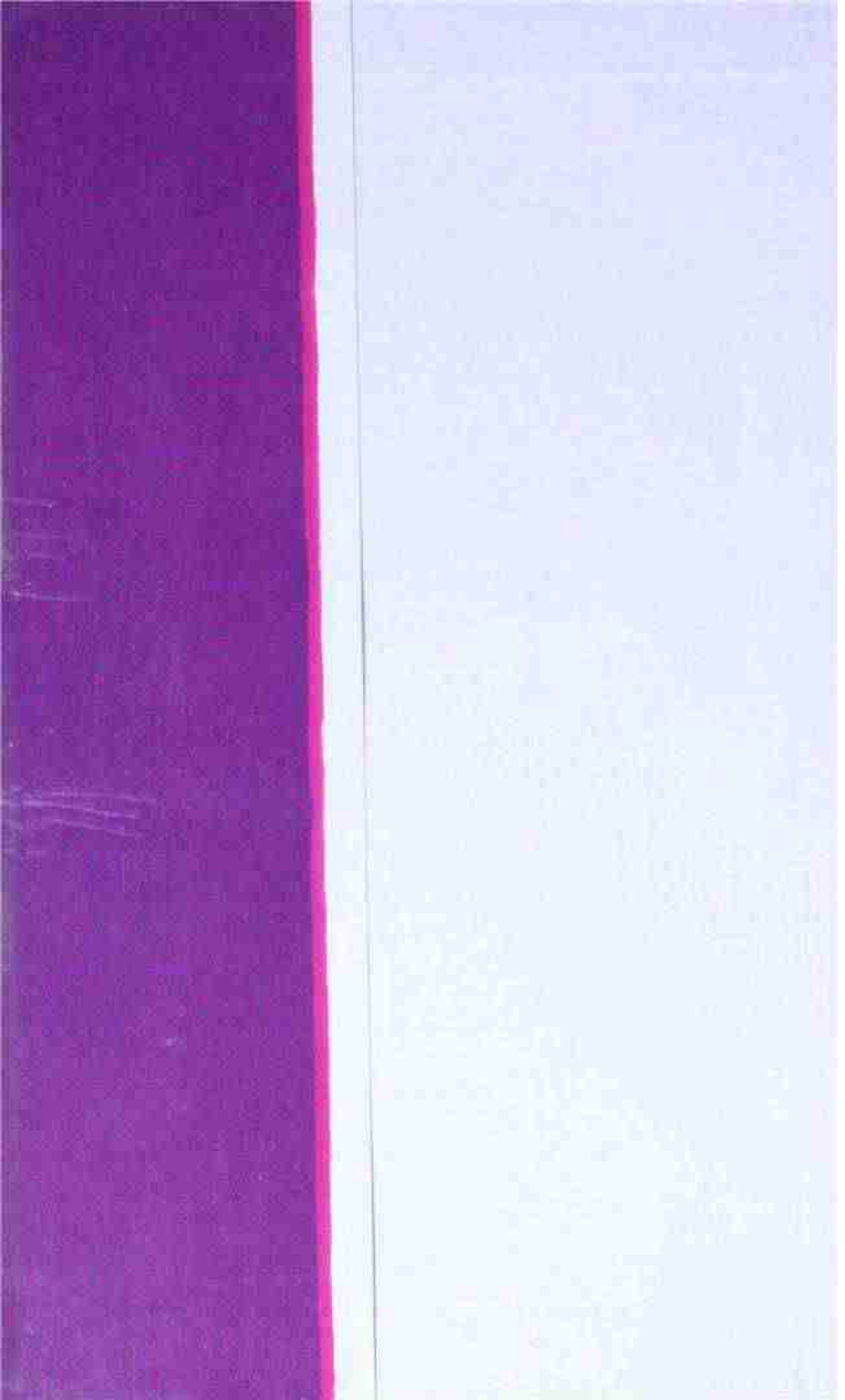
ANDAZ-E-BAYAN AUR

"Impressions and Comments of Urdu Scholars and critics on Athar Razvi's literary works"

Compiled By:

Dr. Zill-e-Huma

M.A., M.Phil., Ph.D, D.Lit.

SHAHID PUBLICATIONS

2253, Resham Street, Kucha Chelan, Darya Ganj

New Delhi - 110002 India - Phone : 011-23272724

E-mail : drshahidhusain_786@yahoo.co.in